U8942 P Date-tl

Title - MADAWA.

Creator - Furqat Kakoorvi

Publisher - Yusufi Press (Lucknow).

Date - 1944

Pages - 412

Subjects - Urdu Adab - Tanazz-o-Muz
Mazahiya Mazameen.

مداوا

فرقت کاکوروی

ناشر
یوسفی پریس لکھنؤ

بار اول ۱۰۰۰ .. .. جنوری ۱۹۴۴ء

اُن "ناترقی پسندوں" کے نام

جو

ترقی پسندوں کو بدنام کرتے ہیں

(مولوی حکیم) محمد ادریس انصاری پرنٹر پبلیشر نے
یوسفی پریس فرنگی محل لکھنؤ میں چھپا کر شایع کی

فہرست مضامین

پیغامات

تنقیدی مضامین

پیش لفظ

از مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی

ترقی تو ادب میں ہونی ہی تھی، اور حرکت جب ہر چیز میں ہے تو ظاہر ہے کہ شاعری کیسے ساکن و جامد رہ سکتی تھی لیکن بے راہ روی کا نام ترقی رکھ دینا اور بے قیدی کو آزادی سے تعبیر کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جسم پر آماس ہو آئے اور ہم اُسے دیکھ کر کہیں کہ دیکھو یہ کیسا موٹا تازہ تیار و تنومند ہے!
——— اونٹ جیسا حلیم و شائستہ جانور بھی جب شتر بے مہار بن جاتا ہے، تو اُس کے شتر غمزوں سے خدا کی پناہ!

پرانی شاعری اور پرانا ادب کوئی وحی آسمانی نہیں، کہ اس کا کوئی نقطہ نہ بدل سکے، کوئی شوشہ نہ ٹل سکے۔ خیالات بدلیں گے۔ اسلوب بیان بدلیں گے، اور بدلتے رہتے ہی ہیں۔ ولی کی شاعری غالب کی شاعری نہیں اور فسانہ عجائب کی زبان امراؤجان کی زبان نہیں، چراغ سے چراغ جلتا ہی آتا ہے اور شاخ سے شاخ پھوٹتی ہی رہتی ہے، بچہ جوان ہوتا ہے اور جوان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے۔ قدرت کا دستور ہی یہ ہے لیکن کوئی زبردستی کھینچ تان کر اگر بچہ کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانے لگے، تو یہ ارتقاء طبعی نہ ہوا، یہ فطرت سے کشتی اور زور آزمائی ہوئی جدت اگر محض جدت کی خاطر ہے۔ تو اس کا نام ندرت نہیں بدعت ہے، شگفتگی نہیں غرابت ہے۔

"ترقی پسند" ادیبوں کی فہرست میں نام منشی پریم چند آنجہانی اور قاضی عبدالغفار صاحب (مدیر پیام دکن) اور یہاں تک کہ "بابائے اردو"

ڈاکٹر عبدالحق سے بھی لئے گئے ہیں۔ اگر ترقی پسندی کا یہی معیار ہے تو پھر ہم سب ترقی پسند ہی ہیں اور اس ترقی پسندی سے انکار کس کافر کو ہو سکتا ہے؟ لیکن کاش اس دعوی میں خلوص ہوتا اور اکے مقابلہ میں چند قطرے خرمن کے سامنے چند دانے ہستی ہی کیا رکھتے ہیں "ترقی پسند" ادب کے نام سے جو سیلاب عظیم نثر و نظم دونوں میں بدمذاقیوں، عریانیوں اور گندہ بیانیوں کا چل پڑا ہے، اس نے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پرانے ادب کے بڑے سے بڑے فحش نویس اور بڑے سے بڑے ہزل گو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور نام از سر نو جان صاحب کا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے میاں چرکین کا چمکا دیا ہے! اناللہ بدعقیدگی اور اخلاقی بیہودگی کو چھوڑئیے، آخر مذاق سلیم اور تمیز داری بھی تو دنیا کے ادب میں ایک چیز ہے۔ ان ظالم لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کے صفحات میں تو آنکھیں اس کو بھی ترستی رہ جاتی ہیں۔ اسے تسکین کو ہم نہ رویں جو ذوق نظر ملے حوران خلد میں تری صورت اگر ملے جی خوش ہو اگر ملک میں اس طوفان بے تمیزی (طوفان کو آپ مجاز کہہ لیجئے لیکن بے تمیزی کو حقیقت کے بجائے مجاز سمجھنا ظلم ہوگا) کے خلاف تحریک پیدا ہوئی ہو اور جا بجا مزاحی اور سنجیدہ دونوں رنگ میں کوششیں رد و اصلاح کی شروع ہو گئی ہیں۔ انھیں کوششوں کی ایک عملی شکل یہ پیش نظر کتاب بھی ہے۔ کاکوری کے جوان عمر و جوان ہمت فرقت بی۔اے کے قلم سے اسکے مسودہ کے دو چار صفحہ مجھے بھی دکھلائے گئے، یقین ہے کہ ساری ہی کتاب اس طرز و انداز کی ہوگی لکھنؤ زبان و ادب کی خدمت و اصلاح کے سلسلہ میں ممتاز شروع سے چلا آ رہا ہے حق تھا کہ ایسی اصلاحی کتاب کی اشاعت بھی یہیں کی کسی اشاعت گاہ سے ہو۔

مقدمہ

از مولانا سید اختر علی صاحب تلہری

جناب فرقت کی تازہ ترین لطیف نظموں کے مجموعہ پر اظہار خیال کرنے سے پہلے اس کا اعتراف نہایت ضروری ہے کہ بدنصیبی سے میری فطرت تعلیم و تربیت کے پرانے دقیانوسی سانچوں میں ڈھلی ہے۔ تعلیم و تربیت کی اس بدتوفیقی کا نتیجہ ہے کہ میرے ادبی و شعری ذوق کا مزاج بھی کہنہ ہے، دوسرے لفظوں میں جہاں تک ذوق کا تعلق ہے وہی دور از کار شاعری پسند آتی ہے جس کی بنیاد نغمہ آفریں اوزان پر ہو جس میں اُن سچے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہو جو ایک حد تک مستقل حیثیت رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ اس کا اسلوب بیان بھی رنگین ہو لفظوں کے استعمال میں بھی حسین تراش خراش پائی جاتی ہو۔ ظاہر ہے جو شخص شاعری کے متعلق اتنا بوسیدہ ذوق رکھتا ہو وہ اپنے مذاق کی فطرت کے لحاظ سے کس طرح اس نئی شاعری کو پسند کر سکتا ہے جس کا رُخ دوسری طرف مڑا ہوا ہے؟

غالباً اسی "ذہنی و جذباتی ماحول" کی وجہ سے ن۔ م۔ راشد اور میراجی وغیرہم کی شعری کائنات سے مجھے کبھی لطف حاصل نہ ہوا اور اُن کے اشعار کی لے میرے سامعہ کے لئے بار ہی ہوتی رہی جب اس طرف حضرت فرقت کی دلپذیر نظمیں جو نئی شاعری کا اعلیٰ کارنامہ ہیں نظر سے گزریں تو میرے فطری ذوق کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن یہ کلام ایک تُنا سا کا تھا، اپنے دوست کا تھا دوبارہ پھر اُسے دیکھا اور اس نظر سے دیکھا کہ اس میں جو خوبیاں ہیں انھیں بہر حال پا ہی لیا جائے کُلُّ جدید لذیذ ہر نئی چیز لذت بخش ہوتی ہے یہ بہت پرانا عربی کا مقولہ ہے اور اس میں انسانیت کے

سالہا سال کے تجربہ کا نچوڑ ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ نئی شاعری
لذت بخشی کی خصوصیت سے خالی ہو صرف طلبِ صادق چاہئے۔ مانا کہ پرانے ذوقی
نقطۂ نظر سے جدید شاعری میں نغمہ آفریں موزونیت کا وجود نہیں خیالات میں کوئی
نظم نہیں انداز بیان میں کبھی دلآویزی نہیں معانی و بیان و بدیع کے نکتوں سے
بھی اُسے کوئی واسطہ نہیں اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ "اخلاقی قدروں" کے لئے
تباہ کن ہے۔ یہ سب سہی مگر بہر حال وہ جدید ہے اور یہی وہ اس کی خصوصیت ہے
جو کلُّ جدیدٌ لذیذٌ کی بنا پر خواہ مخواہ ہر طرف سے اس میں لذتیں اکٹھا کر دے گی۔
اب رہی یہ بات کہ میرے ذوق کو، تعلیم و تربیت کے پرانے سانچوں میں ڈھلے ہوئے
ذوق کو، اس میں لذت محسوس نہیں ہوتی تو مجھے خاموشی سے عرب کے نظریہ بالا کی
بنا پر تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ خود میرے ذوق کی تشنہ لبی کا نقص ہے جو نئی شاعری
کے افادی نکتوں کے قلزم زخار تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ اس نئی شاعری کی
لذتوں سے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ بیسویں صدی کی "آرکسی عقل"
سے جس پر ڈولا اور عذرا پاؤنڈ کے ردبی و شعری جلووں کی چھوٹ پڑ چکی ہو دستگیری
کی خواہش کی جائے۔

بہت ممکن ہے کہ اگر حضرت فرقت کی تازہ نظموں پر اظہار خیال کی ضرورت نہ
محسوس ہوتی تو میرے گھسے پٹے پرانے خیالات میں زندگی کی لہر نہ پیدا ہوتی اور
میری فکر و خیال کی دنیا اسی طریقہ سے سوتی رہتی۔ نظموں کے اس مجموعہ کی یہ کامیابی
کچھ کم قابل رشک نہیں ہے کہ اس نے دفعۃً خیالات کا رُخ اس طرف موڑ ہی دیا
اور ذوقی لحاظ سے نہ سہی "مستقبل ترقی اندیش" کے لحاظ سے ضرور اس قابل بنا دیا کہ
نئی شاعری کے "افادی محاسن" کا تحلیل و تجزیہ سکون کے لمحوں میں کر سکوں۔ ذیل
کی سطروں میں اسی عقیدت مندانہ تحلیل و تجزیہ کا نتیجہ ہیں جس کا نئی شاعری نے نقاد

قارئین سے مطالبہ کرتی ہے۔ ان میں شعر کے ذاتی حسن کے بارے میں ذوق سے فیصلہ
کہیں حاصل نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے حسن کی جانچ کے لئے پہلے اس کا تاریخی اور
سماجی پس منظر نگاہوں کے سامنے رکھا گیا ہے پھر اس پر غور کیا گیا ہے کہ اس میں
اقتصادی اور سماجی افادیت کی متاعِ گراں ارز کس قدر موجود ہے اور اس کے
نغموں کے گراموفون میں مزدوروں اور کسانوں کی کتنی آہیں اور کراہیں بھری گئی
ہیں اس میں شک نہیں کہ نقطۂ نظر کے اس تغیر نے ادب و شعر کی نئی قدروں کا مکمل
دفتر میرے سامنے رکھ دیا ہے، اب بفضلہ میں اس قابل ہوں کہ نئی شاعری کے ہر
شاہکار پر خواہ وہ اس نوعیت کا ہو "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" "بول جو کچھ کہنا
ہے کہہ لے" یا پھر اس نوعیت کا ہو "تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس"
گھنٹوں جھوموں اور اس کی ستائش میں سیکڑوں لفظ لکھ ڈالوں خواہ میری اس
حرکت پر میرا بدتمیز ذوق کتنے ہی طنز بھرے قہقہے لگائے

حضرت فرقت کو میں بہت زمانے سے جانتا ہوں۔ اس زمانے سے جب ان کی
شاعری کی روح قدامت و فرسودگی کے سانچے میں بند تھی، اگرچہ وہ جوان تھے
اور اچھی طرح جوان۔ معلوم نہیں کہ اس طرف ان کی حسِ لطیف نے کن دلچسپ
حالات کے ماتحت کون سی دلچسپ کروٹیں لے ڈالیں کہ انھوں نے دفعتاً اپنی شاعری
کا رخ رومانیت کے ریگستان سے افادیت کے نخلستان کی طرف پھیر دیا۔ بہرحال
اسباب کچھ ہوں ان کی اس شاعری میں دنیا کی موجودہ "الجھنوں" کو سلجھانے کی
کوششیں کی گئی ہیں، "زندگی کو سماج کے رشتہ" میں دیکھا گیا ہے حقیقتوں سے آنکھیں
چار کی گئی ہیں، "جنسی بھوک" کے ہمہ گیر اثرات کو دیکھا گیا ہے۔ ان کی پہلی شاعری
"تاریک ماحول" ہوتی تھی حقیقتوں سے فرار کی کوششیں اس میں نمایاں ہوتی تھیں
[illegible] موجودہ شاعری کے تیور [illegible] ہے کہ انھوں نے

"سماج کی مانگیں" اچھی طرح سے سمجھ لی ہیں اور دبے ہوئے کچلے ہوئے انسانی
طبقوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو انھوں نے خوب سُنا ہے ان کی موجودہ شاعری
انھیں احساسات کی آواز بازگشت ہے اور اس لئے اس میں زندگی ہے، جان ہے
روح ہے۔ اور پھر راشد اور میراجی وغیرہ کی شاعری کی طرح وہ رینگتی ہوئی نہیں
چلتی ہے بلکہ چھلانگیں لگاتی ہوئی اچھلتی کودتی چلتی ہے۔
آج کل کی جدید ترین شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنے
"نفسی تجزیہ" اور "جذباتی تسلسل" کے بہاؤ میں ہم آہنگی پیدا کرسکے (اب خواہ وہ
اسی طرح کیوں نہ ہو کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا) ذہن
لاشعور میں سے آزاد تسلسل کو جنم دیتا ہے' ظاہر ہے کہ نفسی تجزیہ کے سلسلے میں اگر
وہ ایمانداری کے ساتھ انجام دیا جائے، جنسی بھوک اپنی مختلف شکلوں میں سرفہرست
نظر آئے گی اور فرائڈ کے مذاق کے مطابق ہر چیز پر وہی چھائی دکھائی دے گی۔
ن۔م۔ راشد وغیرہ کے یہاں یہ آزاد تسلسل پایا جاتا ہے اور جنسی بھوک اپنی تشنگی
بجھانے کے لئے ہاتھ پیر مارتی نظر آتی ہے۔ مگر ان کوششوں میں صداقت کا نشان
بہت کم ہے۔ حضرت فرقت کو اپنے ان محترم سابقین پر یہ فضیلت حاصل ہے
کہ ان کے یہاں یہ آزاد تسلسل بھی خاص شان سے پایا جاتا ہے' اس میں ابہام نہیں پیدا
ہوتا اور یہ شاعر کی قوت تخیل و قوت بیان کا خاص ثبوت ہے۔ فرقت کی نئی شاعری میں
جوش بھی ہے۔ صداقت تخیل و تصور بھی اور خلوص اظہار و بیان بھی۔ فرقت راشد وغیرہ
کی طرح "فراری ذہنیت" رکھنے والے شاعر نہیں ہیں جو "اپنے گرد ایک مکڑی خول سا
بُن لیں" وہ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنا جانتے ہیں اور اس لئے سچے سماجی شاعر ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ فرقت جو "منطقی و نفسی ماحول" اپنی نظموں میں پیدا کرتے ہیں وہ پڑھنے
والوں کے لئے مبہم و تاریک نہیں ہوتا "جنسی بھوک" متعلقہ اعضا میں جو گدگدی پیدا

کرتی ہے اُسے بھی شاعر چھپانا نہیں چاہتا کیونکہ وہ ایک سچا ترقی پسند شاعر ہے اور ایک سچے ترقی پسند شاعر کو پرانی اخلاقی قدروں سے کیا تعلق، وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے بغیر کسی جھجک کے براہ راست کہتا ہے۔ فرقت کی ایک نظم ہے۔

کیا تری ساری کا آنچل اور ہٹ سکتا نہیں
اور ترے سینہ کا وہ رنگیں اُبھار
سامنے میرے نکھر سکتا نہیں
دے رہا ہے دیر سے جو
میری لاغر انگلیوں کو ہاتھ کی
شوخیوں کی دعوتیں

بادی النظر میں یہ نظم کسی "رومانوی تخیل" کا شاہکار معلوم ہوتی ہے اور اس لئے شاید نظر انداز کرنے کے قابل سمجھی جائے لیکن اس نظم کے اعصاب میں شدتِ جوعِ جنسی کا پیدا کیا ہوا جو تشنج محسوس ہوتا ہے وہ اُسے حقیقت کی ٹھوس زمین پر لے آتا ہے اس کے ماسوا اسی سلسلے کے دوسرے بند میں "سیب" کو لبِ آسانور کے "سیلونی قمقموں" کا مشبہ بہ بنا کر بھوک اور پیٹ کے مسئلہ کی اہمیت کا اعتراف کر لیا ہے کیونکہ آزاد تسلسل کے سلسلہ میں اسی مشبہ بہ پر دفعتہً نگاہوں کا جم جانا اس کے سوا اور کوئی بات ثابت نہیں کرتا۔ یہ نظم کا وہ اہم پہلو ہے جس سے شاعر کے درخشاں سماجی نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے اور نظم میں معاشی افادیت پیدا کرتا ہے۔ شاعر کا انگلیوں کی صفت لاغر لانا بھی اس کا ثبوت ہے کہ اُسے موجودہ معاشرت کی طبقاتی ناہمواری کا زبردست احساس ہے کیونکہ اس طبقاتی عدمِ مساوات کی فضا ہی میں زیادہ تر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک کی انگلیاں لاغر ہو جائیں اور دوسرے کی فربہ۔

ن م راشد کی ایک نظم ہے "مکافات" اس کا آغاز اس شاندار اور تابناک

شعر سے ہوتا ہے ؎

رہی ہے حضرت یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا

اس بے تکلفانہ دوستی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شاعر کسی معصیت میں مبتلا نہیں ہو سکا اور یہ نظم اس کے دل کے اس ارمان پر ختم ہوتی ہے۔

ارے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے

عین موسم شباب میں "حضرت یزداں" سے اس قدر پکی دوستی ہونا کہ جوانی کا منھ گناہوں کی حلاوتوں سے نہ بھرا جا سکے آج کل کے ترقی پسندانہ مذاق میں اس مضمحل بڑھاپے کی نشانی ہے جو بچپنے سے گلوگیر ہو جاتا ہے مگر نظم کا ہیرو اس کے اعتراف کی جرات نہیں رکھتا اپنی بے عملی کو حضرت یزداں کی دوستی کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے۔

فرقت کی ایک نظم ہے "مگر پلٹ کے واپس آؤں گا" اس کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں سے راشد نے نظم ختم کی ہے یعنی "اک گناہ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد" اس نظم میں فرقت کی حقیقت نگاری جوان جسم [illegible] نظر آتی ہے وہ اس [illegible] معصیت کے بعد رومانوی قلعوں اور خیالی جنتوں [illegible] مردانہ وار حکمت عملی کے ساتھ "ان حالات [illegible] اس کے جھیلنے پر آمادہ ہیں" ؎

اک گناہ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد
[illegible]
[illegible]

اور دنیا ہکا بکا ہو کے دیکھے کون تھا!!

فراق کے یہاں تشبیہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن جتنی ہیں وہ "نفسیاتی مصوری کی حیرت انگیز مثالیں" ہیں "بندر کا کھمبا ہلا کر بھاگ جانا" واقعہ کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے غور کی نگاہ اس میں مشرقی عورت کی بے بسی بیچارگی اور مظلومی کا ہو بہو نقشہ بھی پاتی ہے جس طریقے سے کھمبا بے جان جامد اور بے بس ہوتا ہے اسی طریقہ سے مشرقی عورت بھی بیچارہ و مظلوم ہوتی ہے دست دراز اُسے ستا سکتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ فراق کی یہ نظم "سیاسیات میں الجھے ہوئے کسی لمحہ کی پیداوار ہو" بندر کی طرح کھمبا ہلا کر بھاگنا پھر لوٹ کر بھیجکر پکڑوا بلوایا جانا اور پٹوایا جانا وغیرہ وغیرہ کیا الجھے ہوئے سیاسی تصورات کی طرف ایمائی نسبت نہیں رکھتے لیکن "شاید اس حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام لگانا اسے مجروح کرنا ہوگا اس نظم کی کامیابی تو اس کی تاثیر ہی میں مضمر ہے۔

اس دلچسپ مجموعہ کی نظم "کل رات کو" بھی خاص طور سے اعلیٰ ترقی پسندانہ احساسات کی حامل ہے اس میں آزاد تسلسل نظم ہے مگر وہ بھی ایک مسلسل سلسلے کے ساتھ انہیں دائیوں نرسوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کا خیال رحمت، پیشانہ توتوں کے سبب سے مجھے مظہر مولوی اور ملا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ؎

کون ملا
زندگی کا جن کی کچھ مقصد نہیں
اور مقصد ہے تو یہ
دن رات ذکر و فکر میں
اوقات کو ضائع کریں
اور سنتوں کی کہانیاں کریں

اور دیں اذانوں پر اذاں
جس وقت ہم مشغول ہوں الخ

اس مقام پر شاعر کی ترقی پسندی رجعت پسندی کی نمائندہ شخصیت کے خلاف آگ برسانے لگتی ہے۔ رجعت پسندی کے مشاغل کے خلاف شاعر نے یہاں طنز کی جو چنگاریاں اڑائی ہیں اُن کا جواب مشکل ہی سے اب تک کی جدید شاعری میں مل سکیگا اسے پورے طور سے سمجھ لینا چاہئے کہ فرقت کی شاعری اُس "منفی نظام زندگی" کا عکس نہیں ہے جو اس نے موجودہ دور سے ورثہ میں پائی ہے بلکہ بیشتر پرتو ہے اُس "اثباتیت" کا اس "ایجابیت" کا جو اس نے وراثت میں پائے ہوئے نظام زندگی کو روند کر کچل کر پیدا کی ہے۔ فرقت کا فلسفۂ حیات "رجائی" ہے وہ اپنی زندگی کے دامن میں یاس و قنوط کے جراثیم کی پرورش نہیں کرتا سسکتی ہوئی بلکتی ہوئی ہندوستان کی غلام دنیا کی آہیں اور کراہیں سنکر راشد کی طرح وہ یہ طے نہیں کر لیتا کہ "اب بیمار کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہیں اسے اب مر ہی جانا چاہئے" اسے یقین ہے کہ وہ اس بیمار کی رگوں میں نشاط و طرب کا تازہ خون پہونچا کر اس قابل کر سکتا ہے کہ وہ زندگی کے بازار میں پھر سے جوانی کا سکہ چلائے، اسی لئے میرا ان نوجوانوں کو جو زندگی کی نئی قدروں پر ایمان بالغیب لائے ہوئے ہیں اور جائز طور سے لائے ہوئے ہیں یہ مشورہ ہے کہ وہ "نقش فریادی" اور "ا" کے بجائے اس مجموعہ کو حرز جاں بنالیں کیونکہ اُن سے زیادہ اس میں نئی زندگی کی "دوڑتی ہوئی اچکتی ہوئی پہل پہل" بستی ہے۔

مقدمہ کے آخر میں ایک بات اور عرض کرنا ہے، اگرچہ وہ بات نئی شاعری پر خردہ گیری کی حیثیت رکھتی ہے تاہم وہ خلوص کے دل سے نکلی ہوئی ہے اور نئی

شاعری کے امکانات ارتقا کے آستانۂ قدس پر نیازمندانہ سجدے کے قبیل کی چیز ہے اس لئے توجہ سے سُنے جانے کے قابل ہے۔

نئی شاعری کی مقدس کائنات کا جائزہ لینے کے بعد محسوس یہ ہونے لگتا ہے کہ اس مبارک سلسلے میں ابتک جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن کا رجحان خالص انقلابی نہیں ہو سکا ہے۔ انکی حیثیت اصلاحی ہے جس میں رجعت پسندانہ ادبی رجحانات کیساتھ مفاہمت کے جراثیم رینگتے ہوئے پائے جاتے ہیں" اور ا"کے دیباچہ میں ن۔م راشد نے حالی کے متعلق لکھا ہے "حالی کے پاس اخلاقی قدروں کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی اور معیار نہ تھا قدیم تمثیلات اور اصنافِ سخن اور انداز بیان سے اس کی بغاوت محض ضمناً تھی، اگر حالی نے ان قدیم تمثیلات تصورات اور انداز بیان کو اولاً تباہ کرنے کی کوشش کی ہوتی جنھوں نے ہماری شاعری اور ادب کو آج بھی تیخ بستہ کر رکھا ہے تو اس نے بہت بڑا کام کیا ہوتا" ن۔م راشد نئی شاعری کے ایک بڑے رکن ہیں، اُن کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے اور ضرورت ہے کہ اس کی روشنی میں موجودہ شاعری کا بھی جائزہ لیا جائے۔

نئی شاعری تمام "مفید قدروں" کی حامل ہونے کے بعد بھی یکھی ضرور رکھتی ہے کہ اس کی "تکنیک" میں بھی وہی سمجھوتے کی نشانیاں موجود ہیں جن حوصلہ مند افراد نے اس نئی عروس شاعری کو (شاید یہ استعارہ بہت ہی کہنہ و فرسودہ سمجھا جائے اس لئے اس کو یوں بدل لیجئے کہ اس نئی شاعری کی مشرس کو) اپنی "آغوش" میں اچھی طرح بھینچ رکھا ہے، وہ بھی قدیم تمثیلات اور انداز بیان کو پوری طرح سے "دستوری طور" پر تباہ نہیں کر سکے ہیں۔ بیشتر تمثیلات و تشبیہات کا ذاتی رنگ ہے، مرکبات عطفی و توصیفی و اضافی کا وہی انداز ہے فعل و فاعل و مفعول کی وہی کیفیت ہے حروف جارہ وغیرہ کی وہی حالت ہے" انقلابی شکنجہ" میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں

لگ گیا ہے یہ سچ ہے کہ حالی کے "پاس" اخلاقی قدروں" کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی معیار نہ تھا مگر حکیکے سے یہ بات پوچھ لینے کی ہے کہ نئے شاعروں کے پاس ادب کو جانچنے کا معیار" اقتصادی قدروں" کے سوا اور کیا ہے۔ ہاں مگر مجھ سے غلطی ہو ئی، اقتصادی قدروں کے حلقہ سے باہر کوئی قدر نہیں ہے، اقتصادی قدروں کے مرکز پیٹ اور بھوک ہی کی طرف دنیا بھر کی قدریں سمٹی ہوئی چلی آتی ہیں، ایسی حالت میں اقتصادی قدروں سے اخلاقی قدروں کا جو آج کل کی تحقیق میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیا مقابلہ بہرحال اس چپکے سے پوچھی ہوئی بات کو واپس لے لینے کے بعد بھی اس گذارش پر اصرار ہی کیا جائے گا کہ نئی شاعری انقلاب کے پینگ چاروں طرف بڑھاتی نظر نہیں آتی یہی کمی ہمارے محترم دوست فرقت کی موجودہ نئی شاعری میں بھی ہے۔ وہ اسے خوب اچھی طرح یاد رکھیں کہ نیا دور شاعری جب تک کامل و مکمل انقلابی کروٹیں نہیں لے گا اس وقت تک اس کی زندگی کی بھوک میں بیتابی نہیں پیدا ہوگی۔ جہاں تک میں ان کی اس شاعری سے اندازہ کر سکا ہوں حضرت فرقت میں انقلابی شاعری کا توانا" ولولہ" پیدا کرنے کی صلاحیت ہے" اس لئے میرا انہیں دوستانہ مشورہ ہے کہ وہ اس زمین پر قدم جمنے نہ رکھیں بلکہ ابھی اور آگے بڑھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ جدید شاعری کے امکانات آگے پیچھے اوپر نیچے اور کیا کیا ہیں؟ اگر انھوں نے اس میدان میں سست گامی سے کام لیا تو پھر لازمی طور پر اُن کی جگہ کوئی اور دوسرا لے لیگا اور وہ بھی میر، غالب، انیس، اقبال، جوش کی طرح کل کی چیز ہو کر رہ جائیں گے۔

میری ناقص رائے" میں ہماری شاعری کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے اس کی شدید ضرورت ہے کہ صورت، معنی دونوں کے لحاظ سے شاعری کا [illegible]
[illegible]

سے باہر نہیں نکال سکے ہیں اور پُرانی یخ بستہ بحروں ہی سے کام لیتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی
ان کے اوزان میں کچھ کتر بیونت کر دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ آخر وزن کی ضرورت ہی
کیا ہے؟ شاعری سی نازک دلنواز چیز کو ان غیر فطری بیڑیوں میں جکڑ دینا کون سی
خوش مذاقی کی بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے بڑے بوڑھوں کے لئے زیبا تھیں
جنھیں "حُسن" کا صحیح احساس نہیں تھا وہ اگر "موزونیت" کو شعریت میں دلربائی پیدا
کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور نغمہ و ترنم کا حُسن اُن کے نزدیک یہی تھا کہ وہ
توازن و تناسب اصوات کے مخصوص دائرے میں رہے تو ان کی ان بھولی بھالی
باتوں کو "اگلے وقتوں کے" لوگوں کی باتیں کہہ کر ٹالا جا سکتا تھا مگر آج کل کے فرزانہ
و پرکار ترقی پسند نوجوان شاعروں کے لئے یہ کیونکر جائز رکھا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری
کے مئے و نغمہ کا رنگ جمانے کے لئے وزن کے پیدا کئے ہوئے ترنم کے ذریعہ گرمیں،
دل کا اُبال، دماغ کا جوش، "وزن کی سنگینی" کا پابند نہیں کیا جا سکتا وہ جس طریقہ
سے چاہے اُبلے، جوش مارے، فطرت کے روکنے کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا ایک
حقیقی شاعر کی گل افشانیٔ گفتار میں کیف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ
ان تصنعات و تکلفات سے آزاد ہو جائے۔

میراجی یقیناً اس معاملہ میں کسی قدر راہ راست پر ہیں، انھوں نے ارکان
کے ساتھ تھوڑی سی آزادی برتی ہے مگر وہ کافی نہیں، ضرورت ہے کہ ایک مصرعہ
ایک صفحہ کا ہو تو دوسرا ایک لفظ کا اور پھر لطف تو جب ہے کہ ان میں پُرانے ارکان
کا کہیں عکس بھی نہ پڑے، ذوق کو عادی ہونے دیجئے پھر اس میں نغموں کی بجلیاں
پیشواز اٹھائے تھرکتی مٹکتی، ناچتی نظر آئیں گی اسی صورت میں شاعری صحیح
معنوں میں "عوامی" بن سکے گی۔ اور سینٹ پرسینٹ ہندوستانی مزدور کسان
ترقی پسند شاعر ہو جائے گا اور اس پر تنہا اجارہ مارکسی سرخ بجوٹوں یا پھر اُن سے

نقالوں کا نہیں رہ جائے گا اور یہی وہ جنت وہ فردوس ہے جس کی تخلیق کے لئے ہمارے کام مزید تحسین ہو سکتے ہیں۔ یہ تو یقیناً قابل مبارکباد اقدام ہے کہ شعر سے قافیہ وغیرہ کی اوپری کھال کھینچ لی گئی مگر تنہا یہی کافی نہیں ہے، وزن کی باریک جھلی بھی اس سے الگ کر لی جائے، جس طرح "نالہ پابند نَے نہیں ہے" اور جس طرح "فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے" اسی طرح اور بعینہ اسی طرح شاعری کے لئے وزن بھی نہیں ہے، وزن ہی وہ بلا ہے جس نے شاعری میں روایتی عناصر ہر طرف سے گھسیٹ لئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وزن کو خیرباد کہہ دیا جائے تو پھر دوسرے تغیر آسانی سے ہو سکیں گے۔ بلبل کو دیس نکالا دیا ہی جا چکا ہے۔ ذرا سی توجہ میں زاغ و زغن وچغد سے شعر کی بستی آباد ہو سکتی ہے۔ اسی طرح آسانی سے بہادری کی تمثیل کے لئے "شیر" کو ترک کیا جا سکتا اور اس کی جگہ خنزیر و خرس کو بٹھایا جا سکتا ہے یوں شعر کی تکنیک خوش اسلوبی سے بدل سکتی ہے اور اس میں روایتی عناصر کے بجائے وہ چیزیں داخل ہو سکتی ہیں جو زندگی کی حقیقتوں سے وابستہ ہیں۔ کیا امید کی جائے کہ موجودہ ترقی پسند نوجوان شاعر اس مخلصانہ مشورہ پر غور کریں گے۔
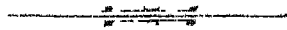
یہ سب کیونکر ہوا

جولائی ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے کہ میرے بہت ہی عزیز اور مخلص دوست مسٹر صباح الدین عمر ایم اے کے چھوٹے بھائی سخت علیل ہو کر میڈیکل کالج لکھنؤ کے یونیورسٹی اسٹوڈنٹس وارڈ میں داخل ہوئے۔ شام کو دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد ہم اور صباح الدین دونوں میڈیکل کالج جاتے اور وہاں رات کے دس گیارہ بج جاتے مختلف مسائل پر گفتگو رہتی۔ وارڈ کے ایک اور مریض کے پاس عصمت چغتائی کے افسانوں کا مجموعہ دیکھا عصمت کے کچھ افسانے میں نے پہلے بھی پڑھے تھے مگر جب صباح الدین نے ان کے افسانہ "لحاف" کا پلاٹ بتایا تو مجھے اس افسانہ کے پڑھنے کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ میں نے عصمت کا مجموعہ لے کر اس افسانہ کو وہیں پڑھا۔ لحاف کے اندر یہ چیزیں بھی ہو سکتی ہیں؟ یہ حقیقت مجھے عصمت کا افسانہ پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوئی اور اس وقت سے میں عصمت چغتائی کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ افسانہ لکھ کر نہ صرف میرے بلکہ کتنے مردوں اور عورتوں کے معلومات میں اضافہ کر دیا۔ اس افسانہ پر بحث ہونے لگی سوال یہ تھا کہ آخر عصمت صاحبہ نے "لذت النساء" یا "تصویر" یا "کوک شاستر" کیوں نہیں لکھا صباح الدین خاموش بیٹھے تھے میں نے ان سے پوچھا "آپ کی کیا رائے ہے" بولے "کرشن چندر صاحب کا مقدمہ دیکھ لیجئے"۔

اس پر میں نے کتاب کا مقدمہ دیکھنا شروع کیا۔ کرشن چندر صاحب نے اس افسانہ کا "پس منظر" یہ بتایا ہے کہ اگر کسی جوان عورت کی شادی کسی بوڑھے سے ہو جاتی ہے تو وہ عورتوں ہی سے دل بہلانے لگتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس افسانہ میں "حقیقت" کو ڈرامائی انداز میں جلوہ گر کرنا مقصود تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی عورتوں کا

اپنی ہی صنف سے "دل بہلانا" کوئی عام اور قابل لحاظ حقیقت ہے؟ ایسے واقعے کو
"الشاذ کالمعدوم" کی حیثیت تو حاصل نہیں ہے؟ کیا اس قابل استثنا واقعے کے
مقابلہ میں یہ عام وہمہ گیر حقیقت اور فطرت نہیں ہے کہ ایسی عورت کسی دوسرے
مرد سے محبت کرنے لگے۔ کیا کرشن چندر صاحب اور عصمت چغتائی صاحبہ یہ بتا سکتی ہیں
کہ انہیں اس قسم کی کتنی عورتوں کا تجربہ ہوا ہے جو کسی بوڑھے سے منسوب ہو جانے کے بعد
"خالی سے بیگار ٹالی" پر عمل کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ایسی صورت میں عورت
کسی دوسرے مرد کی طرف عموماً متوجہ ہو جاتی ہے تو اس غریب پر یہ الزام کیوں رکھ دیا
گیا کہ وہ اپنی بھانجی، بھتیجی اور خادمہ ہی پر کرم فرمائی کرنے لگتی ہے۔ اگر ترقی پسند
حضرات کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو منظر عام پر لاتے ہیں تو کیا وہ یہ
بتا سکتے ہیں کہ ایسے حالات میں جبکہ کسی امر کے واقع ہونے کے عمومی امکانات ہوں
انہیں نظر انداز کر کے وہ کسی ایسی بات پر کیوں زور دیتے ہیں جو "شاذ" ہوتی ہے اور
جس پر زور دینے سے سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال کرشن چندر کا نام
آنے کے بعد ترقی پسند شعراء اور مصنفین پر بحث چھڑ گئی اور رفتہ رفتہ "آزاد شاعری"
نے موضوع سخن کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو آزاد شاعری کے
خصوصیات سمجھانے لگے۔ صلاح الدین نے کہا چھوٹے بڑے غیر موزوں فقرے کئی صفحوں
مصرعوں کی طرح لکھتے چلے جائیے جن میں جنسی بھوک "بھی ہو "انقلاب" کا بھی
تذکرہ ہو مزدور اور پیٹ کا بھی ذکر آ جائے وہی آزاد شاعری ہے۔

"وارڈ جنرل" ہم نے کہا یہ کیا۔ بولے ایک مصرعہ۔ ہم نے کہا دوسرا مصرع
بولے "حسن کا لیبر آئینہ ہے" ہم نے کہا تو؟ بولے ذرا اس کا نظارہ دیکھئے کتنا خوفناک
پھر بولے پانی پی لوں۔ پانی پی کر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بولے "ساتھ ہی دکھ
بھی اور دکھ بھی دیکھئے" ہم نے کہا پانچواں مصرع بولنے میں آپ کی طرح شاعر تو ہوں نہیں

اگر آپ پوری آزاد نظم ہی سننا چاہتے ہیں تو پانچ منٹ کی مہلت دیجئے۔ یہ کہہ کر جیب سے ایک سادہ کاغذ اور پنسل لے کر بیٹھ گئے۔ ہم لوگ کچھ اور باتیں کرنے لگے۔ پانچ سات منٹ بعد جب ہم پھر صباح الدین کی طرف مڑے تو ہم نے دیکھا کہ آپ ایک کاغذ کی لمبی چٹ لئے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ پوچھنے پر کہنے لگے۔ نظم تیار ہے' یہ نظم آپ نے قلم برداشتہ نہیں بلکہ پنسل برداشتہ لکھی تھی۔ ["سمک بلداقی" کے نام سے مع کشاف (حبیب احمد قدوائی ایم۔اے) کے ایک لاجواب تبصرہ کے لکھنؤ کے مشہور روزنامہ حقیقت میں شائع ہو چکی ہے]

وارڈ جنرل!

جس کا نمبر ایک ہے
اس کا نظارہ ہے کتنا خوفناک
ساتھ ہی رنگین اور دلچسپ بھی
اُف تری نرسوں کی

وہ
کالی اودی اور نیلی پیٹیاں
باندھتی ہیں جن سے وہ
اپنی کمر
کیسی کمر؟
پتلی کمر!
جیسے صراحی کا گلا
ہاں ہاں صراحی کا گلا

اور سینہ کا ابھار
گویا بہار اندر بہار
یعنی گلستاں در کنار
دے رہا ہے دعوتِ علم و عمل
بے عمل انسان کو!!

ایک کمرہ، مستطیل
عرض جس کا بیس فٹ
طول اس سے چوگنا
اُس کی دیواریں ہری
طوطیا اُن پر پھرا
بتیاں بجلی کی ہیں
چھت میں لگی

اور
پنکھے
چل رہے ہیں ہر طرف
تیس بستر اس میں ہیں
جس پہ لیٹے ہیں مریض
کالے، گورے، بوڑھے، بچے، نوجوان

سب ہیں گو اُس میں، مگر

وہ رونق بزم حیات
جس کے دم سے اس گلستانِ جہاں میں تازگی
جس کا وجود
باعث افزائش نسل جہاں
روح افزا کیف آور
جس کے دم سے
زندگی میں تازگی، تابندگی، لذت، سرور
ہاں وہی بزم جہاں کی شمع نورانی
نظر آتی نہیں اس ہال میں

پھر بھی اس کا کچھ بدل
نازنیں نرسوں سے ہو ہی جاتا ہے
کیسی نرسیں؟ کچھ نہ پوچھو
وہ کہ جن کا کام ہے
تیمارداری، دیکھ بھال
زخم بیمار کے مرہم لگانا
اُن کا آنا اور جانا اس طرف سے اُس طرف
جس طرح چلتی ہوں انگلی تار پر
طبلہ کا گویا زیر و بم
پاؤں کی آواز سے آتی تھی کیا رنگین صدا!
کھٹ کھٹاک اور کھٹ کھٹاک

اونچی اونچی اور چھوٹی ہیل میں
کیا زندگی کا ساز ہے؟
ہاں ساز ہے!
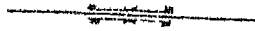
ہونٹ پر سرخی ملے
سرخ!
سرخ بھی کیا رنگ ہے
یادگار انقلاب!
انقلاب لے انقلاب!!
وہ زمین رنگ و بو
جس پہ جنت ہے نثار
جو غریبوں کی ہے دادا اور پرولیتیریت کی بزم گاہ
جس میں عورت اور مرد
دے رہے ہیں زندگی کا اک سبق
اپنے عمل اور فعل سے
جس میں یہ پابندیاں، مہمل، فضول
پائی نہیں جاتیں کہیں
لطف اٹھاتے ہیں جہاں
ہر مرد و زن باہم گر ۔ ہر جگہ
ہوٹل ہو، گھر ہو، یا کہ پارک
عقد کا اور مہر کا جھگڑا جہاں ہوتا نہیں

ہائے اے ناداں ملک
شرم کر ہندوستاں!
اسکو سے کچھ تو سیکھ
تو بھی ان جھگڑوں کو چھوڑ
اور موقع دے کہ عورت اور مرد
اس دو روزہ زندگی میں
کچھ تو دادِ عیش دیں
مل سکیں ہر وقت، ہر دم، ہر گھڑی
ہر جگہ ہر گھر میں، ہر سو، ہر طرف
کافی ہاؤس ہو کہ ہو وہ مے کدہ
سر پہ پٹی چوک کی ہر وقت کر کیونکہ آ گئی ہے نظر
تجھکو ترقی بس وہاں!

خیر بات ختم ہو گئی۔ دوسرے روز صباح الدین کو کچھ کتابیں خریدنا تھیں جب دفتر سے ساتھ چلے تو بولے کہ بھائی دانش محل ہوتے چلیں گے۔ ہم نے کہا بہت خوب یہ کہکر ہم دونوں نے اپنی سائیکلوں کے ہینڈل امین آباد کی طرف موڑ دیئے۔ دانش محل لکھنؤ میں علاوہ ایک کتابوں کی دوکان کے بڑے بڑے ادبا کی ایک بیٹھک یا کلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں صبح اور شام دونوں وقت لکھنؤ کے بیشتر ادیب آکر علمی اور ادبی گفتگو کرتے ہیں اور چونکہ حکیم اسرار احمد صاحب پروپرائٹر دانش محل اور اس کے منیجر مسٹر نسیم احمد کو اردو ادب سے بہت زیادہ لگاؤ ہے اور وہ ہر ادیب سے غیر معمولی اخلاق سے پیش آتے ہیں اس لئے دانش محل ادبا اور شعراء کا ایک اچھا خاصہ مرکز

ہوگیا ہے۔ ہاں تو ہم دونوں امین آباد دانش محل پہونچے۔ وہاں افسر صاحب میرٹھی اور ڈاکٹر اعظم کریوی (جو حسن اتفاق سے اس وقت لکھنؤ میں تھے) مل گئے۔ یہاں اس وقت ایک بحث چھڑی ہوئی تھی اور ایک ترقی پسند ادیب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوع آزاد شاعری اور ترقی پسندی تھا۔ میں نے صباح الدین کی ترقی پسند نظم "ٹانک" کر سنائی۔ سن کر ڈاکٹر صاحب اور افسر میرٹھی صاحب ہنسنے لگے۔ دو ایک دن بعد ہم لوگ پھر دانش محل میں جمع ہوئے اور صباح الدین نے دوسری نظم "نفشنی" سنائی (جو مجموعہ میں مخمور جالندھری کے رنگ کی طنزیہ نظموں کیساتھ درج ہے) ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی نے اس پر مزید نظموں کی فرمائش کی۔ صباح الدین بولے "میں اپنی ترقی پسندی کے ثبوت میں یہ دو نظمیں کہہ چکا لیکن میں ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی مستقل طور سے "ترقی پسند شاعر" نہیں ہوں۔ فرقت صاحب شاعر ہیں گو "رجعت پسند" سہی پھر بھی میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ رجعت پسندی چھوڑ کر ترقی پسندانہ نظم کہنا شروع کریں اور آپ لوگوں کے قلوب اپنے ترقی پسند مواعظ حسنہ سے "منور" کیا کریں اس فرمائش پر دوسرے روز میں نے دو نظمیں لکھیں اور ان کو دانش محل میں کئی ادبا کے سامنے پڑھا نیز میں نے سنجیدگی سے ترقی پسند شعرا کے کلام کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ روزانہ دو تین ترقی پسند آزاد شاعری والی نظمیں بھی کہنے لگا۔ میری ان نظموں کو میرے عزیز دوست سید غلام حسین صاحب اعظم اڈیٹر روزنامہ سرفراز لکھنؤ نے بھی سنا اور اپنے اخبار میں جدید شاعری پر بحث کرتے ہوئے اصلاحی تحریک کے سلسلے میں میری پہلی نظم کو پیش کیا۔ بعد میں ان کی اور دوسرے دوستوں کی مسلسل فرمائش نے مجھے ان نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجموعہ مرتب کرتے وقت مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ "ترقی پسند" اور آزاد شاعری کے بارے میں اردو کے کچھ مشہور و ممتاز ادیبوں کی رائے بھی حاصل کر لوں چنانچہ

میں ان حضرات سے خود ملا یا انھیں خط لکھے ہیں ان کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر فوراً اپنے گرانمایہ خیالات قلم بند کر دیئے۔ ان کی یہ قیمتی رائیں اس مجموعے میں درج کی جا رہی ہیں۔ امید ہے کہ گم کردہ راہ نوجوان طبقہ ان سے صحیح رائے قائم کرنے میں مدد حاصل کرے گا۔

غرض یہ ہے اس مجموعہ کی "شان نزول" اور میں اس کے لئے ممنون ہوں ڈاکٹر اعظم کریوی، سید اعظم حسین صاحب، افسر میرٹھی صاحب، حبیب احمد قدوائی صاحب، نسیم احمد صاحب اور صباح الدین عمر کا جنھوں نے سب سے پہلے میری ہمت افزائی کی اور اس مجموعہ کو مرتب کرنے کی تحریک کی ہیں مولانا سید اختر علی صاحب تلہری کا بھی خاص طور پر ممنون ہوں کہ موصوف نے بڑی سرگرمی سے میری قلمی امداد فرمائی صباح الدین نے ترتیب دینے میں بھی میرا ہاتھ بٹایا مگر وہ کہتے ہیں کہ میرا شکریہ ادا نہ کرو"

اسی کے ساتھ میں ڈاکٹر تاثیر ن۔ م راشد صاحب فیض احمد فیض صاحب میراجی اور مخمور جالندھری صاحب کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے اپنی بعض نظموں سے مجھے اس حد تک "متاثر" کیا کہ میں اس رنگ میں اپنے خیالات کو پیش کر سکا۔

غلام احمد فرقت۔

مزاحیہ مضامین

"ترقی پسند" شاعر کی ڈائری کا ایک ورق

یکم جون۔ آج ۱۹۴۳ء کی منتخب نظمیں دیکھیں ان میں ایک نظم میری بھی شائع ہوئی ہے۔ چوتھے صفحہ پر۔ آٹھ آنے ہوتے تو ایک کاپی ضرور خرید لیتا۔ درحقیقت یہ مجموعہ میرے ترقی پسند شاعر ہونے کی سند ہے مجھے ضرور خرید لینا چاہئے پہلی نظم میراجی کی ہے۔ دوسری ن۔ م راشد کی تیسری مخمور جالندھری کی اور چوتھی میری ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ میں فیض احمد فیض۔ اور ڈاکٹر تاثیر سے بڑھ گیا۔ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

واہ۔ ترقی پسند شاعر ہونا بھی کتنی بڑی سعادت ہے۔ آزاد شاعر ہونے سے پہلے میں کیا تھا؟ کچھ نہیں کس شمار و قطار میں تھا۔ لوگ مذاق اڑاتے تھے پھبتیاں کستے تھے یہ تھی میری عزت۔ پرانے ڈھنگ کی شاعری کمبخت بڑی ہی مشکل ہوتی ہے۔ عربی پڑھکر عروض پڑھئے بحروں کے نام یاد کیجئے۔ پھر قافئے تلاش کیجئے۔ الفاظ ڈھونڈئے اسکے بعد انھیں موزوں کیجئے تب کہیں جاکر ایک شعر ہو پھر اس کے بعد بھی یہ مصیبت کہ لوگوں کو پسند آئے یا نہ آئے۔ بھلا یہ بھی کوئی حماقت ہے۔ شاعری تو ایک تفریحی چیز ہے اتنے عرصہ اس حماقت میں مبتلا رہا۔ اگر شروع سے آزاد شاعری کرتا تو آج نہ جانے کہاں سے کہاں ہوتا پھر اس ساری دماغ سوزی کے بعد ملا کیا؟ محض واہ واہ! کوئی زیادہ مہربان ہوا چائے پلا دی۔ پان و سگریٹ سے تواضع کر دی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بھلا اس جھنجھٹ میں کون پڑے کس کے پاس اتنا فضول وقت ہے جو

ضائع کرے۔ اور کس کو دماغ ہے جو ان تمام بندشوں کا اپنے کو پابند بنائے۔ جناب والا
ایسی شاعری اور ایسے شعر کہنے والے کو سات سلام۔ یہاں تو سستی شہرت کے ہمیشہ سے
طالب تھے اور ہیں۔ منتخب نظموں میں آگئے مطلب حل ہو گیا۔ مراد پوری ہو گئی۔ نہ دماغ
سوزی کرنا پڑی اور نہ قافیہ اور ردیف کی تلاش میں راتوں کی نیندیں حرام کرنا پڑیں
نہ آسمان و زمین ایک کرنا پڑے نہ دانتوں میں بار بار انگلی دبا کر سوچنے کی ضرورت
پیش آئی۔ نہ لکھ کر کاٹنا پڑا اور نہ کاٹ کر لکھنا پڑا۔ یہاں تو سیدھی سادھی سڑک مل گئی

یہ تو بس سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی شاعر آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

مزے سے منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ جو لکھ دیا شعر ہو گیا۔ جو کہہ دیا ادب۔ غرض
ایک مصیبت تھی ٹل گئی۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

وہ ایڈیٹر جو آج مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں آج تک میرے کلام کو مہمل سمجھ
کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے تھے مجھے کرسی دینا شاق گذرتا تھا۔ آزاد شاعری نے
تو میری دنیا ہی بدل دی کتنی جلدی صف اول کے شعرا میں شمار ہونے لگا۔ آج مجھے
ایک چھڑی بھی خریدنا ہے۔ ٹوپی کے روپے چار رکھے ہیں۔ اب اس کی چھڑی ہی خرید لونگا
اور اگر دام بچ گئے تو ایک سگریٹ کیس بھی لے لونگا۔ ترقی پسند شعرا ہمیشہ ٹوپی نہیں
دیا کرتے کتنے نادار ہوں مگر جیب میں سگریٹ کیس اور ہاتھ میں سگریٹ [illegible] خواہ
دو بیڑی لئے یا کسی کمپنی کا کوئی مال کیوں نہ ہو ضرور رکھتے ہیں۔ ٹوپی دقیانوسی
جیسے شاعروں کا لباس تھا اسے ترقی پسندوں نے لباس سے خارج کر دیا اچھا
[illegible] چیز ہیں ہوا لگنے کی ضرورت ہے آپ کپڑے سے ڈھکنا کیا معنی؟ آزاد شاعر

میں بڑی خوبیاں ہیں اول تو طبیعت ہر وقت موزوں رہتی ہے۔ دوسرے چھوٹے بڑے مصرعے پر کوئی اعتراض نہیں تیسرے جس وقت قلم اٹھایا۔ کچھ نہ کچھ کہہ لیا۔ اب اسی نظم کو جو منتخب نظموں میں شائع ہوئی ہے دیکھ لیجئے۔ میں نے کتنی دیر میں کہی دماغ پر کچھ بھی زور تو نہیں دینا پڑا۔ اسی روز آزاد شاعری شروع کی۔ خالی الذہن ہو کر چھوٹے بڑے بے ربط اور لایعنی فقرے ایسے الفاظ میں جو کانوں کو اچھے معلوم ہوئے لکھ کر رسالہ میں بھیج دیئے خیال تھا کہ کون شائع کرے گا فضول لفافہ برباد ہو رہا ہے۔ مگر اُسے "ادب برائے زندگی" میں جگہ ملی۔ ایک رسالہ نے شائع کی کئی رسالوں نے فخریہ نقل کی اس روز سے میراجی ن۔ م۔ راشد اور دیگر ترقی پسند شعراء کی شاعری کا گُر معلوم ہو گیا۔ چنانچہ ان تین ماہ کے عرصہ میں چوتھے نمبر پر ہوں۔ اگر اسی طرح کہتا رہا تو تیسرے نمبر کا شمار ہونے لگوں گا۔ مگر ابھی میراجی اور ن۔ م۔ راشد والی بات نہیں پیدا کر سکا ہوں۔ میرے قلم سے بیشتر بامعنی فقرے نکل جاتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میراجی اور ن۔ م۔ راشد کو غالباً مجھ پر اسی سے فوقیت ہے۔ ان کے یہاں ایک فقرے کو دوسرے فقرے سے کوئی دور کا لگاؤ نہیں ہوتا فیض احمد فیض اور ڈاکٹر تاثیر کو اسی چیز نے مارا۔ وہ زیادہ تر دقیانوسی شعر کہنے لگتے ہیں جس سے انکے کلام میں غیر ترقی پسندی کی بو آنے لگتی ہے میراجی اور ن۔ م۔ راشد کو نیچا دکھانے کے لئے ان دونوں کے کلام کا کافی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مخمور جالندھری کی مقبولیت کا گُر میں جان گیا۔ اگر میں کبھی عورت کے اعضائے رئیسہ کی تعریف ایسے الفاظ میں کرنے لگوں جو کانوں کو اچھے معلوم ہوں اور بے ربط فقروں میں ان الفاظ کو اس طرح پیش کروں کہ چیز نظروں میں کھپ جائے تو مخمور سے بڑھ سکتا ہوں۔ لیجئے خود بخود ایک مصرعہ دماغ میں آیا جا رہا ہے اچھا ڈائری ترک کر دوں اور اس مصرعہ کو لکھ لوں کہیں دماغ سے اتر نہ جائے بالکل مخمور کے رنگ میں ہے "کیا تری ساری کا آنچل

اور ہٹ سکتی نہیں"۔ لیجیے مصرعہ لکھتے ہی جذبات کا ایک سیلاب امنڈا آرہا ہے۔ اسے میں کیا کروں ٹھہرو ٹھہرو۔ للہ مجھے دوات میں روشنائی تو ڈال لینے دو۔ اچھا نہ ڈالوں گا نظم مکمل کرلوں۔

پہلا مصرعہ ۔ کیا تری ساری کا آنچل اور ہٹ سکتا نہیں
دوسرا " ۔ اور ترے سینہ کا وہ رنگیں ابھار
تیسرا " ۔ سامنے میرے نکھر سکتا نہیں
چوتھا " ۔ دے رہا ہے دیر سے جو
پانچواں " ۔ شوخیوں کی دعوتیں
چھٹا " ۔ اک ذرا اپنی نگاہِ گرم سے
ساتواں " ۔ لب آسا نور سے ٹکڑوں کو تم
آٹھواں " ۔ اس طرح جھنجلا کے جنبش دو ذرا
نواں " ۔ جس طرح ہوں سیب پتوں میں چھپے
دسواں " ۔ اور ہوا کا تیز جھونکا زور سے
گیارھواں " ۔ آکے ڈالی کے قریب
بارھواں " ۔ زور سے دیوے ہلا
تیرھواں " ۔ اور مجھ سے یوں بگڑ کر تم کہو
چودھواں " ۔ جس طرح بچے جھکا کر کوئی ڈال
پندرھواں " ۔ دفعتاً ہاتھوں سے اپنے چھوڑ دیں۔

لیجیے نظم مکمل ہوگئی۔

ترقی پسند خواتین کا ایک مشاعرہ

ترقی پسند شعراء جو اس مشاعرہ میں اپنا کلام پڑھیں گی

(۱) مس تیرا بالی
(۲) ڈاکٹر مس دلگیر بانو
(۳) مس فیض بانو
(۴) این ۔ ایم ۔ واحدہ
(۵) مس ظفر بانو
(۶) مس میخوار جالندھری

مشاعرہ ایک ہنڈال میں ہو رہا ہے، سامعین میں کافی تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتیں اور لڑکیاں شریک ہیں شعراء میں ہندوستان کی سچھ چوٹی کی مذکورہ بالا ترقی پسند شاعرہ شریک ہیں۔ ڈائس پر میز کے گرد سات کوچ ڈال دیئے گئے ہیں جو ان ترقی پسند خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔

شامیانہ میں سُرخ کپڑے پر سُنہرے کاغذ کے کٹے ہوئے انگریزی حرفوں میں لینن اور سٹیلن سے اقوال جگہ جگہ لگے ہیں میز پر سگمنڈ فرائیڈ اور عذرا پاونڈ کے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ہیں۔ ڈائس سے اتر کر نیچے شامیانے میں چاندنی کا فرش ہے جس پر عورتوں کی کثرت سے کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں بعض عورتیں اپنے بچوں کو بھی لائی ہیں جن میں دو ایک رو بھی رہے ہیں۔ مشاعرہ کا وقت آگیا۔ شاید براڈ کاسٹ بھی ہونے والا ہے کیونکہ ہنڈال کے باہر ایک طرف آل انڈیا ریڈیو والے بھی ٹہلتے دکھائی پڑ رہے ہیں۔ لیجئے آٹھ بج گئے۔ چھ " ترقی پسند خواتین ہنڈال میں ڈائس کے قریب ایک راستہ سے داخل ہوئیں۔

خواتین شعراء کی وضع قطع بھی ملاحظہ فرماتے چلئے۔ رنگ برنگی فراکیں۔ بال ترشے ہوئے۔

لبوں پر لپ اسٹک کی گہری پالش۔ منھ پر پاؤڈر۔ رخساروں پر غازہ لمبی اور بھدی انگلیوں پر بڑے بڑے ناخون جن پر کیوٹکس کی صیقل۔

جلسہ کی سکریٹری ڈاکٹر مفید جہاں سفید سلک کی ساری پہنے قریب کی کرسی پر بیٹھی ہیں۔ ڈائس پر خواتین کے قدم رکھتے ہی ڈاکٹر مفید جہاں اور مس حسین آف لکھنؤ یونیورسٹی استقبال کے لئے بڑھیں سکریٹری نے خوش آمدید میں آہستہ سے تالیاں بجائیں جس کے بعد سارا پنڈال دوسری خواتین کی تالیوں کی آواز سے گونج گیا پہلے ڈاکٹر مفید جہاں نے مختصر الفاظ میں خواتین شعراء کا سامعین سے نام بنام تعارف کراتے ہوئے اور ان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔
"بہنو" آج ہم اپنے ملک کی ان چھ مایہ ناز ترقی پسند خواتین سے آپ کا تعارف کراتے ہیں جنھوں نے اپنے قدم میمنت لزوم سے ہمارے شہر اور ہمارے مشاعرہ کو زینت بخشی ہے۔ ہمارا ادب اور ہمارا سماج آپ ہی کی اصلاحوں کا مرہون منت ہے۔

گیٹ سے ایک آواز۔ سواری اتروا لیجئے۔

سکریٹری مشاعرہ (انگریزی میں what is this) یہ کیا ہے؟

عورتوں میں اس پر کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔

سکریٹری "ہاں تو میں آپ سے عرض کر رہی تھی کہ ہماری شاعری میں ہماری ان مہمان خواتین کے کلام نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے سماج میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے اور ہمارے سامنے ایسے جدید رجحانات پیش کئے ہیں جن پر بھرپور غور کر کے عمل کرنے کی ضرورت ہے جنسیات کی گہرائیوں کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے ہمارے سامنے زندگی کے ایسے مفید اور کار آمد مسائل پیش کئے ہیں جن پر چل کر ہم مردوں کے دوش بدوش زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکتے ہیں پھر اپنے لطیف جذبات اور خیالات جس اچھوتے انداز میں پیش کئے ہیں وہ حقیقتاً ہمارے

ادب کی جان ہے۔

ایک آواز۔ ارے کمبخت ہٹ کب سے چوس رہا ہے۔ ساری جان نچوڑے لیتا ہے (اس کے بعد ایک شیر خوار بچہ کے رونے کی آواز سے ایک بے لطفی سی پیدا ہو جاتی ہے)

ڈائس سے کئی آوازیں (بچے کو چپ کراؤ۔ پنڈال کے باہر لے جاؤ بچے والیوں کو کس نے آنے دیا۔؟

ایک دھیمی سی آواز جس نے تم سانڈنیوں کو آنے دیا۔

بچے والی عورت۔ اے واہ اچھی زیادتی ہے نگوڑا ایسا شاعرہ چولھے بھاڑ میں گیا جس میں بچے والیوں کو ممانعت ہو۔ بچہ جب قابو میں ہو۔ تب ہی تو چپ کراؤں (بچہ گود میں مچل جاتا ہے) ارے چپ۔ چپ۔ چُپ۔ چپ۔ بچہ کی ننگی پیٹھ پر کئی تابڑ توڑ ہاتھ پڑنے کی آواز سنائی پڑتی ہے۔

کئی آوازیں ایک ساتھ "اے تم بچے کو یہاں لائی ہی کیوں؟"

دوسری آواز۔ ایسی ماں پر حضرت بی بی کی جھاڑ د۔ جو کمبخت شیر خوار کو ایسی بے دردی سے مارے کہ غیروں کے دل کو چوٹ لگے۔

تیسری آواز۔ اچھا کیا۔ جب بچہ نہ مانے تو یہی کرے۔ نگوڑے مرد بچے پیدا کر دا کے چھوڑ دیں۔ اور خود الگ ہو جائیں۔ مائیں بدنصیبیں دنیا کی کسی دلچسپی میں شریک نہ ہو سکیں۔ نگوڑی اولاد جان کا جنجال غرض ہر طرف سے چاؤں چاؤں شروع ہو جاتی ہے۔

ڈائس سے (ایک آواز) آپ لوگ چاؤں چاؤں بند کریں اور جو خواتین اپنے ہمراہ بچے لائی ہوں براہِ کرم وہ یا تو اپنے بچوں کو گھر بھجوا دیں یا براہ عنایت ان کو لے کر پنڈال سے باہر چلی جائیں۔ تاکہ دوسری خواتین کے سننے میں حرج نہ

واقع ہو ٹکٹ کی پشت پر پہلے ہی سے لکھ دیا گیا تھا کہ بچوں کو لانے کی ممانعت ہے۔ اس اعلان کے بعد کئی عورتیں بچہ دبائے گیٹ کی طرف بھنبھناتی ہوئی جاتی دکھائی دیں
"واہ بھئی واہ۔ کیا زبردستی ہے۔ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے
بچہ ایک کا رو دیا الزام سب بچوں پر پھر سب بچے والیوں کو پنڈال چھوڑنے کا نادر شاہی حکم۔ پنڈال جیسے انھی لنگوڑیوں ہی کا تو ہے۔
(قریب کی ایک عورت جو بے بچہ کے تھی) ـــــــ ٹکٹ کی پشت پر پہلے سے پڑھ نہیں لیا۔ (چپکے سے) مری جاتی ہیں مشاعرہ سننے کے لئے۔
(دوسری عورت ترش ہو کر) واہ بہن واہ۔ تم بھی انھی کی ایسی گانے لگیں صاحب ٹکٹ سبھی لیں اور جھڑکیاں بھی سنیں۔ ایک آدھ بچہ بھی نہ لانے پائیں مجھے تو ان لنگوڑیوں پر ہنسی آتی ہے جو ڈائس پر بیٹھی غرا رہی ہیں کوئی چڑیا کا بچہ پیدا کیا ہوتا تو اس کی قدر جانتیں مردوں کے کولہے سے کولہ جوڑے بیٹھنا جانیں بچوں کی مامتا کیا جانیں لنگوڑی بانجھیں ہیں بانجھیں۔
سکریٹری۔ خاموش خاموش اب مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔
سب سے پہلے ہمارے ملک کی مایۂ ناز شاعرہ نیرا بائی جو باہر سے تشریف لائی ہیں، آپ کو اپنا کلام سنائیں گی، مگر قبل اس کے کہ ہماری بہن اپنا کلام سنائیں میں آپ بہنوں سے بتا دینا چاہتی ہوں کہ آپ پنجاب کے مشہور ترقی پسند شاعر میراجی کے کلام سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اسی رنگ میں آپ کہتی ہیں۔ حال میں جو آپ نے تازہ نظم "بیٹھک" کہی ہے وہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہیں۔
نیرا بائی۔ عرض کرتی ہوں۔

جوش چھایا ہوا جوانی کا
میرے رخسار کے غزالوں پر

بادۂ آتشیں سے یہ ساغر
میری دوشیزگی کے شاہد ہیں
اور مری مست نظروں پر
صد ہا نوجوانیاں صدقے
دھیمے دھیمے سنبھل سنبھل کے بڑھو
اس جوانی کے دھندلکے میں کہیں
دل جلے ہونٹ پا نہ لیں مجھکو
اور وہ لب کا تشنہ و بے تاب
نہ کہیں میرے کھینچ لے رخسار
اور پھر روشنی میں آنے پہ
اس طرح بھاگ جائے نظروں سے
جیسے بدنفس مولوی کا ضمیر
اپنی ڈاڑھی کی آڑ میں چھپ کر
چپکے چپکے گناہ کر ڈالے
اور کسی پر عیاں نہ ہو پائے
جوش چھایا ہوا جوانی کا

تمام عورتیں دنگ ہو کر رہ جاتی ہیں
ایک آواز۔ یہ شعر آپ نے نثر میں کہے ہیں یا نظم میں؟
ڈائس سے کئی آوازیں۔ خاموش خاموش۔
سکریٹری۔ اب آپ کے سامنے ڈاکٹر مس دلگیر جہاں صاحبہ اپنی نظم پیش
کریں گی جس کا عنوان ہے۔ "دوسیبوں کی قربانی"

ڈاکٹر مس دلگیر جہاں صاحبہ۔

ڈاکٹر مس دلگیر جہاں۔ (سکریٹری صاحبہ سے) براہ کرم پنکھے کا رخ ذرا ادھر موڑ دیجئے۔ گرمی بہت پڑ رہی ہے (یہ کہتے ہوئے فراک کے اوپری بٹن کھول کر مجمع سے) عرض کرتی ہوں۔

کیوں ابھاروگے انھیں آہ یہ مرجھا جائیں گے۔

اتنا ہی اونچا انھیں رہنے دو

یہ مسافر ہیں چلے جائیں گے۔

ہیں جوانی کے نقیب

احترام ان کا کرو

روٹھ جانے پہ یہ واپس نہ کبھی آئیں گے

کیوں ابھاروگے انھیں آہ پچک جائیں گے

عمر میں آہ فقط ایک دفعہ

قبل پکنے ہی کے آنکھوں کو کھلنے لگتے ہیں

ان کو ہاتھوں سے نہ چھو

بار بار ہاتھ لگانے سے یہ ڈھل جائیں گے

اور پچک جائیں گے۔

کیوں ابھاروگے انھیں آہ یہ مٹ جائیں گے؟

ایک آواز۔ اس نظم کا عنوان ذرا پھر سے فرما دیجئے۔

سکریٹری۔ اس کا عنوان ہے "سیبوں کی قربانی" شامیانہ کے باہر

ایک مردانی آواز۔ یہ عنوان تو کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

اس پہ تمام عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ایک عورت۔ اے کمبخت مردانہ تک آوازیں جا رہی ہیں۔ دیکھو تو کسی نگوڑے نے کیسی چوٹ کی۔

دوسری عورت۔ اے جب سیبوں نگوڑوں کی تعریفیں اپنے آپ کرو گی تو مردوئے کہاں سے گئے گزرے ہوئے جو داد نہ دیں گے۔ اے پہلے ان غیرت والوں سے کہو، جو ترقی پسند بنکر آئی ہیں۔ نگوڑی فراک کے بٹن کھول کر سیبوں کی تعریف۔

سکریٹری۔ خاموش خاموش اب آپ کے سامنے مس فیض بانو اپنی نظم سنائیں گی۔

مس فیض بانو۔ اس نظم کا عنوان ہے "خوشبوئیں" ملاحظہ ہو۔

رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو
مرے دل میں پیہم چلی آ رہی ہے
رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو
کہیں اور کھینچے لئے جا رہی ہے!
وطن سے بہت دور لئے جا رہی ہے

جوان ایک جنوں ہے
بہاریں ترے باغ میں سو رہی ہیں!
پسند اب مجھے ہے ترا قد موزوں
نگاہوں کی تیلی میں ہے سخت اینٹھن
ہرن کی ہے اک کھال دوشیں حسیں پر؟
رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو
اندھیرے مکانوں میں لئے جا رہی ہے
سماج اپنے بندھن کو خود توڑتا ہے۔

ہزاروں سے رشتے مرے جوڑتا ہے
حسین اور تنومند مردوں کا افسوں
مرے دل کو بہلا رہا ہے
یہ میری فراک اور اس میں ہے لرزش
یہ غازہ ــــ ــــ لپ اسٹک
یہ چودہ صدی کی دوشیزہ جوانی بکھی جا رہی ہے
کسی کی بغل میں چھپی جا رہی ہے
نگاہوں میں سب کے کھبی جا رہی ہے
رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو

نظم کے ختم ہوتے ہی عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور بڑے پائنچے والی "قدامت پرست" عورتیں ڈائس کی طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہی ہیں۔ مگر اسکول اور کالج کی لڑکیاں ہر ہر مصرعے کی داد پورے جوش و خروش کے ساتھ دے رہی ہیں اور ہر نظم کے ختم ہونے پر واہ۔ واہ ــــ سبحان اللہ (Good Excellent) کی آوازیں ان۔ اف کالج۔ اور ال۔ بی گرلس اسکول کی لڑکیوں کی صفوں سے آ رہی ہیں۔

سکریٹری۔ اب مس این۔ ایم۔ واحدہ آپ کے سامنے اپنا کلام پیش کریں گی۔ آپ لوگ خاموشی کے ساتھ سنئے اور سنجیدگی سے داد دیجئے۔ آپ حضرت ن م راشد کے کلام سے متاثر ہو کر نظمیں لکھتی ہیں اور پڑھتی بھی تقریباً اسی انداز میں ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہے "اندیشہ"

این۔ ایم۔ واحدہ عرض کرتی ہیں۔

آہ میری جان کبھی شب کو سہری کے قریب

محمل خواب پہ جذبات مرے لوٹتے ہیں
لاکھ چہرہ مرا بے نور سہی
چشم و ابرو میں ہیں لنگور سہی
تیری رس دار جوانی سے بہت دور سہی
پھر بھی میں رات کے سناٹے میں ہو آتی ہوں
جاگتے میں نہ سہی خواب کی دنیا میں سہی
تجھ سے جب کھیلتی ہوں دیر تلک کھیلتی ہوں
آمری جان کبھی شب کو مسہری کے قریب
میرے مینار پہ آ
اپنے رہوار پہ آ
تیرے بوسوں کی تمنا کی ہلاں ہیں حرف خموش
رات بھر یوں ہی پڑی رہتی ہوں
کھول دے دست جنوں ساز سے جمپر کے بٹن
نیم گوں ہاتھوں سے، ہاں لمس فقط ایک ہی لمس
اپنی بے کیف جوانی کی قسم
عید، بقر عید تو آ جا مرے کاشانہ میں
منتظر ہوں کہ مجھے چھیڑ کے دیکھے تو کوئی
ایسی کچھ کھیلتی ہوں
دیوتا دیکھ محبت کے جھمیلے ہیں
دعوتیں دیتے ہیں اٹھو اشارے تری نظر دل کو
سحر کیا یوں ہی گزر جائے گی

اور جوانی یہ بڑھاپے میں بدل جائے گی
آ، مری جان کبھی شب کو مسہری کے قریب

باہر سے ایک آواز۔ بہت خوب آج خاکسار حاضر ہوگا۔

عورتوں میں سے ایک۔ (سکریٹری صاحبہ سے) میں دست بستہ گذارش کرونگی کہ آپ شامیانہ کے قریب سے مردوں کو ہٹوا دیں کیونکہ برابر باہر سے فقرے بازیاں ہو رہی ہیں۔

قریب سے ایک عورت۔ (چپکے سے) اے بڑی زبردستی ہے۔ شب کو مسہری کے قریب ان کو آنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ پھر اگر وہ دعوت قبول کریں تو ان پہ دانت پیسے جائیں۔ لے پہلے دعوت دینے والی کو کہا ہوتا جو بڑی ترقی پسند کی بچی بنی ہیں۔ اس کے بعد مردوں کو کہا ہوتا۔ مردوں نگوڑ ماروں کی ذات تو بے حیا ہوتی ہی ہے۔

سکریٹری۔ اچھا آپ گھبرائیں نہیں۔ مرد ہٹوا دئے جائیں گے۔ مگر آپ لوگ خاموش رہیں۔

مس حسین باہر جا کر واپس آتی ہیں اور اعلان کرتی ہیں کہ اب آپ بالکل اطمینان سے مشاعرہ سنیں سب مردوں کو ہٹا دیا گیا ہے۔

ایک عورت۔ (دوسری عورت سے مخاطب ہو کر) لے تم کیا ہٹاؤ گی تمہارا تو بس نہیں کہ ان کو اور بغل میں بٹھا لو۔

سکریٹری۔ اچھا اب آپ لوگ خاموش رہیں مس ظفر بانو اپنا کلام آپ کے سامنے پیش کریں گی۔

آپ کا رنگ بہت کچھ میراجی سے ملتا جلتا ہے بلکہ اکثر اشعار اپنی معنویت کے اعتبار سے میراجی سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

مس ظفر بانو۔ اس نظم کا عنوان ہے "یاد" عرض کیا ہے۔

دیر سے لیٹی ہوں آغوشِ چمن کے دلِ رنگیں کے قریب
ایک سایہ کی طرح جو لپٹا ہے تنزیب کے مانند سفید
ہے وہی میرا رقیب
مجھکو لگتا ہے عجیب
اک قلمدان کے کاندھوں پہ ہیں دو شیشے کی رنگین دواتیں بیٹھی
جن کے اندر ہے ہرے رنگ کی دبلی سی سیاہی لیٹی
جو محبت میں گھلی جاتی ہے
اور اک ننھی سی نب
جس کی باریک لکھائی کا گلہ ہے سب کو
جس پہ چلتے ہیں مرے سوز کے گھبرائے سے حروف
اور تکرار میں لڑتے ہی چلے جاتے ہیں
ایک بے خوابی کا خواب
کیا یہاں کوئی نہ تھا
ہے چھپائے ہوئے سینہ میں حیا کے موتی
گھونٹ کے لہروں نے سمندر سے نکالا جو حسیں چہرہ کو
ایک تلخابۂ ہستی بادۂ بے رنگ کا اس پر ٹوٹا
اور گھڑی اس نے لگائی تو تھا دریا اس پار
تشنگی سے گذرتے ہوئے سناٹے ہیں
رات کی گہرائی سے
وہ بے کیف مسہری کی تو اٹھ

"رات بھر لیلیٰ پڑی رہتی ہے یوں"
تیرگی میں ہوں ستارے جس طرح پر رس بھرے
اور کبھی بھولا ہوا انجم اگر آئے تو شعلہ سا اٹھے
جیسے سُلفے سے دھواں
یا ذہن میں تان سے لپٹی ہوئی
جذب کر لیتا ہے جب اس کو خلا کا دامن
یاد کر اٹھتی ہوں تنہائی میں
تیرے آنسو جو ہیں شعلے سُلگے سے
دُکھ بھرے ہاتھ کے کاندھوں پہ سوار
بھول کر تیرگی کی روح کو میں آ پہنچا
دوش پر پھول لئے رات کی بے کیفی سے
آہ ساری کو مری مت کھینچو
(درد دل بھی کیا کوئی معشوق ہے)
اس کے وہ نغمۂ رنگیں بکھر جائیں گے
جس میں ہیں سیکڑوں آنکھوں کے چھلکتے ہوئے زندہ موتی
(ہاں کل کے لئے بناتے جائیں)
کچھ حکایات عجیب
میرے روزن کے قریب
(یاد آتی مجھے دلاتے جائیں)
دور سے ایک مردانی آواز آتی ہے:-
"چپکے اپنا تو اوقات ملتے ہیں"

عورتوں میں پھر کا نا پھوسی ہونے لگتی ہے

ایک عورت: نگوڑوں کو بکنے دو بکتے بکتے آپ ہی تھک جائیں گے۔

دوسری عورت: لے جھاڑو پھر سے ان "ترقی پسند" نگوڑیوں پر جو بات بات پر روز روز ان اگا لئے ہوئے ہیں۔

لے اسکول میں کیا یہی سکھایا جاتا ہے۔ واہ کیا ترقی پسندی ہے۔ اسے ایسی ہی بے تابیاں تو کسی کے ساتھ نکل بھاگیں روکتا کون ہے۔

سکریٹری صاحب: اب آپ کے سامنے مس مخمور بانو صاحبہ حضرت مخمور جالندھری کے مخصوص رنگ میں اپنا رنگین کلام پیش کریں گی۔ امید ہے کہ آپ اس سے محظوظ ہوں گی۔

مس مخمور بانو: عرض کرتی ہوں۔ اس نظم کا عنوان ہے "بھوک"

بھوک کا شاہکار

پیٹ پر سوار ہے

ہر ایک چیز ہے گراں

گراں گراں بہت گراں

اسی خیال و فکر میں

جہان ہے رواں دواں

دواں۔ رواں

رواں۔ دواں

ہے انقلاب ہر طرف

اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

مگر ابھی تلک نہیں

خبر نہیں کدھر یہ ہے

ادھر ہیں پردہ داریاں

اُدھر ہیں پردہ داریاں

ستم ستم

غضب غضب

فضول ہیں اصول سب

یہ سب اصول توڑ دو

ہمیں ہمیں یہ چھوڑ دو

یہ کوئی عدل عدل ہے

کہ اک طرف تو مرد کو

ملیں ہزاروں عورتیں

ادھر ہمارے قلب پر سماج کا ہو کنٹرول

اور کنٹرول ریٹ پہ

بہت ملے تو ایک مرد

ہے یہ بھی کوئی دل لگی

کہ یاں تو آگ ہے لگی

ہزار ریاں ادھر

اُدھر ستمرانیاں

سماج کیا ہے جھول ہے

ٹھٹھول ہے ٹھٹھول ہے

لگا دو بڑھ کے اس میں آگ

ہر ایک چیز ہے گراں
بھوک کا شاہکار

ایک خاتون جو کسی بڑے گھر کی شریف خاندان معلوم ہوتی ہیں "معاف کیجیے یہ بھوک آپ کو مبارک رہے۔ یہی آپ لوگوں کی تہذیب ہے۔ یہ آپ ترقی پسندوں کا درس دینے آئی ہیں۔ یا ہماری لڑکیوں کے اخلاق و آداب تباہ کرنے تشریف لائی ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ"

سکریٹری۔ آپ خاموش رہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اس طرح مشاعرہ تباہ کریں۔

بہت سی آوازیں نہیں ہم ایسی ترقی نہیں چاہتے نہیں چاہتے نہیں چاہتے بہت سی آوازیں۔ ان نگوڑی فرنگن زدوں کو نکالو یہ سب ہم لوگوں کا اخلاق تباہ کرنے آئی ہیں۔ ایک ہنگامہ ایک شور مچنے لگتا ہے بہت سی عورتیں ٹوٹ کر حملہ کر دیتی ہیں۔ اسی ہنگامہ میں کئی یونیورسٹی کے لڑکے اندر گھس آتے ہیں اور ساتوں "شاعراؤں" کو اپنی اپنی گود میں لے کر عورتوں کو چیرتے پھاڑتے پٹتے پٹاتے بھاگ نکلتے ہیں!!
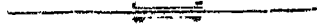
آزاد شاعری

بعض ترقی پسند شعراء کے ادب برائے ہوتے ہیں انکے "ادب برائے زندگی" والے شعر تو آپ نے بارہا سُنے اور پڑھے ہی ہوں گے مگر جب جنسیات سے متاثر ہو کر یہ حضرات شعر کہتے ہیں تو ان میں ایک خاص "کیف اور ندرت" ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جناب ن م راشد کی اُس نظم کے دو ٹکروں سے لطف اندوز ہو جائے جس کا عنوان ہے "انتقام" ارشاد ہوتا ہے۔

اُس کا چہرہ اُس کے خدوخال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

شاعر فرائڈ سے متاثر ہے لاشعور میں جو واقعات اور احساسات پنہاں لیئے ہیں وہ برابر نکلنے کی راہ تلاش کیا کرتے ہیں۔ شاعر جب یہ نظم لکھنے بیٹھا تو شاید اُسے اپنے عنفوان شباب کا کوئی واقعہ یاد آگیا اور یہ واقعہ اس کے لاشعور سے نکل کر اس کی زبان قلم تک پہونچ کر نظم ہو گیا۔

نظم کے مصرعوں کے جوڑنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا ہر حسن رہگزر سے پر مسرنرم کی مشق کر رہا ہے، ایک اجنبی عورت اِدھر سے گذرتی ہے یہ ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینے والے

جوش سے دیوانہ ہو کر اُسے چھاپ بیٹھتا ہے۔ عورت کا جسم شاعر کو بہت لطیف اور گداز معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کے خدوخال پر نظر ڈالے بغیر وہ اس کے جسم سے انتقام لینے لگتا ہے۔ اور چونکہ اس کا برہنہ جسم اس کو بہت مرغوب ہے اس لئے اب تک زبان پر اسی کے چٹخارے ہیں اور وہ برہنہ جسم اسے اب تک یاد ہے۔

اسی شاعر کی ایک دوسری نظم "خودکشی" جو آپ اپنی نظیر ہے وہ بھی بڑی دلچسپ اور "بلند پایہ" ہے پہلے مصرع کے بعد دوسرے اور تیسرے مصرع میں ارشاد ہوتا ہے۔

تمام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں

یہ تو گویا عصر و مغرب کے درمیان شاعر کا روزمرہ کا معمول تھا کہ عورت کو ننگا کرنا اور اس کا تمام جسم نوک زبان سے چاٹ کرنا تواں بنانا۔ اب دوسرے بند میں رات کی مصروفیتیں ملاحظہ ہوں۔

ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اُس کے تختِ خوابِ کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ درخشاں لہو،
بوئے مے میں بوئے خون الجھی ہوئی

عشوہ ساز اور ہرزہ کار محبوبہ کے پاس سے مطلب یہ کہ اس کے حریم ناز میں اس کے تختِ خواب ناز کے نیچے جہاں شاید کسی میلے جھگڑے میں اس کا تازہ اور درخشاں لہو تھا شاعر پہونچ جاتا ہے بہر حال محبوب کی بغل میں نہ سہی اُسکے تخت کے نیچے سہی

عاشق کو جو سر زمین مل ہی گئی وہ بھی مدینہ کی خاص خاص تاریخوں میں ورنہ
ہزاروں ناکام و نامراد عاشق تو اس سعادت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ
محبوبہ کی گلی سے لاگو کتے ان کی جھلک پاتے ہی ان بدنصیبوں کو گھر تک ریٹا
رتے ہیں اور عاشق حسرت دیدہ میں ساری زندگی گذار دیتا ہے "ترقی پسند شاعر"
نے کم از کم اتنی ترقی تو کی کہ محبوب کے تازہ اور درخشاں لہو کی بو سونگھتے سونگھتے
اس کے تخت کے نیچے پہونچکر دبک رہا۔ غالباً یہی وہ ہمت مردانہ ہے جو "ترقی پسند
شاعر" اور شعراء متقدمین میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ بہرحال اس اعتبار سے
شاعر اور شاعر کی نظم دونوں بھرپور کامیاب ہیں اور وہ مستحق مبارکباد ہے۔
اب آئیے اسی جھنجھے سے ایک دوسرے رنگت استاد حضرت مخمور جالندھری
کے کلام بلاغت نظام کے کچھ ادبی جواہر ریزوں کی زیارت کریں جنھوں نے جنسیات
سے متاثر ہو کر اپنے کلیجہ کے بڑے بڑے ٹکڑے نکال کر آپ کے سامنے رکھ دئیے ہیں
ایک عورت کو کپڑے بدلتے دیکھکر آپ فرماتے ہیں۔

موتیا رنگ کی انگیا میں گرہ کس کے نہ دے
کیا نمائش نہیں منظور تجھے جوبن کی
رہبروں سے نہیں تو چاہتی کیا داد نگاہ
سمجھا سمجھا میں تری فطرت چالاک کے داؤ
تیری خواہش ہی تری سب سے بڑی خواہش ہے
دیکھنے والوں کو دوشیزہ نظر آئے تو

شروع مصرعوں میں تو خیر ان کا کام اتنا عیاں ہیں اُن کو چھوڑ دیئے اس کے
بعد دوشیزہ کے بعض داؤں پیچ اور ارادوں کی روشنی میں دوسرے بند پہ
نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ شاعر کن گہرائیوں میں پہونچ گیا اور کیسی کیسی دشواریاں

محسوس کرنے لگا ملاحظہ ہو۔

چمٹا جاتا ہے ترے جسم سے یوں تیرا قمیض
ڈر ہے شانہ نہ بٹن توڑ کے عریاں ہو جائے
نیفہ سرکا کے نہ بل ریشمی شلوار میں ڈال
ڈر رہا ہوں میں کہیں یہ تیرا مطلب تو نہیں
کہ مجھے منزل مقصد پہ پہونچنے کے لئے
اتنے پر پیچ مراحل سے گزرنا ہوگا

یہ بند چونکہ "ادب برائے زندگی" کی جیتی جاگتی تصویر ہے اس لئے اس کا مطلب صرف دانت میں انگلی دبا کر سوچئے اور دل ہی دل میں مزہ لے لیجئے اور شاعر کو اسکی بلندیٔ تخیل کی داد دیجئے اور دعا کیجئے کہ اسکی مشکل آسان ہو اور ساتھ خیریت کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ ریشمی شلوار پہ بل ڈال دینے سے بہت سہما ہوا ہے اور اس سے اس کی راہ میں بہت سے الجھاوے پیدا ہو گئے ہیں یہ واقعہ ہے کہ شعرا متقدمین کو یہ چیزیں کہاں نصیب۔ ایسی دشوار گذار منزلوں کی تلاش اور ایسے "پرکیف" مقصد کی تکمیل کے لئے ثابت قدمی شرط ہے ایسے کاموں کے لئے تو محمود جالندھری اور موجودہ "ترقی پسند شعراء" جیسے دل و دماغ رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہے جن کی ادبی دنیا میں ریشمی شلوار ول کو اس طرح کس کس کر باندھا جاتا ہے کہ مردوں کے دلوں کو چوٹ لگتی ہے۔

آپ کی ایک نظم "لذت گناہ" بھی ہے جس میں نظم کے شروع ہوتے ہی آپ نے اپنے اغراض و مقاصد بیان کر دیئے ہیں فرماتے ہیں۔

میں شرافت کا گلا گھونٹ کے آج آیا ہوں
بے حیائی دلِ بے باک میں بھر لایا ہوں

ظاہر ہے کہ جب آشنا بڑا کارنامہ فرما کر آئے ہیں اور دل بے باک کو
بے حیائیوں سے بھر لیا ہے تو پھر جونہ کر بیٹھیں تھوڑا ہے مثل مشہور ہے
ننگا خدا سے چنگا۔ خیر اس کے بعد کی کارگزاریاں ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں۔

آج آیا ہوں خدا سے بھی بغاوت کر کے
ننگ و ناموس کا سامانِ ہلاکت کر کے

میری تنقید یہ ابرو کی کمانوں کو نہ کھینچ
غنچہ میں کھول کے جوبن کے اٹھانوں کو نہ کھینچ

اپنے پھلکے ہوئے سینہ سے لگا لے مجھکو
اے گنہگار گنہگار بنا لے مجھکو

آپ نے معشوق کو ابرو کی کمان اور تیر مژگاں کی باڑھ پر تو عاشقوں کو رکھتے
سنا ہوگا مگر اب ہمارے ترقی پسندوں نے اپنے ٹپکے کے معشوقوں کو ایک نئے آلۂ حرب
سے مسلح کیا ہے جس کا چوتھے مصرع میں ذکر ہے۔ ہاں اس عصر کا ایک اور ترقی پسند شاعر
منطق انھونوی ہے جس نے اسی اچھوتے آلۂ حرب کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ع

سینے پہ دو بم کے گولے قاتل نہ تھا؟

اس نظم میں جو الوداعی پیغام دیا گیا ہے وہ بھی بڑا کیف آور ہے۔

اچھا رخصت کوئی اور اب مرے بعد آئے گا
تیری کچلی ہوئی لاش اور کچل جائے گا

آپ نے ذوق کا شعر سنا تھا۔

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا | جو خود ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

مگر "ترقی پسندوں" کا باوا آدم نرالا ہے وہ لاش کچلنے کے بعد اور لوگوں کو لاش
کچلنے کی دعوت دیتے ہیں بات یہ ہے کہ ترقی پسند ابدیت کے قائل نہیں وہ زندگی چاہتے

ہیں لاش کچلنے میں ان کو ایک فوجی شان نظر آتی ہے جو دشمن کے سپاہیوں کو روندتی ٹھکراتی، اور کچلتی علاقوں پر علاقے فتح کرتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لہذا کچلی ہوئی عورت کو ان کا جھانکے یا دیگرے کچلتا رہتا ہے اور یہی ان کے یہاں زندگی کی تعریف ہے۔

انہی شاعر کی ایک تیسری نظم "شکستِ حجاب" ہے جس میں ایک عورت ایک مرد سے کہتی ہے خیال تو فرمائیے سوائے کسی "ترقی پسند عورت" کے کیا کوئی عورت ان الفاظ کو زبان پر لانے کی جرأت کر سکتی ہے۔ اور انکو پڑھکر ہماری آپکی بچیوں کے اخلاق پر کیا اثر پڑیگا۔

ذرا گھنے گھنے بالوں سے کھیلنے دے مجھے
رسیلے ہونٹوں سے گالوں سے کھیلنے دے مجھے
الگ نہ ہو مری سانسوں کی آنچ سے ڈر کے
یہ گورا گورا بدن بھینچنے دے جی بھر کے
جھکا نہ اپنی نگاہیں حیا سے اوپر دیکھ
ہر ایک چیز کو بے خوف ہو کے چھو کے دیکھ

ملاحظہ فرمایا آپ نے گھنے بالوں سے کھیل کا آغاز ہوا۔ پھر نئی نئی فرمائشیں ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ ہاتھ چولی سے دامن اور دامن سے نہ جانے کہاں کہاں پہونچ گیا دیکھئے نا۔ ہونٹوں سے گال اور گال سے بدن پر اترنے کے بعد جب مرد کی شرم و حیا سے گردن جھکنے لگی تو اُسنے اپنی تمام چیزیں کھول کر سامنے رکھدیں اور عام اعلان کر دیا کہ ہر چیز کو بے خوف اور بلا روک ٹوک چھُو۔

چنانچہ آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

کھلے ہوئے ہیں کنول انپہ ہاتھ رکھ کے تو دیکھ
تمام رس بھرے میوے ہیں ان کو چکھ کے تو دیکھ

اب صرف ایک چیز کی کسر رہ گئی اور وہ یہ کہ اگر چکھنے کی دعوت دینے کے بعد

ایک مصرع اس مضمون کا اور بڑھا دیا جاتا کہ "اگر مزہ نہ ہو تو دام واپس" تو نظم مکمل ہو جاتی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے کہا تھا ؎

بوسہ بمن دادہٗ دشنام مدہ
باز ستان گر نہ پسند دیدہ

مگر سعدیؒ نے درحقیقت ہمارے اس ترقی پسند شاعر کو منھ چڑھایا ہے لفظ "باز" پر شیخ سعدیؒ کو ناز ہو سکتا ہے مگر یہاں تو ہر ہر لفظ موتیوں کا مالا ہے پورا شعر گڑ بڑ جھالا ہے جس میں "ہر چیز کا دام چھ پیسہ" کی آوازیں سنائی پڑ رہی ہیں۔ اور ایک پکار یہی ہے کہ "مزہ نہ ہو تو دام واپس"۔

ایک اور شاعر احمد ندیم قاسمی ہیں عموماً اچھا کہتے ہیں مگر جب "ادب برائے زندگی" کہنے والوں کی زبان میں کچھ فرماتے ہیں تو یوں فرمانا شروع کر دیتے ہیں۔

چھپتی چھپتی جھجکتی جھلکتی مرے پاس آتی تھی
رستوں سے کترا تی جب کھیتوں میں چھپ جاتی تھی
اور جب گھبرا کے کہتی تھی —— "کوئی دیکھ رہا ہے"
سامنے کی پگڈنڈی پر دہ کالا دھبہ کیسا ہے
میں ہنس کر کہتا تھا —— پگلی یہ تو وہم ہے تیرا
کوئی اگر ہو بھی تو یہ رکھا ہے چاقو میرا
وہ میرے پہلو میں سمٹ کر چپکے سے یہ کہتی تھی
یہ وادی تجھ سے پہلے دوزخ سا بنی رہتی تھی
تجھ سا بانکا گبرو پایا —— واہ رہی قسمت میری
دیکھو گرما کے جاتے ہی —— مجھکو چھوڑ نہ جانا

یہ نظم ۴۲ء کی منتخب نظم ہے۔ شاعر صاحب غالباً اپنی طالب علمی کے زمانہ
میں اپنی موسم گرما کی خوش فعلیوں کا ذکر فرما رہے ہیں جب غالباً وہ دیہات
میں اپنے علاقہ کی دیہاتی لڑکیوں پر اپنی جودتِ طبع صرف کرتے ہوں گے چنانچہ
انہیں بدنصیب لڑکیوں میں سے کسی ایک لڑکی کے عشق و محبت کی داستان اس نظم میں
مزے لے کر بیان ہو رہی ہے۔ واقعہ کچھ اس قسم کا معلوم ہوتا ہے۔

شاعر پر کوئی دیہاتی لڑکی عاشق ہے۔ یاد اللہ بڑھتی ہے چھپ چھپا کر
کھیتوں منڈیروں اور پگڈنڈیوں پر ملاقاتیں ہوتی ہیں ایک روز کسی کھیت میں
کوئی غیر معمولی صورت پیش آجاتی ہے لڑکی گھبرا کر کہتی ہے "کوئی دیکھ رہا ہے"
مگر یہ حضرت پگلی اور بیوقوف کہکر دلاسا دیتے ہیں اور جب اس کے بعد بھی وہ
گھبراتی ہے تو اپنا کھلا ہوا چاقو جس کو حفظ ما تقدم کی غرض سے کارِ خاص کا
آغاز کرتے وقت انہوں نے کھول کر بغل میں رکھ لیا ہے دکھا کر کہتے ہیں کہ
مزاحمت کرنے والے کے لئے یہ چاقو کافی ہے۔ لڑکی دنیا و مافیہا کو بھول کر مست
ہو جاتی ہے اور اسکے بعد شاعر کو "گبرو جوان" قسم کے الفاظ سے خطاب کرنے لگتی ہے
اور اس وادی کو جنت بتاتی ہے جہاں یہ "کارِ نیک" انجام پا رہا ہے۔

مگر اس عریاں نظم سے قطع نظر احمد ندیم قاسمی ایک اچھے شاعر ہیں ان کی
اس نظم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ان "ترقی پسندوں" سے متاثر ہوتے
جا رہے ہیں اور اس سیلاب میں بہے جا رہے ہیں جو ان سب کو فنا کے گھاٹ اتارنے
جا رہا ہے اگر ان کو ان کی اس قسم کی لغزشوں پر نہ ٹوکا گیا تو اردو ادب کا ایک
خوشگوار اور ہونہار شاعر جس سے ہم کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں گمراہیوں میں
پڑ کے مخمورِ جمالِ بشری بن کر رہ جائے گا۔

اچھا اب چلتے چلاتے آخر میں میراجی کی نظم "حرامی" اور "سرِ راہے" کے

دو بند بھی سُنتے چلئے اور اُن کی بلندیٔ فکر کی داد دیجئے۔ میراجی اپنی نظم حرامی میں حرام کار لڑکی کی تعریف کرکے دنیا کے حرامیوں کی سرپرستی فرماتے ہیں اور اپنی نظم کا آغاز یوں کرتے ہیں۔

قدرت کے پرانے بھیدوں کا جو بھید چھپائے چھپ نہ سکا
اُس بھید کی تو رکھوالی ہے۔
اپنے جیون کے سہارے کو اس جگ میں اپنا کر نہ سکی
یہ کم ہے کوئی دن آئے گا وہ نقش بنانے والی ہے
جو پہلے پھول ہے کیاری کا پھر پھلواری ہے مالی کی

ظاہر ہے کہ حلالیوں کے بعد حرامیوں کا طبقہ کسی کی سرپرستی سے کیوں محروم رہ جاتا ایک طبقہ آخر اس کو سراہنے والا پیدا ہی ہوگیا۔ آپ ہی کی ایک دوسری نظم ہے "سرسراہٹ" جس کا پہلا مصرع ہے۔

یہاں ــــــ ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں؟

"یہاں" اور "ان سلوٹوں" کا مفہوم تو آپ نظم کے عنوان ہی سے سمجھ گئے ہوں گے۔ ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھنے کی اجازت کی ایک ہی رہی۔ اے حضرت آپ ہاتھ نہیں اس پر پیر رکھ دیں۔ آپ اپنی صحت کے ذمہ دار ہیں آپ کسی سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت۔ "سرسراہٹ" کے بعد کے کچھ مصرعے اور ملاحظہ فرمائیے اور سوچئے تو اس کا انجام کیا ہوگا اگر شاعر غیر شادی شدہ ہو۔

یہ لہریں ہیں یہی جاتی ہیں اور مجھ کو بہاتی ہیں
یہ موجِ بادہ ہیں ساغر کی، خوابیدہ فضا دل میں
اچانک جاگ اٹھتی ہیں
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے

تو اُس کے ہونٹ متبسم ہوں! ——— شاید قہقہہ اٹھکر

اس کے بعد کے مصرعے بہت بڑے بڑے ہیں جن کا کاغذ متحمل نہیں ہو سکتا

اس لئے اتنے ہی مصرعوں پر قناعت کیجئے اور ان "ترقی پسندوں" کی شاعری کا اندازہ کیجئے کہ یہ ادب برائے زندگی ہے یا برائے موت یقین جانئے اس "سرسراہٹ" کے بعد اگر فرائڈ کے فلسفہ پر عمل درآمد کیا گیا اور اس سرسراہٹ کو اپنے ہاتھوں مٹانے کی کوشش کی گئی تب تو ظاہر ہے یہ فعل خودکشی کے مترادف ہوگا اور اگر دوسروں سے اس "سرسراہٹ" میں مدد لی گئی تو قابل دخل اندازی پولیس ہوگا اور ساری آزادپسندی دھری رہجائیگی کیونکہ یہ ہے برطانوی راج -

کھیا! اب جو چاہو کرو یہ ہندوستانی راج ہے - آزادی میں دیدیگر بلاؤ تو کوئی روکنے والا نہیں ہے -

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے!

از مسٹر شوکت تھانوی

لوگ کہتے ہیں کہ میر سا شاعر پھر نہ پیدا ہوا۔ غالب پر کوئی غالب نہ آسکا،
اب کون سمجھائے ان حضرات کو کہ جناب والا میر نے ریلوے اور موٹروں پر بیٹھ کر
شعر نہیں کہے ہیں۔ غالب کسی دفتر میں کلرک کیا کسی رسالہ میں ایڈیٹر نہیں تھے
وہ شاعر تھے اور محض شاعر۔ گھروں میں لیٹ کر شعر کہتے تھے۔ راتیں اپنی تھیں
دن اپنے تھے، وقت اپنا تھا۔ فرصتیں اپنی تھیں۔ گاڑی اپنی تھی اور بیل اپنے
تھے۔ یہاں وہ فرصتوں میں ڈھلے ہوئے اشعار کہاں۔ یہ شعر کہ بائیسکل پر بیٹھے گھڑی دیکھتے
دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔ نظریں ٹریفک پولیس کے اشاروں پر، کان لگے ہیں
موٹروں کے ہارن پر۔ دل دھڑک رہا ہے اس خیال سے کہ موٹر کی جھپیٹ میں
نہ آجائیں یا سائیکل کی لپیٹ میں کوئی راہ گیر نہ آجائے اور زبان کی نوک پر
مصرع طرح موجود ہے شام کے مشاعرے کا۔ دفتر میں پہونچے تو سامنے فائلوں
کا ڈھیر، ارد گرد اہل غرض حضرات کا ہجوم اور سب کا الگ الگ مقصد۔ مصرعے
دماغ میں آتے رہتے ہیں مگر یہ منظر دیکھ کر پھڑک جاتے ہیں۔ بمشکل تمام جو مصرعے
پھنس گئے ان کو بلاٹنگ پیپر پر لکھ لیا۔ دن بھر اسی طرح مصرعے بچاتے شام کو
سب مصرعے جمع کرکے دو سے تقسیم کر دیئے۔ حاصل تقسیم ہوئی اشعار کی تعداد، اور یہ
اشعار جاکر مشاعرے میں سنا دئیے۔ اب بتائیے کہ یہ اشعار کیونکر میر اور غالب کا
جواب ہوسکتے ہیں۔ میر اور غالب کو انہی حالات میں مبتلا کرکے کچھ کہلوائیے تو پتہ چلے
کہ وہ خود بھی اپنے معیار پر اترتے ہیں یا نہیں مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ہر زمانہ اپنی

ضروریات کو خود سمجھتا ہے اور خود ساتھ لاتا ہے فرصتیں تھیں تو طلسم ہوشربا لکھنے اور پڑھنے کا ذوق لایا۔ فرصتیں محدود ہوئیں تو یہ ذوق ناول میں محدود ہو گیا فرصت اور محدود ہوئی تو ناول افسانہ بن گیا۔ فرصت اور مختصر ہوئی تو افسانہ بھی مختصر ہو گیا۔ اسی شاعری نے زمانے کے ساتھ چولے بدلے۔ فرصتیں تھیں تو یاں کھلاتی تھیں مصروفیتیں غزلیں کہلوانے لگیں مصروفیت اور بڑھی تو غزلیں بھی ختم آزاد شاعری سہی جس وقت جتنی فرصت ملے اتنا بڑا مصرع کہہ لیجئے۔ یہ نہیں کہ سب مصرعے برابر کے ہوں بعد میں سب کو یکجا کر لیجئے ایک نظم ہو جائے گی۔ مثلاً آپ کو پانچ منٹ کی فرصت ہے تو آپ پانچ منٹ والا مصرع کہہ لیجئے۔ ع

"ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن"

پھر کسی وقت ایک منٹ کی فرصت والا مصرع کہہ لیا۔ ع

"جو ترے سینہ میں تھی"

اسی طرح کبھی تین منٹ کی فرصت ملی کبھی ڈھائی منٹ کی اور کبھی پونے چار منٹ کی اسی مناسبت سے مصرعے ہوتے چلے گئے اور آخر میں جا کر ایک آزاد نظم کچھ اس طرح کی تیار ہو گی۔

ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن
جو ترے سینہ میں تھی
وہ دھڑکتا ہوا دل
کچھ چھلتے ہوئے ارمان بھی تھے جو ہر طلب
یعنی خاموش
اور آنکھوں کے دریچوں میں حیا بیٹھی تھی
سیر کرنے کے لئے

تب عرش پہ تھے چاند ستارے لرزاں
خطا سرطاں کی قسم
میں نے دیکھا ہے کہ خود کانپ رہی تھی تو بھی
ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن

اس نظم سے یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو جائے گی کہ شاعر کوئی ہیکا آدمی نہیں ہے۔ اس کو شاعری کے علاوہ دنیا میں اور کام بھی ہیں اور اُس کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ ہر مصرع کے لئے برابر کا وقت مہیا کرتا پھرے مطلب یہ کہ نظم مختلف اوقات میں مختلف قسم کے مصرعوں سے بھی مرتب ہو سکتی ہے فی الحال اس قسم کی نظمیں کہنے کے لئے وقت مل رہا ہے لیکن جب اتنا وقت بھی نہ ملے گا۔ تو آج کل جو عنوان ہوا کرتا ہے۔ وہی نظم کا درجہ حاصل کرلے گا مشاعرے میں اعلان ہوگا کہ اب زید صاحب، بکجر کے انکی تازہ نظم سنئے زید صاحب بکردی ڈائس پر آکر گائیں گے "بدلے بہار" مشاعرہ تالیوں کی گونج سے اڑ جائے گا اور زید صاحب بکردی سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آجایا کرینگے

(ماخوذ از کتاب لاہور)
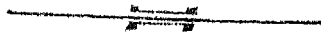
اسخ۔ غالب کے نام

ازجناب نادم سیتاپوری

مرزانگ۔ لاہور

۷ر نومبر......

مائی ڈیر غالب! آداب! معاف کرنا میں تم کو جواب دیر سے لکھ رہا ہوں! بمبئی چلا گیا تھا۔ مجھے وہاں سے اپنی ایک نظم "فٹ پاتھ" براڈ کاسٹ کرنی تھی!...... اور ترقی پسند شعراء کی کانفرنس میں شریک بھی ہونا......! غالباً کانفرنس کی کارروائی تم اخبارات میں دیکھ چکے ہو گے۔ تمھاری "نظم" "غزل" پہونچی "اصلاح" تمھاری خواہش ہے کہ میں اصلاح کر دوں اس نظم پر......! جو تمھارے خیال میں "نظم" ہے اور میرے نزدیک...... بہم و بے ربط الفاظ کا ایک ادق اور مبہم گورکھ دھندا......!...... لال بجھکڑ کی ایک پہیلی......! عقل و قیاس سے بہت دور کا ایک ذہنی واہمہ......! نہایت موٹے موٹے الفاظ کے پنجرے میں گھٹتا ہوا ایک مقید پرند...... "شاعری" جیسی...... آزاد چیز کے لئے یہ قید و بند...... یہ پابندیاں...... یہ رکاوٹیں...... بتاؤ...... سوچو...... غور کرو! کہاں تک مناسب ہے یا ہو سکتا ہے "شعر" ......! تم عروض و قافیہ میں جکڑے ہوئے الفاظ...... ردیف و قافیہ میں سسکتے ہوئے خیالات! وزن اور بحر کی تاریکیوں میں گھٹتے ہوئے جذبات! مقطع و مطلع میں الجھی ہوئی دل کی دھڑکنوں...... کو شاید تم شعر سمجھتے ہو! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شیکسپیر...... بائرن...... شیلے...... ملٹن...... ہومر......

اور ورڈز ورتھ ...... ایسے لافانی شاعروں کے نیچرل رومانس کے مطالعہ کا تمھیں
اتفاق نہیں ہوا ...... ورنہ تم خود محسوس کر لیتے کہ جو "نظم" تم نے میرے پاس
اصلاح کے لئے بھیجی ہے وہ تمھیں نہ بھیجنی چاہئے تھی ...... مجھے!
"شعر" ...... درحقیقت نام ہے کائنات کی ان برہنہ حقیقتوں کا ......
جن پر سماج اور سوسائٹیوں کی پابندیوں کا کوئی اثر نہ ہو۔ دنیا کی عریاں ترین
حقیقتیں! دل کی چھپی ہوئی دھڑکنیں ...... پریم کی دہکتی ہوئی چنگاریاں ہجر و
فراق کی غم افروز لذتیں۔ وصل و وصال کی پرکیف مسرتیں! حقیقتاً یہ "شعر" ہیں
...... لیکن ...... اگر ان کی سچائیوں کو چھپا دیا جائے! ان کی برہنگی پر لتا سا
ڈال دی جائے ...... اور سیدھے سادے الفاظ میں ان کو غیر مبہم طور پر نہ
ادا کیا جائے ...... تو کیا یہ "شعر" کی تعریف سے الگ نہیں ہو جاتے۔
"شاعری" کوئی اصطلاحی چیز نہیں! بزرگوں کا چھوڑا ہوا ورثہ نہیں!
غلامانہ قید و بند سے دور ...... قدامت اور جہالت سے منزلوں فاصلے پر ......!
کائنات کے اڑتے ہوئے ذرے! سورج کی پھیلی ہوئی کرنیں ...... باد صبا کے
خوشگوار ٹھنڈے جھونکے ...... جس آزادی ...... روح پرور آزادی
کے لئے تڑپ اٹھتے ہیں ...... روح کی ...... خیالات کی ...... جذبات کی ...
یہی سچی اور عریاں حقیقی "شاعر" ہیں۔
"موزونیت" کا مفہوم یہ نہیں! جو تم سمجھے ہو! اصل میں خیالات کی بے تکلف
بیساختگی کا نام ہے موزونیت! نہ کہ "ٹیون" پہ سیٹ کئے ہوئے فقرے! جن کو
"مصرعہ" کہتے ہو تم ......؟
ایشیائی شاعری دنیا میں جتنی ناکام رہی اور ہے اس کا سبب یہی ہے
جو میں نے لکھا ہے!

ان کے الجھے ہوئے خیالات ...... اجکڑے ہوئے جذبات ... پھڑپھڑاتی ہوئی آہیں ...... سسکیاں لے لے کر ختم ہو گئیں اور ختم ہو جانا چاہتی ہیں -!

آزادی دنیا کا ایک سب سے بڑا حق سب سے جائز مطالبہ ...... اور زندگی کا ایک کیف آور رومان! اس کے دروازے بند کر دیئے جائیں ایک "شاعر" پر! جس کی روح جس کا جسم جس کے خیالات جس کے جذبات! بالکل اس طرح آزاد ہیں جیسے جنگل کے خوبصورت پرندے ...... ندی کے شور مچاتے ہوئے آبشار ...... کھلے ہوئے میدانوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ......!

میرے پیارے ...... ! تمہارے خیالات کی میں قدر کرنا چاہتا ہوں ...... مگر ایسی نظموں سے نہیں!

بےشک تم میں ایک اچھے ترقی پسند شاعر بننے کے جراثیم موجود ہیں اگر تم ان کو ٹھکانے سے کام میں لاؤ ...... ! معاف کرنا ... میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ میں تمہاری بھیجی ہوئی پوری "نظم" "غزل" ٹھیک کر کے بھیج دیتا ...... مگر کیا کروں ...... اس مہینے میں ہندوستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرا پروگرام ہے! اور ترقی پسند شاعری پر جو فلم بن رہی ہے اس کو بھی مجھے "فلمانا" ہے! اس کے علاوہ کئی جگہ ترقی پسند شعرا کی کانفرنس بھی!

ان وجوہ سے فی الحال بالکل مجبور ہوں۔ صرف تمہارے ایک "ٹکڑے" پر جو تمہاری اصطلاح میں "شعر" ہے اصلاح کر رہا ہوں۔

تمہارا "ٹکڑا" ہے!

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ سارا "ٹکڑے کا ٹکڑا" میرے خیال میں بدل دینے والا ہے اس لئے

فلمزد کر رہا ہوں اب اس طرح یہ پڑھا جا سکتا ہے۔
ایران کی ایک المناک صبح میں ....!
جب ...... وہ اپنے طلائی تخت پر بیٹھا ہوا تھا ....!
اور ...... اُس کے خوشنما تاج کے چمکتے ہوئے ہیروں پر سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں پڑ رہی تھیں!
مودب کھڑی ہوئی نازک اندام خواصیں شاخوں کی طرح جھوم جھوم کر مرچھل ہلا رہی تھیں،
درباری امرا کھڑے تھے!
وہ ...... آیا۔
اُس کے ماتھے پر مصیبتوں کے آبشار مچل رہے تھے!
وہ "فریادیوں" جیسا کاغذی لباس پہنے ہوئے تھا۔
وہ ...... زمین پر جھک گیا!
ادب کے ساتھ!
اُس کی آنکھیں نمناک ...... اور دل ٹائم پیس کی طرح ٹک ٹک ٹک کر رہا تھا۔
بال بکھرے ہوئے تھے!
بادشاہ نے اُس کی طرف دیکھا نگاہ بھر کر!
وہ کچھ کہنا چاہتا تھا ....
کچھ نہ کہہ سکا ...... مگر ......!
اُس کی داہنی آنکھ سے ...... گوہن کی گولی جیسا ایک آنسو زمین پر آ رہا! وہ فریادی تھا۔
اب اس شعر کی لذت کا اندازہ کرو۔ تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اب یہ شعر کتنا بلند
ہوگیا! اسکی لطافتیں کتنی بڑھ گئیں ...... اسکی شعریت میں کیا حسن پیدا ہوگئے!
اُمید ہے کہ خیریت سے ہوگے ... اچھا ... اب خدا حافظ۔ تمھارا
م۔ غ۔ شاجی

غالب کے ایک شعر پر "پانچ ترقی پسند" شاعروں کی اصلاحیں

دورِ حاضرہ کے ترقی پسند شعراء شعرائے متقدمین سے یکسر مختلف ہوتے ہیں، ان کے رنگ ڈھنگ جدا۔ ان کے اسلوب نرالے۔ ان کا طرزِ بیان انوکھا۔ ان سب کے استاد "میراجی" ایک علیحدہ رنگ کے مالک ہیں۔ ن م۔ راشد کا دوسرا رنگ ہے ڈاکٹر فیض احمد فیض کچھ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کچھ اور۔ مخمور جالندھری تو گویا "آرٹ ہی آرٹ" لکھتے ہیں۔ غرض

ع ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد

ہم اس نشست میں مرزا غالب کے دیوان سے ایک شعر لے کر انہی ان "ترقی پسند" شعراء کے سامنے پیش کر کے ان سے اصلاح دلواتے ہیں اور ان اصلاحوں کی ایک ایک نقل مرزا مرحوم کو جنت میں ارسال کر دی جائے گی تاکہ جنت میں ان کے لئے سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

مرزا غالب کا یہ شعر۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

"میراجی" کی خدمت میں اگر بغرض اصلاح پیش کیا جائے تو بڑی ناک بھوں چڑھانے کے بعد اس کو اس شکل میں تبدیل کر دیں گے۔

چار کھڑے سے کہار
ٹھوکریں ہر ہر قدم کھاتے ہوئے

آستانِ عشق کی دہلیز پر
اپنے سپنوں کو لے کر آ گئے
اور آہوں کے دھوئیں اُڑنے لگے
آسماں پر میرے نالے اس طرح پر سر ہوئے
جیسے چھٹتے ہیں انار
ہاں ہاں یہی دیسی انار
جیسے کوئی نقرئی آوازیں
تیلی تیلی اور چھریری ڈال پر
اُس کے بیچ بیچ میں اٹکا ہوا
دوش پر اپنے انگوچھوں کی سریلی راگنی گاتے ہوئے
جا رہے ہیں تیز رو
چاند نگر سے کہار
آہ کو چے سے مرے
اور میری آرزو کی سرحدِ دل سے دور دور
کہہ رہا ہوں روک دو
لیکن بلا کے ڈھیٹ ہیں
کہنے پہ بھی رکتے نہیں
دوش پر لادے ہوئے
کندھوں کے بالکل وسط میں
موٹی سی اک سپنوں کی لاش
جس میں بیٹھی ہے خموشی سے نہایت ننھی

سینہ تانے لب پہ لپ اسٹک ملے
اور کیوٹکس اُس کے ناخونوں میں ہے ایسی لگی
جیسے اک طوطے کی چونچ
ہاں ہاں کسی طوطے کسی کی چونچ
یا حسین چغتائی آرٹ
رہ گذر سے ایک گرگٹ کودتا اس راہ کو
دوش پر منزل بہ منزل ہے سوار
دونوں طرف
جب ازل سے اور ابد تک ایک ہو جاتے تھے وہ
جیسے اک دُمدار تارا ہو جبیں کی راہ میں ننگا کھڑا
تیرے کوچے کی ہوا کے دوش پر
بیٹھا ہوں میں
جس طرح پر گیت میں لرزاں ہو ئی اک تان ہو
اور اسکی راہ کے ذروں کے کندھوں پر سوار
سیکڑوں اندھی ہوا کی آندھیاں لپٹی ہوئی
اور ترے کوچے سے جب بھاگا ہوا طوفانِ نوح
یوں جھجک کر رک رہے
جیسے آتے آتے منھ تک کوئی چھینک
رک رہی ہے
اور پھر وہ جا ڈر رہیں
منھ اور نتھنے کھول کر

انتظار چھپناک میں
دوش پر اٹھے لئے ہیں گگرڑے گگرڑے رس بھرے
ٹھوکریں دہلیز پر ہر ہر قدم کھاتے ہوئے
تاک میں بیٹھا ہوا ہے فاختہ
سر بسر اینٹھا ہوا بڑا ہوا
ٹھوکریں ہر ہر قدم کھاتے ہوئے
تیرے لٹھے گگرڑے گگرڑے نوجواں
دہلیز پر
چار گگرڑے سے کہار

اسی شعر پر اگر "پیغمبر سخن" جناب ن م راشد اصلاح دیں تو غالباً شعر یوں سے یوں ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ مرزا مرحوم کا شعر پھر دہرائیے ورنہ کہیں آپ سماج کی گہرائیوں میں گم نہ ہو جائیں۔

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

ن م راشد کے خیال میں شعر "بھرپور" اصلاح چاہتا ہے تاکہ پہلے مصرعہ اور دوسرے مصرعہ میں ...... "ہم آہنگی" پیدا ہو سکے۔ غالب مرحوم نے شاید یہ شعر "ایلیٹ" سے متاثر ہو کر کہا تھا مگر پھر بھی "ہنگامی اور اعصابی شاعری کے تلذذ" سے کوسوں دور ہے کیونکہ شعر میں کوئی "ہیجانی کیفیت" نہیں پیدا ہو سکی۔ اسی شعر کو اگر یوں کہا جائے تو شعر میں ترنم اور معنویت دونوں بیک وقت پیدا ہو جائیں۔ اصلاح کے بعد شعر کو یوں پڑھئے۔

واکئے بیٹھے ہیں سب
تیرے کوچہ کی گلی کے موڑ پر
خاک کے وہ نوجواں ذرے جو ہیں
تیری نگاہِ مست پہ مچلے ہوئے
اور کر دیتا تھا میں
صبح پو کے پھٹتے ہی
اپنی جھاڑو کی نوکیلی نوک سے
تاکہ گھر تو بیٹھ کر
مسکراتی اور اٹھلاتی ہوئی
اس حسیں پینسے میں سنپیں کے سوار
چار کے کندھوں پہ میری راہ سے
گذرے اگر
اور نتھنے پھول جائیں، ان کہاروں کے اگر
ہنپنے لگیں جو اس طرح پر تیرے ہلکے بوجھ سے
جیسے اُمیدوں سے ہو اک نازنیں
اور ہولے ہولے جاتی ہو کہیں
اپنے عاشق کی نگاہِ گرم سے چھپتی ہوئی
اور تھک جانے پہ بھی
روکے نہ دم اپنے قدم
واکئے بیٹھے ہیں سب

اگر غالب کے اسی شعر پر کہیں حضرت محمود جالندھری کی اصلاح پڑ جائے
تو شعر میں اچھی خاصی "ندرت اور تازگی" پیدا ہو جائے گی اور شعر کی ہر رگ و پے
میں ایک برقی لہر دوڑ جائے گی اور بنیں اور بنیں والی دونوں کے پرزے چاک
ہو جائیں گے۔ محمود صاحب کے خیال میں غالب کا خیال تو ذرا اچھا ہے مگر دا
قرینہ سے اس کو ادا نہیں کر پائے۔ اگر اسی چیز کو وہ یوں کہتے تو شعر میں "سکھ
رعایت نفسیاتی محسوسات اور جنسی آسودگی" پیدا ہو جاتی اور شعر میں معاملہ بندی
اور شوخی بھرپور نظر آنے لگتی۔ ملاحظہ ہو۔

اس کی بنیں کی چمکتی ہوئی انگیا کے قریب
ایک کھڑکی سی ہے لگی
جس کا روزن ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
اور وہ معصوم چھپائے ہوئے سینہ کا ابھار
جھانکتی جھانکتی ہم سب کا چلی جاتی ہے
حالِ بد۔ حالِ خراب
لیا مری جان تو گذرے گی مرے کوچہ سے
اور میں اپنے ستونِ غمِ ہستی کو لئے
چپکے چپکے ترے آغوش میں در آؤں گا
ان ابھاروں کا لچکتا ہوا ـــــ معصوم سا گوشت
ہٹتے ہوئے پیچھے سے جائے گا نظروں سے مری
اور پھر چار گراں ڈیل جوانوں پہ سوار
تیرے مچلے ہوئے ارمان گذر جائیں گے
ہاں ابھی ہوتی "ٹانگوں" میں لچکتی ہوئی کھال

تجھکو کوچہ میں نہ روکے ہے نہ روکے گی کبھی
اس کی سہنیں کی لچکتی ہوئی انگیا کے قریب

اگر فیض احمد فیض غالب مرحوم کے اس شعر پر اصلاح دیں تو اصلاح تو بالضرور مختصر ہو گی مگر شعر خاصہ ترقی پسند ہو جائے گا۔ اور اس میں موجودہ دور یہ انقلاب کے دوش بدوش چلنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اصلاح ملاحظہ ہو۔

اس کی گھبرائی ہوئی سہنیں میں
انقلابات کا اک لوچ تو ہے
میرے کوچے سے گذر جانے کا
اس میں اک جوش تو ہے
اس کو اس راہ کے آغوش میں در آنے دو۔
اور مرے کوچۂ الفت سے گذر جانے دو۔
میرا جگرا ہوا سوز
اُن کہاروں کی جواں ٹانگوں میں
ایک سیلاب کا دھارا ہے رواں
جو اُسے دوش پہ بٹھلائے ہوئے
میرے کوچے سے لئے جاتا ہے
اس کی گھبرائی ہوئی سہنیں کو

اسی شعر پہ اگر ڈاکٹر تاثیر اصلاح دیں تو زیادہ نہیں فی الحال شعر اتنا بڑا ہو جائے گا۔

دھیمی دھیمی طویل سی سیٹیں
مرے کوچہ میں کوئی کیوں روکے
اور مری برق پاش نظروں سے
کوئی ہر ہر قدم پہ کیوں ٹوکے
کوچۂ سوز و ساز سے میرے
اس کو جلدی کہاں لے جائیں
ورنہ ڈر ہے کہیں مرے جذبات
ایٹ کر ستیہ گرہ نہ کریں
اور پھر لاٹھی چارج ہو جائے
اور مجروح ہو کے دل میرا
اپنے مدھم سروں میں گانے لگے
دھیمی دھیمی طویل سی سیٹیں
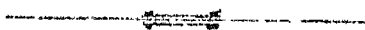
نظمیں

دو لفظ

از مسٹر حبیب احمد قدوائی ایم اے

دفتر کی گھٹی ہوئی ساکن فضا میں بربط سخن چھیڑنا، ایک نئی حرکتی زندگی کا آغاز ہے۔ گو چند سُرخ فیتہ گلے کا ہار ہے، مگر فرقتؔ آزاد شاعری کی فضائے بسیط میں محو پرواز ہو کر نو خیز ترقی پسند شاعروں سے دبیمے سُروں میں کچھ کہہ رہا ہے مسرت نہیں حیرت ہے۔ حیرت نہیں مسرت ہے۔

مداوا اسم بامسمیٰ ہے۔ وہ نہ صرف آزاد نظم کی سنگلاخ ناہمواری پر ایک دلنواز تبسم ہے بلکہ جدید ادبی مادۂ فاسد کے حق میں علاج بالمثل کا بے مثل ادبی مثیل۔

مداوا کا آغاز فرقتؔ کی سوچ بچار کی ہوئی سنجیدہ شاعری سے ہوتا ہے جس میں زندگی کے خس و خاشاک سے صرف باعتنی مگر تلخ حقیقتوں کو چن چن کر پیش کیا گیا ہے اسکی پشت پر وہی ذہنی وابستگی اور نفسیاتی ابتہاجیت ہے ایک نئے تال سر کا احساس جاری و ساری ہے شورش تازہ کی سرمستیاں، جدت تخیل میں تحلیل ہو کر تیز و تند ہو گئی ہیں۔ بنا بریں ان کیفیتوں اور منظروں کی تیز رنگ مصوری ملتی ہے جن سے نفاست پسند شاعری آنکھ چراتی ہے۔ نظمیں نئی روایات کی حامل ہیں۔ موجودہ بھیڑ بھاڑ عجلت و انتشار کے زمانہ میں آراستہ پیراستہ حسن بیان اور سنوری ہوئی زبان کے چٹخارے کی کسی کو فرصت کہاں چنانچہ ان نظموں میں فطری واقعاتی سادہ زبان کے ساتھ ان میں بے باکانہ طرز اظہار، قدیم روایتی علامات سے گریز اور مروجہ فن عروض سے دیدہ و دانستہ اعراض جسکے لئے راشد اور میرا جی ہنگامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

الفاظ کے خون ناحق سے کوئی نظم رنگین نہیں بلکہ اسکے برخلاف لطیف تصوریت اور تخیلیت کی جلوہ ریزیاں قدم قدم پر آشکارا ہیں حقیقت کی شعاعوں میں حسین و جمیل رومانی نقوش اور زیادہ اجاگر ہو گئے ہیں فلسفی تاثرات و مشاہدات کی ذکی الحسی عکاسی پیچیدہ زندگی کے پیچیدہ تر مسائل کے حل کیلئے ایک حد تک ناگزیر ہے فرقتؔ نے بہت ہی تیز دھڑکا دینے والی باتیں کہی ہیں اور اسی لئے ابہام اور اشاریت سے برائے نام سروکار رکھا ہے دفتری مصروفیت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی سیر حاصل فنی تجزیہ کیا جائے بہر حال وہ نظمیں نظم معریٰ کی پہنائیوں، گہرائیوں، پستیوں اور بلندیوں کی آئینہ دار ہیں۔

آزاد نظم نیا شعری تجربہ ہے زندہ دلان پنجاب اس خود کاشتہ پودہ (آزاد نظم) کو چمن نظم میں نصب کرنیکے درپے ہیں لیکن کیا واقعی اس پودے میں اتنی جان اور سکت ہے کہ آزاد رہ کر بھی برگ و بار پیدا کر سکے اس سوال کا شافی و کافی جواب ان حضرات کے قلم سے ملیگا جنکی نگاہ سخن شناس کبھی خطا نہیں کرتی۔

ان دو لفظوں کیساتھ مداوا کے سخن پیش کرنیکی جرأت کی جا رہی ہے۔ اگر ادبی مادۂ فاسد تحلیل ہو جائے تو سمجھا جائے گا کہ لمحات فرصت ضائع نہیں ہوئے۔

سادہ سوال

(از ادبِ لطیف لاہور)

ایک ——— ؟
بے کار
حقیر اور بیچارا
تنہا
وجہ پریشانیٔ خود!

ایک اور اک ——— ؟
دو
جمع کا ایک سادہ سوال
رونقِ بزمِ ہستی!

ایک ضرب ایک ——— ؟
دو اور اک ——— تین
کبھی چار
کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں
اور کبھی اس سے بھی زائد
لیکن
پھر جو بٹتے ہیں:
تو ہیں پانچ کے چار
اور کبھی تین کے دو
اور پھر اک
ایک اور اک دو کا وہی سادہ سوال
باعثِ ہنگامۂ دہر

ایک ضرب ایک ——— ؟
ہزاروں
لاکھوں
لاکھوں — کروڑوں — اربوں
ہر کوئی ایک ہے لاکھوں پہ گراں
اور کئی لاکھ؟
حقیر اور ناچیز
تیری عظمت کے ستون!

تو ہے ان سب سے الگ
اور علیحدہ
یکتا
میں ہوں بے دل
مایوس
ایک
بیچارا
تنہا

تجھ کو آجائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال
تیری دنیا بھی حسین ہو جائے۔

عبدالمجید بھٹی

ٹیڑھا سوال

ایک
ایک۔ دو
ایک۔ دو۔ تین
ایک۔ دو۔ تین۔ چار
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس
ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ گیارہ۔ بارہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ بارہ۔ تیرہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ بارہ۔ تیرہ۔ چودہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ تیرہ۔ چودہ۔ پندرہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ پندرہ۔ سولہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ سولہ۔ سترہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ سترہ۔ اٹھارہ
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ اٹھارہ۔ انیس
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ انیس۔ بیس
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ بیس۔ اکیس
ایک۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ " ۔ اکیس۔ بائیس
ایک

ہ

چالیس کروڑ

ایسے شاعر کا مطلب یہ ہو کہ ایک بچہ پیدا ہوا۔ دوسرے مطلب یہ کہ اسکی شادی
کر دی گئی اور ایک سے دو ہو گئے۔ تیسرے مصرعہ میں اس بچہ کے یہاں بچہ پیدا ہوتے
دکھایا گیا ہے اور اب وہ ایک دو تین ہو گئے، اس کے بعد چوتھے مصرعہ سے
بائیسویں مصرعہ تک ہر سال ایک بچہ کا اضافہ ہوتا گیا اور بچوں کی تعداد بیس تک ہو نچ گئی
ہندوستانی عورت ایک یا ایک سے زیادہ تندرست مرد سے زیادہ سے زیادہ بیس بچے
پیدا کرنے کا دم رکھتی ہے اور اس کے بعد جب اس کی قوت جواب دیتی ہے تو
اس کی اولادیں ایک سے شروع کرتی ہیں اسی لئے نظم کے آخر میں پہلے مصرعہ کو
پھر سے دہرایا گیا ہے آخر میں چالیس کردار اسی پیداوار کا نتیجہ ہیں یہ ہے ایک
"ترقی پسند" شاعر کی تخئیل کی بلند پروازی جو آج تک کسی بڑے سے بڑے شاعر کو
نصیب نہ ہو سکی میرے خیال میں جب "ترقی پسند شاعر" اور زیادہ سماج کی گہرائیوں
میں پہونچے گا تو اُسے اسی قسم کی فلسفیانہ چیزیں ملیں گی اور اس کی شاعری مذکورہ بالا
قسم کا نمونہ بن کر رہ جائے گی۔

“

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!

R

۱۹۴۳

ڈاکٹر تاثیر

پنجاب کے ترقی پسند شعراء میں ڈاکٹر تاثیر بھی آپ اپنی نظیر ہیں فیض احمد فیض کی طرح آپ بھی ایک اچھے خوشگو شاعر ہیں۔ شاعری کے عام اصولوں کے پابند ہو کر آپ جب کوئی شعر کہتے ہیں تو بہت بلند ہوتا ہے مگر جب آزاد شاعری کرنے لگتے ہیں تو پڑھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ ڈاکٹر تاثیر ہی ہیں یا کوئی دوسرا بہرحال ان کے آزاد شاعر ہونے کی وجہ ہماری سمجھ میں سوائے اس کے اور کوئی نہیں آتی کہ انھوں نے سگمنڈ فرائیڈ کو بہت پڑھا ہے اور اس کے فلسفہ سے نہیں بلکہ اس کے طریقہ علاج سے بیحد متاثر ہو کر اور محض تکان دور کرنے کے لئے کبھی کبھی وہ آزاد شاعری کر لیتے ہیں اور اس شاعری کو وہ شاعری کی غرض سے نہیں بلکہ بطور علاج کرتے ہیں۔ اسی لئے رسائل میں ان کا اس قسم کا کلام بہت کم نظر آتا ہے اور شاید اسی وجہ سے ابھی تک آپ کا آزاد شاعری کا کوئی دیوان مرتب نہ ہو سکا ورنہ اگر میرا جی اور ن۔ م راشد کی طرح آپ بھی خالص آزاد شاعر ہوتے تو نہ جانے آج آپ کے کتنے دیوان مرتب ہو چکے ہوتے۔ چونکہ سگمنڈ فرائیڈ کا ذکر آ گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فلسفہ پر مختصراً روشنی ڈالی جائے تاکہ آپ کو آزاد شاعروں کے خیالات کا صحیح مخرج اور منبع معلوم ہو جائے جس کو میرا جی اور ن۔ م راشد نے اپنی شاعری کا مقصد بنا رکھا ہے اور جس کے سبب سے اُن کے دیوان کے دیوان مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

" سگمنڈ فرائیڈ ۱۸۵۶ء میں آسٹریا کے دارالسلطنت " ویانا " میں پیدا ہوا۔

اس کے والدین یہودی تھے ڈاکٹری پڑھنے کے بعد ۱۸۸۵ء میں ڈاکٹر شاکیر کی
شہرت سن کر وہ پیرس چلا گیا یہاں ڈاکٹر شاکیر نومیت کے ذریعہ ہسٹیریا اور اعصابی
امراض کا علاج کرتے تھے وہ ڈاکٹر شاکیر کا شاگرد ہو گیا اور ان ہی
سے نومیت کی بخوبی تعلیم حاصل کی پھر ایک نیا طریقۂ علاج تخلیق کیا اس طریقۂ علاج
کو تجزیۂ نفس یا باتونی علاج بھی کہتے ہیں اس میں مریض سے کہا جاتا ہے کہ وہ
اپنے کثیف سے کثیف اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں
انھیں بے کم و کاست زبان سے ادا کرے اس طرح پر مریض جب اپنے اچھے
بُرے خیالات کا اظہار کرتا ہے "تو بقول فرائیڈ اس کے دل کی بھڑاس نکل جاتی
ہے اور محبوس ..... جذبات جو مرض کا اصل سبب ہوتے ہیں وہ دل سے نکل جاتے
ہیں اور مریض کو صحت ہونے لگتی ہے۔ اس کو آپ باتونی علاج کیا بلکہ ایک قسم کا
دماغی جلاب کہہ سکتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ انسان کی بہت سی خواہشات ایسی ہوتی
ہیں جن کو انسان سوسائٹی کے آداب و اخلاق کے پیش نظر ظاہر نہیں کرپاتا اور
اور اُن کو دل ہی دل میں لئے گھٹا کرتا ہے فرائیڈ کے فلسفہ کی رو سے یہ خواہشات
نفس نیم شعوری میں دب جاتی ہیں اور اظہار کی راہ ڈھونڈا کرتی ہیں" لہذا
آج کل کے مغرب پرست حضرات اور بالخصوص یونیورسٹی کے نوجوان طلباء جو مشرقی
تہذیب و آداب سے نابلد ہوتے ہیں عربی، فارسی یا انگریزی میں ایم، اے
کر لینے کے معنے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ جملہ علوم و فنون کے ماہر ہو گئے یورپین
سوسائٹی کو معیار تہذیب قرار دیتے ہیں اور مشرقی آداب و تہذیب اُن کے
نزدیک رجعت پسندانہ چیزیں ہو کر رہ جاتی ہیں مغرب کی عریانی اور بیحیائی سے
متاثر ہو کر اُن کو ادنیٰ سے ادنیٰ جذبات کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی
وہ اپنے اس قسم کے خیالات کو بلا کسی تکلف و ہر بہانے کے ظاہر کرنا سوسائٹی کے لوازمات

میں داخل سمجھتے ہیں اس لئے زیادہ تر اسی طبقہ کے لوگ آزاد شاعر ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے مہمل اور بے ربط خیالات پر عنوانات قائم کرکے جب وہ رسائل میں بھیجتے ہیں اور اپنے ناموں کے ساتھ ڈاکٹریٹ ایم اے اور بی اے کی ڈگری لکھدیتے ہیں تو بعض سادہ لوح اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹران کی ڈگریوں سے مرعوب ہو کر اُن کے کلام کو نمایاں طور پر شائع کر دیتے ہیں اس طرح ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب اور شاعر ہو گئے خواہ دوسرے وقت خود اپنے لکھے ہوئے کے معنے بتانے سے قاصر رہیں۔ اس قسم کے بے ربط فقروں اور جملوں کو ادا کرنے میں چونکہ دماغ پر کوئی زور دینے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے معمولی معمولی استعداد والوں نے بھی اسی قسم کی شاعری شروع کر دی ہے۔ انگریزی ادب سے خواہ وہ اچھی طرح واقف ہوں یا نہ ہوں مگر اس قسم کے بے معنی فقرے لکھکر وہ ان پر چند مخصوص عنوانات میں سے کوئی عنوان قائم کر دیتے ہیں اور نیچے فٹ نوٹ میں لکھدیتے ہیں کہ فلاں مغربی فلاسفر یا شاعر سے متاثر ہو کر نظم کہی گئی ہے پھر ان مہملات پر تنقید کرنے والے بھی چونکہ اسی گروہ کے نوجوان ترقی پسند شاعر ہوتے ہیں اس لئے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے اصول پر عملدرآمد شروع ہو جاتا ہے بعض رسائل پر چونکہ ان لوگوں نے بڑی طرح قبضہ جما رکھا ہے اس لئے ان میں یہ لوگ بڑے بڑے قصیدے اپنے ساتھی شعراء کی شان میں چھپوایا کرتے ہیں۔ رہا اس قسم کے اشعار میں معنے پہنانے کا سوال سو وہ کوئی بڑی بات نہیں اس میں بھی وہ فرائیڈ کے فلسفۂ خواب سے مدد لیکر ان اشعار کے معنے نہیں بلکہ ان کی تعبیریں بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ بے ربط فقرے معنے اور مطلب کے محتاج نہیں ہوتے۔ فرائیڈ نے ایک کتاب خواب کی تعبیر پر سنہ ۱۹۰۱ء میں لکھی ہے جس میں اُس نے ایک ہزار خوابوں کی کامیاب

تعبیریں لکھدی ہیں "چنانچہ خواب میں مختلف چیزوں کے معنے وہ چند اشارات سے
ذریعہ متعین کرتا ہے مثلاً خواب میں مکان، انسان کا جسم، والدین، بچے، بھائی بہن
ہر ایک کو عریاں صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ لوگوں نے خواب میں مکان کے سامنے
والے حصے پر چڑھتے اور اترتے ہوئے دیکھا اور اس کے ساتھ مسرت اور قوت
کے احساسات بھی پیدا ہوتے ہیں جب دیواریں ہموار ہوں تو گھر سے مطلب
آدمی ہوتا ہے جب اس میں روشندان یا سوراخ ہوں جو گرفت میں آسکیں تو
اس کا مطلب عورت سے ہوتا ہے والدین خواب میں شہنشاہ، ملکہ۔ بادشاہ،
شہزادی، یا اور کسی عالی مرتبہ ہستی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بھائی اور
بہن چھوٹے حیوانات اور کیڑے مکوڑوں کی صورت میں پیش ہوتے ہیں،
پانی ہمیشہ پیدائش کو ظاہر کرتا ہے۔ سفر خواب میں موت کی طرف اشارہ ہوتا ہے
خواب میں کمرہ، عورت کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً فرائیڈ نے ایک خواب کی دلچسپ
تعبیر جو بیان کی وہ ترقی پسند شعراء کے اشعار کے معنوں سے کم دلچسپ نہیں
"ایک شخص جو بورڈنگ میں رہتا تھا اس نے خواب دیکھا کہ وہ کسی ملازمہ سے
ملتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تمہارا نمبر کیا ہے؟ اس ملازمہ نے جواب دیا کہ نمبر ۱۴
اب اس کی تعبیر یوں ہوئی حقیقت میں اس شخص کے ملازمہ سے ناجائز تعلقات
تھے اور کئی مرتبہ وہ اسے اپنی خوابگاہ میں لایا تھا۔ ملازمہ کو ہر وقت خدشہ
رہتا کہ کہیں اس کی مالکہ نہ دیکھ پائے۔ اس لئے خواب سے ایک روز قبل اس نے
مشورہ دیا تھا کہ انھیں اور کسی خالی کمرہ میں ملنا چاہئے جس کمرہ کی طرف
اس کا اشارہ تھا اس کا نمبر ۱۴ تھا۔ اس طرح کمرہ عورت کو ظاہر کرتا ہے"
"ترقی پسند شعراء بھی اپنے اشاروں کے معنے نکالنے میں اشاریت سے مدد
لیتے ہیں جو خصوصاً جنسیاتی خواہشات کو ظاہر کرتی ہے۔ بہر نوع ڈاکٹر تاثیر

جو یقیناً ایک خوشگو شاعر ہیں محض اختلاجی کیفیات دور کرنے کے لئے جب شاعری کرتے ہوں گے تو وہ اُن کی آزاد شاعری ہوتی ہو گی جس کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں

یہ حسرت تھی کہ دنیا میں کوئی محبوب مل جاتا
خدا کی قسم گر ملتا تو میں زہر کا پھکا لیتا

صبا پُلاوی

دو راہے!

(از ڈاکٹر تاثیر)

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان۔ الٰہی توبہ
نہ مروّت، نہ تکلّف، نہ تبسّم نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش
بے ارادہ ہے تو کیا۔ غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقاماً نہ تحکم کی، خود
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی، یونہی سہی
اک شائبۂ دادِ شجاعت بھی تو ہے
______ (جھانک تو کرتا ہوں میں اپنا گریباں ہی سہی؟)
بلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے پھن پھیلائے!
لوگ؟ وہ لوگ ..... کالانعام نہیں
جن کو ٹھکرائے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ بڑے صاحب لوگ!
یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکام نہیں

جو یہاں ہیں سے ہیں پر ہم یہیں نہیں
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
بے وفا ہوں تو ہوں بدنام نہیں
("تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا")
اپنی دنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگ گراں حائل ہے
کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے
دوسرے درجے کے دروازہ میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد، فرنگی گورا
بانہیں پھیلائے ہوئے راستہ روکے ہے کھڑا
("کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق")
سیٹیاں بجنے لگیں خدمت سرکار بجالانا ہے
اور سرکار ہی خود سنگ رہ منزل ہے
زندگی آگہی دورا ہے پہ
دیر کیوں کرتے ہو بھاگو بھاگو
دوڑ کر تھرڈ کے ڈبے میں گھسو
اپنے ہمجنس غلاموں میں ملو
زندگی آگہی دورا ہے پہ

رس بھرے ہونٹ

(از ڈاکٹر تاثیر)

رس بھرے ہونٹ
پھول سے ہلکے
جیسے بلور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفق صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں
یوں گرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
پاؤں چھلنی نگاہ متزلزل؟
وقت اک صحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگِ منزل نما نہ آج نہ کل
دفعتاً دور، دور، آنکھ سے دور
شفق شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک اٹھے
ایک دھوکا، سراب، شمعِ نور
رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیر
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
یوں ترستے ہیں یوں لرزتے ہیں

چوراہے

(ڈاکٹر تاثیر کی نظم "دوراہے" سے متاثر ہو کر)

ایک بھونچال ہے یلغار خدا خیر کرے
جو مروّت سے تکلف سے تبسم سے بری
نشیلے ارادہ ہیں تو کیا غیر شعوری ہیں تو کیا
ایک آواز کا سینہ کی حرارت میں نمود!
خانہ جنگی کا ظہور
اس میں اک شائبہ عقل و فراست بھی تو ہے
یوں نہیں یونہی سہی
جسم میں جوش ریاضت بھی تو ہے
ذرات بھر لیلی پڑی رہتی ہے یوں"
کلبلاتی ہوئی جب جاتی ہے افعی کی طرح
سینہ تانے ہوئے اور آنکھ سے برمائے ہوئے
خوب پھنکارتی پھن پھیلائے
لوگ ہ وہ لڑکی لوگ!... جو مجھے دیکھ کے ہنس دیتی ہے
جن کو ٹھکراتے ہوئے جاتے ہیں۔
یہی ٹامی۔ جو لیے پھرتے ہیں بازاروں میں
لڑکیاں .... غازہ ملے اور ہنسی سے بے کل
باچھیں اس طرح کہ باچھوں چری "مینا کا گماں
یا سیس تھیں کبھی" اب ہو گئیں وہ میمیں

یہ ہے محکومی کا عالم اے عبرت اسے نہ دیکھ؟
وہ ہیں آقاؤں کی آقا مگر اک خاص گھڑی
جبکہ طاری ہوں محبت کے نشہ میں مدہوش
("اٹھیے اب دونوں وقت ملتے ہیں")
پھانس کا بانس بنا ڈالیں گے
ہر "دیکھیے کام" کا دروازہ کشادہ ہے دلہن
کوئی تخصیص نہیں آگ ہیں اور پانی ہیں
("ڈر کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے")

پشت کے دروازے سے
ایک شخص ہاتھ میں ڈنڈا لیے ہے سر پہ سوار
ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے اور راہ روکے ہے کھڑا
("اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے")
بیٹیاں بکتی ہیں، بڑھتے آتے ہیں مانگنے والے
ان کے بنگلوں سے انھیں لیکے چلے حضرت گنج
دوست شوہر کو دکھاتے ہوئے دریا کی طرف
چل دیا تانگہ لئے [illegible]

اور پھر .... !
لیجیے آ گئی پہلی منزل
لڑکھڑاتی ہوئی تانگے سے وہ آخر اتریں
ایک بھونچال ہے بلغار خدا خیر کرے

دو مُوٹھا!

ایک لاری پہ ہے طوفان الٰہی تو یہ
ایک پہ ایک لدا
کچھ تو ہیں منحنی اور کچھ کا ہے یہ ڈھب تن و توش
کوئی پس جائے تو کیا کوئی کچل جائے تو کیا
جنگ کے دور میں پٹرول نہ ہونے کا ظہور
اس کا گلہ ہے بے سود! ——
پیسہ مل جائے وہ بھنگی ہی سہی
اس میں اک شان رعونت بھی تو ہے
دھیمی دھیمی ہی
رینگ کر چلنے میں لاری کی شجاعت بھی تو ہے
("اس مصیبت میں نکل جائے اگر جان ہی سہی")
کچکچاتے ہوئے انسانوں کے اس جتھے میں
آم ہیں ساتھ کسی کے جو سڑے جاتے ہیں
پوری لاری کو یہ بدبو سے ہیں سنڈاس بنائے
آم. وہ آم...... جو سڑ جانے پہ اب آم نہیں
یہ آم —— سڑے گلے آم
ان گلے آموں کو اب جن کے کوئی دام نہیں
ان سڑے آموں کا گنج میں مقام اعلیٰ ہے

ہاتھ سے ایک جگہ رکھے تو ہیں
پیر گلے ہوں تو ہوں بے دام تو ہیں
"دھیا مجھکو کبھی اتنا بھی تو دوبھر نہ ہوا تھا"
چھوٹی لاری کو بُری طرح پہ لادا ہے مگر
موت کی سمت ہر اک پہیہ رواں مائل ہے
اور یوں فٹ ہے ہر اک شخص جگہ پہ اپنی
کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے
اور مسافروں کے اُدھر ایک بڑے حصے میں
دوسرے درجے کے مرد واسطے میں
چند لٹھ باز دیہاتیوں میں واویلا ہے
ایک پہ ایک لدا سانس کو روکے بیٹھا
"دم گھٹا جاتا ہے سینہ بھی ہوا جاتا ہے شق"
عورتیں لدنے لگیں حکم ڈرائیور کا بجا لاتا ہے
ساتھ میں لائی ہیں شے تو بچی ہے کمبل
آگئی آگئی دو موٹر پہ نظر
"او اُڑا ڈالے گی جان ہماری"
موت کے واسطے ہر سانس پہ تیار رہو
سب دیہاتیوں کے ہمراہ مرد
آگئی آگئی دو موٹر پہ نظر

ستارے

لیٹے لیٹے تری الفت میں جگر لیٹ گیا
اور پھر اٹھ نہ سکا
پیر میں چوٹ لگی آنکھ میں آنسو بھر آئے
جسم جب ہو گیا ٹھنڈا ناسور
سرد آہوں نے دھواں بن کے لگا دی اک آگ
برق رفتار پہاڑوں سے ہرن اڑ نکلے
چلتے چلتے کہیں رک جائے نہ اڑیل ٹٹو
اور اک دم سے نہ پھر ٹوٹ پڑیں
اس کے کوچے کے تنکا ری کتے
جو مری تاک میں ڈیوڑھی میں چھپے بیٹھے ہیں
اور جو میں دیکھتا ہوں، آڑ سے کھڑکی سے اسے
گو تج لیتے ہیں مری نظروں کو
اور میں خوف سے خستہ اور چور
اس طرح بھاگتا رہتا ہوں ترے سایہ سے
جیسے کتوں سے سیار
ریزگاری مجھے مل جائے تو لے کر کوئی چیز
اس کے کوچے میں کھلا کر ان کو
پہلے تو رام کروں

بعد کو رات کے سناٹے میں
چھپ رہوں اُس کے کنواڑوں کی بغل میں جاکر
اور جب رات میں دروازے کو وہ بند کرے
اُس کے قدموں پہ میں اس طرح گروں
جیسے ہانڈی سے اُبال
اور بصد چشم لجاجت سے کہوں
لیٹے لیٹے تری اُلفت میں جگر لیٹ گیا!!

لخت جگر ۔ نور نظر ۔ فرزند ارجمند ، دلبند میر
لخت جگر ۔ نور نظر ۔ فرزانہ ۔ سعید خان

رُخسار!!

(ڈاکٹر تاثیر کی نظم "رس بھرے ہونٹ" سے متاثر ہو کر)

تیرے غازہ ملے ہوئے رخسار
گرگرتا کے پر سے بھی ہلکے
جیسے تسلے میں تاچینی سے
نورِ ناقص نفیس سا چھلکے
جیسے گرگٹ کی گول آنکھوں میں
خاک کا ایک نوجوان ذرّہ
شفقِ صبح وہ "سماسٹر ناک"
جیسے پتلے پیاز کے چھلکے
تیرے رخسار یوں پھڑکتے ہیں
یوں پھڑکتے ہیں یوں اُچکتے ہیں
بند تھیلے میں جیسے ایک بٹیر
کھال میں جھرّیاں نگاہ پہ بل
ایک پیلا سا بیکراں نالہ
گندگی کا نہ حس کی، کوئی بدل
ٹیک بیک . پاس . پاس - آنکھ کے پاس
صبحِ صادق کی کچھ سیاہی میں
ایک سوئی گلی سے بگڑ پڑا
اُن نگاہوں سے ہو گئی مڈبھیڑ

رات بھر ہم لحاف کے اندر
یوں پھڑکتے ہیں یوں اُچکتے ہیں
بند تھیلے میں جیسے ایک بٹیر

عشق

گھاس کی نیند پیڑ کی الجھن
دورِ بادِ صبا بھی کر نہ سکی
سخت گرمی سے ہوش سُلفا ہیں
سخت سردی سے دل ہے آئس کریم
اور دنیا کی بے ثباتی پہ
اس طرح میں جھکائے ہوں گردن
جس طرح جھیل پر کوئی بگلا
کسی مچھلی کی تاک میں گم سُم
سیج آسا تری نگاہوں پہ
فیل آسا جوانیاں صدقے
اُف گرہ باز چشمِ مست تری
اس طرح میرے دل کو لے بھاگی
جیسے بامھن کا بیل جھنّو سے
ایک ہنڈا اٹھا کے لے بھاگے

محبت!

میری پتلی سیاہ سی بانہیں
یوں حمائل ہیں تیری گردن میں
سانپ جیسے کسی فرنگن کی
ٹانگ میں دوڑ کر لپٹ جائے
میٹھی میٹھی سی مسکراہٹ پہ
تو مری اس طرح پہ ہو نالاں
جیسے کوئی کوئین کو پیکر
منہ ہزاروں طرح سے اپنا بنائے
گوری گوری سفید سی سکھیں
تیری زلفوں میں یوں چمکتی ہیں
جیسے افشاں کسی کے بالوں میں
تیرے گھنگھرو سے رس بھری آواز
اس طرح یہ فضا میں رستی ہے
جیسے جیپ کا شیشہ ٹوٹ جانے پہ
ننھی آموں کا رس ٹپک جائے
تیرے ہجر و فراق میں ہر دم
اس طرح میں اداس رہتا ہوں
جیسے بچے یتیم خانے میں
غم سے چپ چاپ اداس رہتے ہیں

چندا

جب مچلنے لگیں مرے جذبات
تجھ کو تنہائی میں کہیں پاکر
کاش تو مدبھری نگاہوں سے
میری گردن میں ہاتھ یوں ڈالے
جیسے مست اک کبوتری اُتر کی
چونچ میں چونچ ڈال دیتی ہو
تیری نظروں کے کارخانے میں
اس طرح فتنے ڈھلتے رہتے ہیں
جیسے امریکی کارخانوں میں
جنگی ہتھیار بنتے رہتے ہیں
تیری ساری کی گوٹ میں کب سے
ایک کھٹمل اداس بیٹھا ہے
جیسے بوٹی کی فکر میں کتا
کسی ٹکڑے کے پاس بیٹھا ہے

خمار

ساٹھ پل
ایک سکنڈ۔ ساٹھ سکنڈ
ایک منٹ
اور پھر ساٹھ منٹ کا تو ہوا اک گھنٹہ
ایک
دو تین بجے
چار بجے
پانچ بجے
چھ سے سات اور اگر سات سے آٹھ ہو جائیں
ہاں مگر تو یہ جو پہونچا تو نکال ہی دیں گے
دس بجے سوئے تو پھر گیارہ و بارہ کے قریب
وہ نہ اٹھیں گے نہ اٹھیں گے نہ اٹھیں گے کبھی
ایک سے قبل تہاں خانہ سے
گھنٹوں گھنٹوں میں یونہی عمر گذر جائے گی

کتنی جلدی یہ گزر جاتے ہیں دن
آہ یہ دن
آئیے ان کو ذرا جوڑ تو لیں
ہاں تو منگل سے چلیں
جیسے منگل سے ہو بدھ

بدھ ہے جمعرات و جمعہ
ختم ہو جائے سنیچر تو پھر اتوار آئے
اب یہ دوشنبہ کو کیوں چھوڑ دوں یک و تنہا
لیجئے لیجئے پھر آ گیا بڑھوا منگل
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڈھوا منگل
اور مری عمر کا ایک ہفتہ ہوا ختم آخر

ہاں اسی طرح مہینے بھی گزر جائیں گے
آئے گا پہلے نومبر
تو دسمبر ہی کے بعد
جنوری، فروری اور مارچ بھی آ جائیں گے
پھر تو اپریل کے بعد آئیں گے مئی، جون و جولائی
ہے اگست، اور ستمبر کے قریب اکتوبر
لیجئے آنکھ جھپکتے میں ہوا سال تمام

آپ کے جسم کی ساخت اور غذا و افکار
دیکھ کر اُن کو نتیجہ یہ نکل آتا ہے
آپ کی عمر بہت تھوڑی ہے
حد سے حد آپ کو رہنا ہے یہاں ساٹھ برس
آئیے جوڑ کے دس دس کو بڑھیں ساٹھ کی سمت
سنئے اور غور سے سنئے یہ ہنسی کھیل نہیں
ایک سے دس ہوئے

اور دس میں ملا کر دس بیس
بیس سے تیس ہوئے
تیس سے چالیس و پچاس
لیجئے ساٹھ کی منزل آئی
چھوڑئیے عمر کی للّٰہ مسافر گاڑی
آ گیا آپ کا وہ اسٹیشن
جس جگہ تک کا ٹکٹ آپ نے لے رکھا تھا
دوست و احباب ملازم بھی کوئی ساتھ نہ تھا
آپ اسباب نہ لائے تھے نہ لیجائیں گے
ہاں تو بس چلئے ذرا
راستہ ایک زمین دوز مکان تک ہے گیا
نام ہے اس کا لحد

ہاں تو یہ عرض ہے کرنا مجھکو
دفن ہی مجھکو خدا کے لئے جلد کر دو
پر ہے کپڑے کا سوال
کیسا کپڑا ہے گراں
نین سکھ آہ نہ لینا یہی گاڑھا لینا
ورنہ بہتر تو ہے معیاری ہی کپڑا لے لو
جس کو سرکار نے ہے چالو کیا
اور بازار میں ہے آ بھی گیا
میرے کفنانے کو دفنانے کو

ہاں مگر سب سے کٹھن چیز رہی جاتی ہے
ریزہ گاری کا سوال
کیسا بیہودہ سا ہے یہ سوال
روپیہ تم کو تڑانے میں اگر زحمت ہو
پھر تو رہنے دو کفن
گود میں مجھ کو یونہی تم رکھ دو
بس اسی طرح سے جس طرح یہ آیا تھا یہاں

پر مجھے گود میں تم ہاتھ سے اپنے رکھنا
میری میت کو مری آہ بھری میت کو
اور اس جسم کو جو گھل کے محبت میں تری
بن گیا ہے محض ہڈی کی لڑی
تاکہ پھر میرے بعد
بے وفائی کا نہ الزام آئے
اور اگر لوگ کہیں بھی تو زمانہ کو کہیں
اور آ آ کے لحد پر میری
گائیں اور گا کے یہی شعر پڑھیں
سو گئی عمر مری موت کی کروٹ لے کر
اور جو رہ گئے والے سے جگایا نہ گیا
اور پھر خوب ہنسیں
"سائٹھ پل ایک سکنڈ، ایک سکنڈ ساٹھ منٹ"

ڈیوڑھی کے آگے

ایک یلغار ہے فتنوں پہ سوار
ایک آزار ہے سینہ کا اُبھار
ایک میلا ہے کہ لگتا ہی چلا جاتا ہے
ایک ریلا ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
اس میں راحت نہ سہی جوش عقیدت ہی سہی
دیکھتا دیکھتا کلیا سے نکل جائے گا

فائدہ ہو کہ نہ ہو
کچکچاتے ہوئے کس طرح نکل بھاگے ہیں
ٹڈیاں جیسے پہاڑوں سے نکل بھاگتی ہیں
اس طرح مشق ہو نظروں کی مرے چہرہ پہ
جس طرح دھار کسی بچے کی
کھول دینے پہ پڑے سنگ گراں پر پیہم
نل کے نیچے جسے لا رکھا ہو
گنگا جمنی ترے رخساروں پہ
کرتے رہتے ہیں نظر سے صیقل
سیکڑوں پیر و جواں
سامنے آ آ کے مری ڈیوڑھی پہ
اس بری طرح جبینوں کو رگڑتے ہیں یہاں

جیسے بادام کوئی کر کوئی سل پر رگڑے
اور اس طرح محبت میں وہ سر دھنتے ہیں
جیسے چاندی کے ورق کوٹ رہا ہو کوئی
چڑیا تو ہیں میں ہی جاں
اک انار اور وہاں صد بیمار
اُن میں تقسیم مری کیسے ہو
میں تو مٹ جاؤں گی
پس جاؤں گی
گھس جاؤں گی
اتنے عشاق ہیں اک جانِ حزیں
تندی سے بے عقل نہیں
ان نگوڑوں کو یونہی مرنے دو
آستانے پہ پڑا سڑنے دو
خود چلے جائیں گے جب دھوپ کی تیزی ہوگی
چیل چھوڑے گی جب انڈا تو پگھل جائے گی
ان کے ارمانوں کی یہ کھی جو چھپی ہے دل میں
ایک یلغار ہے نقشوں پہ سوار

نوٹ: مجموعہ جالندھری کے رنگ میں جو طنزیہ نظمیں ہیں ان میں سے بعض میں آپکو اوپر نیچے کے مصرعوں میں تضاد ملے گا مثلاً "بیتے زمانہ کی یاد" میں شلوار کے ساتھ ساری کا ذکر آ گیا مگر ایسا عمداً کیا گیا ہے ورنہ ساری کی جگہ دوپٹہ آسانی سے آ سکتا تھا [illegible] نظم ہو سکتا تھا مگر [illegible] صاحب کی نظم "تضاد" میں کوٹ پتلون اور سوٹ کے ساتھ [illegible] اور مثال وغیرہ کا بھی ذکر ہے چنانچہ اسی رعایت سے یہاں شلوار کے ساتھ ساری کا ذکر کیا گیا ہے۔

ترنّم

کھوئی کھوئی سی فضا میں فٹ فٹ
ہو نہ ہو یہ ہے بٹیر
کتنی اونچے پہ ہے سرگرم ستیز
نہیں معلوم کہاں جاتی ہے
اب چڑیا پکڑ ہی لیں گے

کاؤں کاؤں کی پھر آوازِ حزیں آتی ہے
یہ ہے کوے کی صدا
کل مری بچی سے یہ چھین کے بسکٹ دن میں
کیسی پھرتی سے نکل بھاگا تھا

ٹن ٹنا ٹن ٹن ٹنن
یہ ہے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی
ریڈیو والوں کا ٹیلیفون ہے
چاہتے ہیں جو کوئی آزاد نظم
اور کھٹکھٹاتے ہیں مجھے
تاکہ میں اک بے تکی سی نظم فوراً جھاڑ دوں
اور اسے جب ریڈیو جا کر پڑھوں

چیخ اٹھیں سب کے سب رجعت پسند
ریڈیو میں آہ یہ بھونچال کیسے آگیا
اور جب آخر میں ہوا اعلان میرے نام کا
تب وہ سمجھیں پڑھ رہا تھا مجھ سا شاعر ایک نظم
لاشعوری جس میں تھے جذبات سب
جیسے اک دیوار سبز
دطیا جیسے کھیرا
ہ تو ہے آزاد نظم
دہرائے زندگی لا کی لگی ہے کھینچکر
س دیس میں

نوٹ :- مذکورہ بالا نظم بحروں کا آتار چڑھاؤ ملاحظہ ہو جو گمراہ ترقی پسندوں
کے یہاں عام ہے ۔
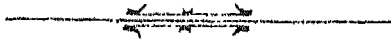
میراجی

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

میراجی

موجودہ ترقی پسند شعرا میں میراجی ایک خاص رنگ کے مالک ہیں۔ انکے کلام میں ایک جاذبیت اور کشش ہے جو دوسرے "ترقی پسند شعراء" کے یہاں مفقود ہے اور کسی کے یہاں اگر خال خال نظر بھی آتی ہے تو میراجی کو منہ چڑھاتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد انسان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر اس جنم میں میراجی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے تو مجذوب ضرور ہوتے۔ بہر حال وہ "ترقی پسند شاعر" ہیں، ایک شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر اس کے کسی شعر کی نثر کی جائے تو سوا ان الفاظ کے جن میں اس نے وہ شعر کہا ہے نثر میں دوسرے الفاظ نہ ملیں میراجی کے یہاں یہی چیز ہے جو ان کو "ترقی پسند شعراء" میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میراجی کے کلام میں مجذوبیت کی جھلک نمایاں ہے اور پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک مجذوب اپنی دُھن میں وہ باتیں کہہ رہا ہے جو عام انسانی عقل سے بالا اور برتر ہیں ان کا کلام پڑھ کر اُس دلچسپ واقعہ کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو ہمارے ایک دوست نے میراجی کے بارے میں بیان کیا۔ ان کی شاعری کا پس منظر غالباً یہی ایک درخشاں واقعہ ہے، درخشاں ان معنوں میں کہ اسی ایک واقعہ نے میراجی کو میراجی بنا دیا۔ اور ان کا پورا کلام یکسر اسی ایک واقعہ سے متاثر نظر آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ میراجی اپنے محلہ کے اسکول میں پڑھتے تھے ایک روز جب وہ اسکول سے گھر واپس آرہے تھے تو راستہ میں ان کو ایک مجذوب دکھائی پڑا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اُس وقت میراجی کے علاوہ

گرد و پیش اور کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا جس کے منھ سے مندرجۂ ذیل فقرے نکل رہے تھے۔

"خواب کی سیج پر گلابی چوڑیوں کی ٹُنک کھنکار تیرے نغموں کا ساز بجا رہی تھی چیخوں کے شعلوں میں مجھے تیری گلابی ساری کا رسیلا دامن دکھائی دیا طبیعت کے اُبال نے تیرے مہندی بھرے ہاتھوں پر چراغ کی غمگین روشنی میں اسطرح مست نغمے گائے جیسے طوفان میں آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ پڑے۔ ہولے ہولے بھاگنے والے شرمائے لجائے سائے شام کے جھٹپٹے کی آڑ میں دم لینے کو رک گئے ویران گذرگاہیں سامنے آ کر سنہرے دھندلکے میں دفن ہونے لگیں۔ کوا درخت کی آڑ میں ڈال پر اپنی تھرتی آواز میں کاؤں کاؤں کرنے لگا۔ مخمور دنیا کے سوئے ہوئے گرگٹ جاگ اٹھے۔ میں تیرے نہاں خانوں کے سامنے ویران محل کی چوکھٹ پر ہاتھ کے بل روندتے اور لرزتے نقش زنگار کی روشنی میں تیری سادی لٹو نکی آڑ میں اسطرح چھپ گیا جیسے گھٹائیں بادلوں کی چھاتی میں بجلی کی چمک سے خون زدہ ہو کر لپٹ جاتی ہیں۔ ڈال پر رنگ بدلتے ہوئے گرگٹ انھیں بیکس ایوانوں میں لیٹا دیکھکر اس طرح جھجک گئے جیسے کوا چپ چاپ راہ تکتا ہوا دکھائی دے اور اس کی بھولی ہوئی یاد شرمائے ہوئے قلب کو گرمانے لگی اور شبنمی بوندوں کی پھواروں میں میری ابلتی ہوئی چشم نمناک یاد کے دامن میں بوسیدہ نظر آتے آتے اڑتے ہوئے طائر کی طرح جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی منظر بوسیدہ پر گر پڑی اور کچھ نئے نقوش اس طرح ابھر آئے جیسے گرگٹ کی پیٹھ پر کوئی غمگین مکھی بیٹھ کر ایک رات بسیرا لے لے یا کوئی اندھی آندھی کسی بوسیدہ منظر کا پیچھا کرتی دور تک نکل جائے بھولے بسرے احباب کی یاد اس کے دل میں اس طرح گدگدی کرنے لگی جس طرح رہ گذر پر سانپ رینگ رہا ہو۔ یا سوز محبت

کا جنازہ نکل رہا ہو۔ بہکا ہوا نور یاد کے دامن پر اڑتے ہوئے سائے کی طرح تھکا ماندہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فردا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ عزازیل کے گتو کی نقرئی پھونک سے سارا منظر خاموش جاگ اٹھا۔ تارے ہوئے ذرے فضا میں پرواز کرنے لگے۔ آزردہ تارے چمک اٹھے دکتا ہوا چاند کھلا گیا۔ کائنہ دریا زگری کو نیند آ گئی۔ پھر اتخیل اونگھ گیا ساز کے پیچ و خم سر بسجود ہو گئے نغمے کا نشا ترحیات پر مچلنے لگے۔ سائے کانپ اٹھے، دکھ کے آنسو رو پڑے شبستان فرانس محو حیرت ہو گئی چنگیزی ہاتھ ہنس پڑے۔ فضا یا برہنہ ہو کر در زیست کو بار بار کھولتی ہوئی نکل بھاگی۔ کنڈی باہیں اپنی چشم نمناک سے اشارے کرتی فضا کی ترنم خیز گونج میں اس طرح چھپنے لگیں جیسے محبت کی آنکھ میں خمخانۂ حیات کا بجھتا ہوا چراغ اپنی آخری روشنی دے کر گل ہو جائے۔ حیات کی بدحواس موجیں گھبرا کر ساحل زیست کے بوسے لینے لگیں۔

یہ تھا غالباً زندگی کا وہ درخشاں "حادثہ" جس نے میراجی کو شاعر بنا دیا۔
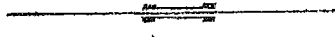
رخصت

ہاں بہت دور تھا لیکن اکثر
سوچتے سوچتے ہی راستہ کٹ جاتا تھا
شہر سے قرب و جوار
گویا ایک آنکھ جھپکتے میں نہاں ہوتے تھے
سامنے مجھکو نظر آتا تھا
ایک ویران محل
یونہی بے دھیانی میں جو کھٹ کبھی نکل جاتی تھی
وہی چوکھٹ جسے ٹکڑوں پاؤں
ہاتھ سے بل پہ ہمیشہ چھپ کر
روندتے روندتے اس حال پہ لے آئے تھے
ٹوٹے دروازے کے سب نقش و نگار
کچھ تو بوسیدہ تھے اور باقی مری آنکھوں کو
اتفاقاً ہی نظر آئے تھے
جیسے چلتے ہوئے .... رستے میں پھسل کر کوئی
بے چلے راہ سے کچھ دور نکل آتا ہے
میں بھی دروازے سے چوکھٹ سے گذر جاتا تھا
جیسے ساون میں کسی ڈال پہ کوئی گرگٹ
دیکھتے دیکھتے میں رنگ بدل جاتا ہے
ایسے ہی وقت میں اک لمحے میں

یونہی ایوان میں لیٹا ہوا بیٹھا ہوا استادہ نظر آتا تھا
راہ تکتے ہوئے، چپ چاپ ــــ نگاہیں اُس کی
مجھکو بے رنگ جھروکوں سے نکلتی کوئی کرنوں کی طرح
بھولی یادوں سے ملا دیتی تھیں ...
بھولی یادیں جو بھیلتے ہوئے ملبوس کی مانند نئی باتوں کو لے آتی ہیں
کبھی للچاتی ہوئی اور کبھی شرماتے ہوئے قلب کو گرماتی ہوئی
آپ ہی آپ میں بہتے ہوئے دھارے کی طرح
اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا
آپ ہی آپ میں رستی ہوئی بوندوں کی طرح
سوچتے سوچتے رک جاتا تھا
آپ ہی آپ اُبلتی ہوئی چشم نمناک
یا دامن بوسیدہ سے
خشک ہونے کے لئے پل کو لپٹ جاتی تھی
آپ ہی آپ سے اڑتے ہوئے طائر کی طرح
بہتے بہتے کسی ٹہنی پہ بسیرا لے کر
جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی پھیلی ہوئی بے جان زمین کے اوپر
اپنی ہستی کو گرا دیتا تھا
اور گرتے ہی نظر آتا تھا
ایک ویران محل
جس کی چوکھٹ کو مرے ہاتھوں کے ناخن ہر دم
چھیلنے کے لئے بیتاب رہا کرتے ہیں

جیسے یوں چھیلنے سے منظر بوسیدہ پہ
کچھ نئے نقش ابھر آئیں گے
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
آپ ہی آپ کلی کھلتی ہے
اس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے
آپ ہی آپ زمیں ہلتی ہے
اس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے
آپ ہی آپ گھٹا چھاتی ہے
آسماں صاف نظر آتا ہی نہیں؟
آپ ہی آپ چلی آتی ہے آندھی اندھی
اور پھر منظر بوسیدہ اُبھر آتا ہے
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے
آپ ہی آپ سے شرمندہ ہوا کرتا ہوں

میراجی

بعد کی اڑان

چوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا، ــــ کوّا
اڑتے اڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آپہنچا
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل ــــ
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے

دوش پر بکھرے ہوئے ہیں گیسو
بندی دُمدار ستارہ ہے، مگر ساکن ہے
چلتے چلتے کوئی رک جائے اچانک جیسے
غسل خانہ میں نظر آیا تھا انگلی پہ مجھے سُرخ نشاں
وہی دمدار ستارے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی نقشِ کفِ پا کی صورت
رات کے راستے میں چھوڑ گیا ہے وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی

ایسی ہی ایک لرزتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے بلبوں لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے

فرش پر ایک مسہری کے کٹہرے پہ ہوا آویزاں
"چھوڑ دو، رہنے دو، اس کو تو یہیں رہنے دو۔"
نیم وا آنکھوں کو پھر بند کیا تھا اس نے
ہاتھ بھی آنکھوں کے پردوں پہ رکھے تھے یکدم
اور اب ایک ہی پل میں یہ اگر کھل جائیں
یہی آنکھیں جو مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں
دیکھ لیں مجھے ـــــــ ہاتھ کہاں رکھیں گی؟
وہیں رکھیں گی ـــــــ وہی ایک نشانِ منزل
جس جگہ آ کے ازل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں
ایک ہی لمحہ بنے تھے مل کر
اسی لمحے میں یہ بندی مجھے دُمدار ستارہ سا نظر آئی تھی
رات کے راستے میں چھوڑ گئی تھی وہ کہانی جس کو
سننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی
اب لرزتے ہوئے ملبوس نظر آتے نہیں ہیں لیکن
اُن کی آنکھوں کو ضرورت بھی نہیں
وہ تو اک رات کے طوفان کا اعجاز تھا، طوفان مٹا
کیسا طوفان تھا! ـــــــ اندھا طوفان
جس کے کٹنے پہ مجھے نوح کی یاد آئی ہے
اور پھر نوح نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا اسے چھوڑ دو ـــــــ اس فاختہ کو

جا کے خشکی کا پتہ لے آئے
چند ہی لمحوں میں وہ فاختہ لوٹ آئی، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی
اور پھر کوّے کو چھوڑا یہی خشکی کا پتہ لائے گا
اڑتے اڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہونچا
چھم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا کوّا
کلموا، کالا کلوٹا کاجل

میرا جی

افتادہ

(میراجی کی نظم "افتادہ" سے متاثر ہو کر)

سیکڑوں دانوں کو چہرہ میں لگائے ہوئے افتادہ ہے تخریب کا اک کوہِ نحیف
اپنی بندیا کے قریب
مجھ کو لگتا ہے عجیب
اک بگولہ کا دھواں دھار جواں ہو گیا
میرے کانوں میں بہت دور سے ریں ریں کی صدا آتی ہے
سائیکل یہ تو نہیں؟
چوں چوں کرتی ہی چلی جاتی ہے بیداری و فریاد کا ہے نقش دراز
اس میں اک روگ ہے جو روگ کہ ٹلتا ہی نہیں لاکھ دکھلایا اسے لوگوں کو
میری ٹانگوں میں ہے رخشندہ حزیں گیت کی لَے افتادہ
ایک ہی عکسِ دراز
خواب اور خون میں لتھڑا ہوا استادہ ہے بکھرتے ہوئے ایوانوں میں
ساحلِ زیست کا عکس
اور کاندھے پہ جنازوں کے رواں کوسوں تک
اس میں ہستی کی گذرگاہ کا ایک سُرخ نشاں ہے مضمر
پائیڈل ٹوٹ چکے ہیں جس کے
اور مڈگارڈ سے آواز حزیں آنے دو
خود سے یہ ہو کے درست آپ ہی چل نکلے گا
اس کو کیچڑ میں ذرا دیر پڑا رہنے دو

اور پھر گھانس میں اک برق کے مانند اسے دوڑا کر
ٹیوب بدلوں گا تو پھٹ جائے گا
شب کے سناٹے میں آوازِ مہیب آئی جواں کانوں میں
میں یہ سمجھا کوئی پنچر ہوگا
وہ تھا برسٹ
کتنا بڑا
اُس کی وسعت کا نہ اندازہ شبستانِ چمن نے بھی کیا
کلموا، کالا کلوٹا سا برسٹ
اب اگر پھر کبھی اس طرح یہ چلتے میں ہوا
لیکے ڈبیا میں سلوشن کی تجھے جوڑ ہی ڈالوں گا میں
پھر نہ کہنا کہ مرا منھ ہوا بند اور ہوا صحرا کی
بھر گئے کانوں میں جس سے کہ زکام اور سردی
بام پر چپکے کھڑے دیکھ رہے ہیں منظر
اور میں اپنے پسینہ میں نہایا ہوا افتادہ پڑا
ایک دلہن کے شانوں پہ سوار
جیسے تعمیر کا اک نقشِ عجیب
ڈوبتے ڈوبتے بھہ نکلے گا
اس کا بہنا ہی بُرا
خیر نکل جائے گا
اپنی مرجھائی ہوئی کھال کے خمخانہ سے

بات کی اُڑان

(میراجی کی نظم "بعد کی اُڑان" سے متاثر ہو کر)

مجھکو پکڑے ہی لئے جاتا ہے کاشانۂ ہستی کے قریب اک گھر میں
اجنبی چور سا بھٹکا ہوا اک نقشِ حزیں
اور اک سوئے ہوئے خواب کی روٹھی ہوئی تعبیر کے پاس
اڑتے اڑتے تیرے گہوارے میں رک جائے گا
جس پہ بیٹھی ہوئی اک فاختۂ غمگین اُداس
یا کہ گزرے ہوئے رنگین فسانوں کی کتاب
جس میں بھولا سا تبسّم ہے نہاں خوف سے انگاروں کے
اور عزازیل کے کتوّں پہ کھڑا ہنستا ہے
جھٹپٹے وقت کے سایوں کی طرح
کوہ کا راز جسے موت کے سنّاٹے میں
اک طربناک ہنسی ڈھونڈ رہی جس کو
تیرے کوچے کے زمیں دوز مکانوں کی بغل میں اک پھول
خشک و نمناک سا جھول
روٹھنا جس کو ازل سے ہو ابد تک تیرے سوئے ہوئے رخساروں پہ
اور اس سوز میں ڈھل جائے گا وہ مہرتپاں
اور اڑتے ہوئے بادل کی جلو میں سرِ راہ
ڈوبتے رہتے ہیں

مژگاں کے چراغ
اور جھلک اپنی دکھا کر وہ بدل دیں گے امنگوں کی حسیں لہروں کو
تیز سرشار سے سائے تری چتون کے قریب
بڑھ نہ جائے کہیں میخوار کی آنکھوں میں دھواں
اک لرزتی ہوئی دیوار کے سایہ کے تلے
اس کو جبریل کی پرواز میں ڈھونڈ
ڈوبنے لگتے ہیں آشفتہ شفق میں وہ جنوں خیز جوانی کے نشاں آٹھ پہر
جو ابھرتے ہوئے بگلوں کی قطاروں کی طرح
شام کو جاتے ہیں مغرب کے سلگتے ہوئے دھندلے سے دھوئیں کی زد میں
اپنے انجام سے ہیں بے پروا
اور اگر کوئی شکاری نے بغل سے اک تیر
کر دیا اس پہ تو گر جائیں گے تالاب کی گھبرائی ہوئی موجوں میں
اور آنکھوں میں گزرگاہ کے وہ نقش ابھر آئیں گے
جن کو سینہ میں لئے جاتا تھا سیلاب اُدھر
جس طرف سے یہ اُدھر اڑ کے چلے جاتے تھے
اور یہی گاتے تھے
مجھ کو پکڑے ہی لئے جاتا ہے کاشانۂ ہستی کے قریب اک گھر میں

روح کا بوجھ!

زندگی ایک بیل کے مانند
روح جس پر سوار ہے ہر دم
بے اصولی ہے جس کی گھٹی میں
جا کری جس کے دابتی ہے پاؤں
دھانی دھانی مسرتوں کا چراغ
جھومتا جھومتا سلگتا ہے
جو رجب کی ذہانتوں پہ نہیں
کھال موٹی سی نور کی نیٹی
اور حلقہ بگوش دست دراز
کان اس طرح سے اینٹھے گا
جیسے ممبے کی گوشمالی پر
دھار پانی کی ایک بہہ نکلے
اور پھر چاندنی کی سرخ نظر
جسم کی زندگی بڑھائے ہوئے
اور محکومیوں کے انگارے
اس طرح مجھ پہ سنتے رہتے ہیں
جیسے احساس کشمکش کا تناؤ
اور نادان پھول سی دیوار

بعض ٹیڑھی رگوں پہ جسکی نہاد
میرے جذبات کو کچلتی ہیں
شفق گرم کے دھندلکے میں
ایک نفرت بدوش عیّاری
ایک خلوت نواز تہہ خانہ
ایک تلخی زدہ سا سنّاٹا
عزم جس کا جھکا ہوا غم سے
جیسے ہو ایک ڈیڑھ خما حقّہ
اپنے کندھوں پہ اک چلم لادے
جیسے گرگٹ کی پارسائی پر
چھپکلی کی اداس اداس نظر
جسکی غمناک چیخ سے ڈر کر
چھپ رہوں ڈھیر میں جوانی کے
جسطرح ڈر کے شیر خوار کوئی
ماں کی چھاتی کو بھینچ لیتا ہے
اور نوخیز ولولوں کی پھوار
میرے سینہ کے جرم پر رقصاں
دل میں اک رندمیکدہ بردوش
پیا کے مئے زندگی پہ ہنستا ہو؟
زندگی ایک بیل کے مانند

ناکارہ

(میراجی کی نظم "حرامی" سے متاثر ہو کر)

ترے جذبات کے کندھوں پہ ہے رکھی ہوئی اک برف کی سل
جسکی ناکردہ گناہی کا پتہ بھی نہ لگائے سے لگا
اسی ٹھنڈک سے تو رگ رگ تری ناکارہ ہوئی
جیسے مفلوج لگا ہوں میں محبت کا خمار
ایک بد ذوق مشین
صنفِ نازک کے لئے تو ہے نکما پتھر بھی
تالیاں ٹھوک کے اٹھ بیٹھ کے پا جاتا ہے
کچھ نہ کچھ اپنے ہی کھانے بھر کا
ایک بد گوشت ـــــــ کمینہ بد گوشت
شکلِ معصوم سے چمگاڈر سے
عمر کے ساتھ لٹک آیا ہے
کیسا بے کیف، کلوٹا کالا
کھسیانا، بولتا، ہنستا بھی نہیں
جیسے دالان کا ٹوٹا پنکھا
ایک بے کیف وجود
جیسے ترکٹ کی صدا صحرا میں
اگر کوئی اسکے جذبات سے توجہ کرے
پھر نہیں کچھ بھی مل سکتا

راستہ کوئی نکلنے کا نہیں!
کیسی پرکیف ہے خلقت تیری
جیسے شبنم کی تڑپ صحرا میں
جیسے معصوم کلی کی چٹکن
تجھ میں شاہی کے جراثیم بھی ہیں
چند مخصوص مقامات پہ شاہی تجھے مل سکتی ہے
تیری دوکان وہاں خوب ہی چل سکتی ہے!
قدر داں سیکڑوں مل جائیں گے
سیکڑوں دل ترے دامن پہ مچل جائیں گے
چل اسی دیس میں چل
ہے اگر ساز شکستہ تو کوئی حرج نہیں
وہ تو اک دوسری موسیقی کے دلدادہ ہیں
مارنے مرنے پہ آمادہ ہیں
اس طرح تیری محبت میں وہ جھک جائیں گے
جیسے سگنل کسی اسٹیشن پہ
خیر مقدم کے لئے ریل کے جھک جاتا ہے
تیرے بیٹھے ہیں ہرے
اور ہے اُڑا اڑ میں لوچ
جیسے چیتے کی کمر
تالیاں ٹھونک کے اور باندھ کے نیلی ساری
داد نامردگی اس طرح سے لے دنیا سے

جیسے اٹلی کو ملی سسلی میں
تجھکو مفقود جوانی کی قسم
ترے احسان سے دنیا نہ اٹھائیگی نظر
اک نئی راہ محبت کی دکھائی تو نے
دی ہے عورت کو بہت سخت جھکائی تو نے
تیرے جذبات کے کندھوں پہ ہے رکھی ہوئی اک برف کی سِل
جسکی ناکردہ گناہی کا پتہ بھی نہ لگائے سے لگا

بیداد

میں تو اک فوج سے ملنے کے لئے آیا ہوں
کم سے کم دس دفعہ کنڈی تو ہلائی ہو گی
کوئی مغلانی مگر آئی نہیں
کیا یہاں کوئی نہیں؟ —— کوئی نہیں، کوئی نہیں —— ؟
اور اکبار ہلا لوں کنڈی
چھوڑ دوں سونی فضاؤں میں میں کھانسی کی صدا؟
رات بھر کھانس کے جس سے تھا کیا فرش غلیظ
ناک منہ جیسے بسورے تھے بہت مہترنے
فرش کو جھاڑتے وقت
صبح کے سایوں کے سناٹے میں
سوچتا ہوں کہ ٹھہر جاؤں ذرا
کوئی بھٹکی ہوئی بھڑ
سر کوچہ سے اگر جست کرے
اور دیوار کے چھجوں کو ہنسی آجائے
اور کچھ دیر گزر جائے گی انگڑائی کی گھبرائی ہوئی نظروں میں
میرے ادراک کی پاپوش مچل جائے گی
مگر افسوس تری چشم نظر کے سکتے
مجھکو رپٹائیں گے اس کوچہ میں
"راہ تکنا ہی مقدر میں لکھا ہے شائد"

اُسکی دہلیز کے سینے میں ہے کیا رمز نہاں
ایک سویا ہوا رمز
ابھی کھولوں گا تو سب میرے لپٹ جائیں گے
اور میں اُسکی نگاہِ غلط انداز کی باہوں کے تلے
یوں دبک جاؤں گا ہلتی سی شعاؤں کے نہاں خانوں میں
سُونی دہلیز کو کرتے ہوئے پار
تیری پاپوش سے کمبخت ہمیشہ کے لئے
الوداع الوداع کرتا ہوا معدوم ——— عدم
بند ہوتا ہوا کھلتا ہوا ٹاپے کا حصار
ہاں اسی منظرِ غمناک کی وراحت اب تو
میری ہستی کی نگاہوں کے گوداموں میں چھلکتی ہو مدام
دانہ ہو جائے درِ زیست کہیں
اور میری ہی کسی ستم ساز جواں کالک کو
میری پروازِ خطرناک نہ دھوکا دیدے
اور سب کھڑکیاں اکدم کھلجائیں
جن سے اڑ جائیں بٹیر
یہی پھیلاؤ مرے ماضیٔ خفتہ کے حجروں کے میں کبھی تھا
مگر اُس ٹوٹی ہوئی ڈال کے آغوشِ لحد میں لیٹا
جھانکتا جھانکتا دنیا کو چلا جاؤں گا
ایک آہن کی تپیدہ ـــــ ناچتی کودتی اور بل کھاتی
اور سمٹی سی چلی جاتی ہے مرکز کی طرف

گرم بستر پہ تڑپتا ہوا دل بیٹھ گیا
وا ہوا اُس کا جو روزن تو مرے دل نے کہا
پڑ گیا نازنیں دہلیز کا پاؤں
لیٹا تھا اُس پہ مرا حسنِ طربناک کا معصوم خیال
وا جو دروازہ ہوا کالا سا پھن پھیلائے
اُسکے نتھنوں کے شبستانوں سے تھراتی ہوئی
خوب گرمائی ہوئی ایک فتادہ سی لپک
جس میں پوشیدہ تھا، لرزیدہ تھا اُس مست نظر کا اک داؤ؟
مگر اُس کو جو ٹٹولا تو تھا کوئلہ کالا
اور پھر گونجتی۔ جھلاتی ہوئی ٹانگ کی آہوں پہ سوار
بند دروازے کا سناٹا، تیرے سامنے کیوں آیا ہے
کچھ عرقناک جبینوں سے لرزتی ہوئی گستاخ نظر
اس کے ماتھے پہ تڑپتی ہوئی بھر نکلی ہو
چت ہوئے جاتے ہیں تحریک کے داؤ؟
پھن کو پھیلائے ہوئے جھومتے لہراتے ہوئے
آنکھ میں دھول پڑی ہو مگر اس منظرِ بدمست کی سمت
اور بوسیدہ ہوا اینٹھی ہے
پھولتے پھولتے پھیل جاتے ہیں
گرم بستر پہ پڑی، بیوہ امید دل سے خشک ہو گردنیں دہلیز حمائل ہو کر
جو بھی آ جائے اُسے کام سے کام
اونگھتے اونگھتے بستر پہ پلٹ پڑتے ہیں

اور پھر تیرگی، ہوش کا نادان دماغ
رس بھری مست جوانی کی تمناؤں کا راز
جسم کی کھال تلک کھینچ کے کھا جاتی ہے
اور بوسیدہ فتادہ ٹخنے
چوستے چوستے بڑھتے چلے آتے ہیں
میرے پیروں کی طرف
اپنی اک رگ میں سموئے ہوئے تقدیر کے پیچ
گویا وحشت کے فسوں ساز جواں
میں کبھی اب چیخ کے چلّا کے تڑپ جاؤں گا
بند ہوتے ہوئے کھلتے ہوئے آغوش کے ساحل کے قریب
میں تو اک فوج سے ملنے کو چلا آیا ہوں
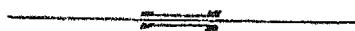
چلچلاہٹ

(میراجی کی نظم "سرسراہٹ" سے متاثر ہوکر)

یہاں ـــــ کی جنبشوں پر ہاتھ رکھ دوں؟
یہ مچھلی کی طرح دریا کی تہہ میں مجھکو لیجاکر بہا دیگی
وہاں اک موج کے آغوش میں لیٹا ہے دریاؤں کا سنّاٹا
اچانک جاگ اٹھے گا
تو اس کے ہونٹھ لرزاں ہو کے شاید قہقہہ ماریں
میری تخئیل کی سونی گلی کی موڑ پر جاکر
مرے دل کی نگاہوں کی کمر کو تھام لے بڑھ کر
مگر میں سوچتا ہوں یہ، کہ موجوں کی اداسی میں، بہے جاتے ہیں دریا کے وہ سنّاٹے جنھیں لہریں
نگاہِ گرم کی ریتار رہی ہیں ایک مدّت سے،
پکڑتا ہو عقاب اُن کو تو وہ کیسی جھکائی دے کے انکو بھاگ جاتی ہیں
بڑھا کر رکھ نہ دوں کیوں ہاتھ اُن پر، کہ جن پر زندگی کا ساز نغمہ موت کا گا دے
جھٹک کر ہاتھ میں یوں کھینچ لوں، جیسے عروسِ نو اکیلے میں کہیں پر ہاتھ رکھدے اور جھجک جائے،
مگر اسطرح رکھنے پر لگیں گے قہقہے ہر سو
بتاؤ تو بھلا دنیا یہ کیسی بھولی بھالی ہے
مگر شب کی بدلیسی روشنی میں ان کو گر پالوں
تو میرا کام بن جائے، مری دنیا بدل جائے، سنبھل جائے، مچل جائے، کسی خلوتِ گمنام میں جاکر
مگر اسکی کمینی ململی دہلیز مجھکو مار ڈالیگی، اگر سن پائے گی میری نگاہِ گرم کے بچپن،

مگر چلتے چلاتے اُنکی آغوشِ تمنا میں ٹھہر کر اور تھم تھم کر میں اُنپر اپنا ہاتھ تو رکھ لوں
جہاں جذبات کی معصومیاں کچھ گنگناتی ہیں
جہاں پرستیاں بے کیفیوں کے گیت گاتی ہیں
ہنساتی ہیں، رلاتی ہیں، رلاتی ہیں، ہنساتی ہیں،
مگر پھر دل میں آتا ہے نکل جاؤں شبستاں سے
بگڑتا اور لڑتا زندگی کی نوحہ خوانی سے
مگر وہ تلملائیں گے، ہنسینگے اور ہنسائیں گے، ستائیں گے، منائیں گے، اٹھائینگے بٹھائینگے
مگر پھر سوچتا ہوں پوچھ کر اُن سے
وہاں کی جنبشوں پر ہاتھ رکھ لوں؟
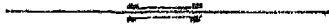
(مظلومی)

(میراجی کی نظم "محرومی" سے متاثر ہو کر)

نوٹ:۔ اس نظم میں جہاں پہ ایک بریکٹ ختم ہو اس کو ایک مصرع سمجھئے۔

میں کہتا ہوں تم سے، اگر صبح کو بھول کر بھی، کبھی سائیکل کی دوکاں کی طرف سے نکلنا،
تو پنجر کو جڑ واہی لینا، اگر ہو گیا ہو تو اس پہ تعجب نہیں ہو نہ ہو گا)
ہمیشہ اسی رنگ میں چل رہی ہے، مقابل میں سب کی جواں سائیکلوں کے)
اترتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے، مچلتے ہوئے اور لچکتے ہوئے پھدکتا چلا جا رہا ہوں)
اِدھر آؤ یہ تیلیاں، تم نے دیکھی نہیں ہیں، کہ جو زنگ سارے بدن پہ لگائے ہوئے ہیں)
جہاں سیٹ تھی اب وہاں اک خلا ہے، مگر اسمیں اب لاکے چمڑا بھرا ہے، کہ جس کو
نہیں اب کوئی دیکھ سکتا)
ٹٹولو نہ اس کو ـــــــ جہاں پہ لگی تھی کبھی ایک گھنٹی، ہر آواز جسکی چھپائے
ہوئے تھی غضبناک طوفان)
اسی کھڑکھڑاہٹ کے پیچھے سے، آہستہ بیٹھا ہوا، اور ڈرتا ہوا، چوُر سا میں چلا جا رہا تھا
بڑے زور سے کہہ رہا تھا ـــــــ "ہم آ گئے ـــــــ ہم آ گئے")
مگر آنکھ جھپکی تو دیکھا یہ میں نے، کہ میں لڑ گیا ہوں کسی سائیکل سے)
ہجوم اک قرینے سے گھیرے کھڑا تھا)
میں کہتا تھا دل میں ـــــــ چلو بھاگ نکلیں سپاہی مگر ہاتھ پکڑے ہوئے تھا
پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا)
پسینہ کو آخر ترس آ گیا میرے منھ پر گیا اور وہاں جا کے بھائی گرا لایا، جہاں سے پکڑ کر لے گیا تھا)

تھیں اس کا احساس کا ہے کو ہوگا، یہ ذمہ ہے میرا
شروع سے سلوک ایسا ان سائیکلوں سے، رہا ہے پولیس کا، کہ جسمیں بریک ہو نہ ہو کوئی گھنٹی
جو لڑ جائے جھونکے سے ٹکرا کے کوئی، تو اس کو پتہ بھی نہ ہوگا)
میں کہتا ہوں تم سے اگر صبح کو بھول کر بھی کبھی سائکل کی دوکاں کی طرف سے نکلنا،
تو پنچر کو جڑ دا ہی لینا، اگر ہو گیا ہو تو اس پر تعجب نہیں ہو نہ ہوگا)
ہمیشہ اسی رنگ میں چل رہی ہے، مقابل ہیں سب کی جواں سائیکلوں کے)
یہ چالان کروا ہی رہتی ہے میرا، اور کہتی ہے مجھ سے، ——— کہ جاؤ اگر تم اسی طرح
رکھو گے مجھکو، تو ہر لحہ چالان ہوگا تمھارا جو گذرو گے تم دوش پر بیٹھکر، تو پاؤ گے
اپنے کو اُس دم اکیلا)
بلا لیمپ کے دائیں بائیں تمھیں کچھ دکھائی نہ دیگا، سڑک کی سیاہی تمھاری حماقت
پہ ہنستی رہے گی،)
مگر ڈھال پر رفتہ رفتہ، میرے دونوں پہیوں کی گردش کے مانند، تمھیں دور کی بات
معلوم ہونے لگے گی)
دھنیدلکے ہیں میرے فری وہیل کی ——— آنکھ کھل جائے گی)
ایک تانگہ چلا جا رہا تھا)
مگر اس سڑک کی سطح پر، کوئی بھولا بھٹکا بھی تانگہ نہ ہوگا)
اور اک دم شکستہ، فتادہ، میرا ہینڈل ٹوٹ کر تم کو فرش حسیں پر لڑھکتا ہوا
بھاگ جائے گا، پہیہ کہو یہ تمنا تو میری نہیں ہے)
بس اب اپنی غمناک ٹانگوں سے، پیڈل پہ مت زور دینا)
میں اب جانتی ہوں، کہ میری وجہ سے، تمھارے ہوئے ہیں اندھیرے اُجالے میں چالان)
میں اب مانتا ہوں کہ جسم حسیں پر، ہزاروں ہیں گرنے کی چوٹیں، کہ جنکی اذیت اکثر

میں رو رو رہا ہوں)
بلالیمپ کے دائیں، بائیں، تمھیں کچھ دکھائی نہ دیگا سڑک پہ، سپاہی تمھاری حماقت
پہ ہنستی رہے گی!
میں اب جانتا ہوں، کہ بیٹے پولیس چوکیوں میں، سویرے سے تا شام، معصوم حالت
میں دیکھا ہے اپنے کو لیکن، وہاں کا مزہ ایسا منھ کو لگا تھا، کہ ہر بار ہمراہ ہر کے
گیا ہوں!)
وہاں جھڑکیوں، گھڑکیوں کے علاوہ، بہت کچھ مجھے گھر سے دینا پڑا ہے)
جسے سوچ کر اب، مسہری کے معصوم باندھوں کے اوپر، مجھے خواب آتا نہیں ہے)
——— میں کانوں سے بیداریوں میں ابھی تک، سنا کرتا ہوں گونج ان جھڑکیوں کی
——— سفید اور دہانی گلابی وہ ڈانٹیں، جسے سن کے کہتا ہوا اب تلک
بھاگتا ہوں، کہ آہٹ سپاہی کی یہ تو نہیں ہے)
مجھے گوشہ گوشہ سے گھر کے پولیس کی، انہی جھڑکیوں کی صدا آرہی ہے)
میں کہتا ہوں تم سے اگر صبح کو بھول کر بھی، کبھی سائیکل کی دوکان کی طرف سے نکلنا،
تو پنچر کو جڑوا ہی لینا اگر ہو گیا ہو تو اس پہ تعجب نہیں ہے نہ ہو گا)

کل رات کو!

آن سے انٹرویو مرا ہو ہی گیا
اور پورا ہو گیا
اک اندھیری رات میں
اک درخشاں سوچ میں
سوچ کیسا؟
وہ کہ جس سے بھول جائیں بھیڑ ی شیروں کی بھی
بکروں کی بھی
بھیڑوں کی بھی
سوچتا ہوں ـــــــ اب کہ میں
جاؤں کہاں؟
نرسوں کے پاس؟
دائی کے پاس؟
کیا کریں گی دائیاں
اچھا اگر بالفرض وہ
یہ دائیوں سے ہو گیا
نام کیا رکھے گا کون؟
آپ یا میں
یا کہ ہم سب ایک ساتھ

کیونکہ ہوگا سب کا وہ
نخلِ محبت کا ثمر
کچھ آپ کا - کچھ آپ کا - کچھ آپ کا
نام بھی گر رکھ لیا
پھر ہوگا کیا ؟
میں تو بسم اللہ کا قائل نہیں
اور کسی مُلّا کا بھی قائل نہیں
کون مُلّا ؟
زندگی کا جسکے مقصد کچھ نہیں
اور مقصد ہے تو یہ
دن رات ذکر و فکر میں
اوقات کو ضائع کریں
اور مفت کی کھایا کریں
اور دیں اذانوں پر اذاں
جس وقت ہم مشغول ہوں
سب اپنے کارِ خاص میں
کار کیا ؟
وہ کہ جس سے دانت میں انگلی دبا لے مولوی
ہاں مولوی
وہ مولوی
جسکی پشتوں میں کوئی

اس کیف سے واقف نہیں
اچھا تو پھر میں کیا کروں
کس شخص کو اسے میں سونپ دوں
گھر اپنے اس کو بھیج دوں؟
اچھا تو پھر اب بھیج دوں
اور فکر تو اپنی کروں
آئی، ٹی کالج چلوں
یا گھر میں چل کر پڑ رہوں
اور سو رہوں —— ہاں سو رہوں

بس سو رہوں۔

ایک پہیلی

گرد آلود[1] فضا، کھوئی ہوئی سوئی ہوئی
بجھو پیڑا،[2] گردشِ افلاک سے سہما سہما
ایک دوشیزہ[3] جو ہے عقل و فراست میں اچھی
کر کے سب شادی کا ساماں[4] اُس کی

سو رہے موت کے آغوش میں اُس کے ماں باپ
اور نا کدخدا لڑکی کی کہیں سے اب تک

بات چیت آئی نہیں
زندگی موت بنی جاتی ہے
اُسکے مرجانے پہ سب غیروں کا ہو جائے گا
اُسکے سامان کی فہرست بنا دوں ورنہ
غیر لیجائیں گے، پہچان نہ پائے گا کوئی
ایک سنجیدہ و فہمیدہ دیگ
گدہری اور ذہین اک لٹیا
شوخ چنچل سی حسیں دو نگنیں

---

[1] دنیا کے پریشان کن حالات
[2] ہندوستان
[3] گاندھی جی
[4] ہندوستانی لیڈر

باوفا ایک بڑی سی کفگیر

دسپنا ایک نہایت سرکش

مسکراتی ہوئی کچھ تشتریاں

پاندان[۵] ایک نہایت منہ پھٹ

جسمیں فٹ جاہل و نادان ڈبیاں

مذہبی اور مسلمان اک سٹہ[۶]

کیتلی[۷] جسکی لڑاکو، خوددار

پیالیاں جسکی کئی جاہ پسند

اک شکردان بڑا صاحبِ ہوش

خاصدان ایک غریب اور مسکیں

چند مخلص مگر ہٹی کانٹے[۸]

اٹھ کے اب خلوتِ خاموش میں جا بیٹھے ہیں

ایک دیوبندی وضع کا لوٹا

ایک بجنور کا مفلس ہیرا

ایک باغی سا گرانڈیل گلاس

زندہ دل ایک سا کڑھائی کالی

آتشدان نہایت بے باک

---

۵ عطاء اللہ شاہ بخاری۔

۶ مسلم لیگ۔

۷ مسٹر جناح۔

۸ مولانا ظفر الملک جیسے لیڈر۔ بقیہ لیڈروں کو پہچانتے کون ہیں۔

یار باش ایک پلنگ
مرتبان ایک نہایت جھکی
اک کمیونسٹ سلفچی چالاک
اور کچھ رنگ برنگی کپڑے
یہ اثاثہ ہے جسے آہ، لئے بیٹھی ہے
کس قدر ڈھیٹ ہے کیسی دیوانی
ایک ناکتخدا لڑکی کہیں سے اب تک

بات چیت آئی نہیں
گرد آلود فضا، کھوئی ہوئی، سوئی ہوئی

اے اُمی مجھ کو ان کی قسم کتنا ہے دل
جس حال کے لئے ترستا ہے دل
انہیں تیرا لہو رو رہا ہے آنکھوں سے
جن سے جنگ کا رہا ہو دھوپ
میرے جسم کے ساتھ دار کی
خاک میں مدفون ہے ذرا ذرا
وہی رنگوں میں دھوئیں اور جوانی
دل کو راحت بھی ملے اور راحت بھی
مجھ کو نازش ہے میں پیر

رفعت

(میراجی کی نظم "رخصت" سے متاثر ہو کر)

روشنی میں بھی سوجھائی نہیں دیتا اکثر
سوچتے سوچتے پھُننگی میں لٹک جاتا تھا
اور مجھ سے بھی بیکار سے
ٹکٹکی باندھ کے مرگھٹ کو رواں ہوتے تھے
سامنے کچھ نہ نظر آتا تھا
دل کا ویران کھنڈر
بے دھیانی میں چھپر کھٹ کبھی نکل جاتی تھی
بھیڑ کے دوش پہ ریلے پہ سوار
کچھ تو غمگین تھے اور باقی مرے ہاتھوں کو
رات دن بوسے دیا کرتے تھے
گھیرتے گھیرتے اس جال میں لے آئے تھے
روٹھے دروازے کی آنکھوں کے خمار
کچھ تو بے ذوق تھے اور باقی مری ٹانگوں میں
مثل افعی کے لپٹ جاتے تھے
جیسے اک آم کے چھلکے پہ پھسل کر کوئی پیر
توڑ کر عمر کے بندھن کو ٹہل جاتا ہے
میں بھی تب ہوش کی منزل سے گذر جاتا تھا
اور اس کی نگہ ناز کا کوئی گرگٹ

میری تخئیل کے کندھوں پہ مچل جاتا تھا
ایک ہی وقت میں برگد کے کسی ٹہنے میں
یونہی طوفان بھی، ہنستا ہوا، روتا ہوا مبہوت نظر آتا تھا
دانت کھولے ہوئے، خاموش سی باہیں اُس کی
مجھکو خمخانہ سے روزن سے گراتی ہوئی لہروں کی طرح
غم کے ڈانڈروں سے ملا دیتی تھیں
بھولی باتیں جو لڑھکتی ہوئی تخئیل کے مانند نئی یادوں کو لے آتی تھیں،
کبھی بل کھاتی ہوئی اور کبھی اٹھلاتی ہوئی، قلب بڑھاتی ہوئی
خواب ہی خواب میں بہتے ہوئے منظر کی طرح
اپنے پنجوں کو ٹکالیتا تھا
خواب ہی خواب میں رِستی ہوئی آہوں کی طرح
کھنچتے کھنچتے آخر کو سُلاک جاتا تھا
آپ ہی آپ غزالوں کی مچلتی ہوئی چشم نمناک
یا کسی ساحلِ رقصندہ سے
وقتِ رخصت کسی گرداب کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی تھی
آپ ہی آپ وہ چلتے ہوئے ٹائر کی طرح
ڈرتے ڈرتے کسی کھائیے کا سہارا لیکر
گھومتی ریت سے لپٹا ہوئی، جلتی ہوئی برگشتہ جبیں کے اُوپر
نیند کو اپنی سُلا دیتا تھا
اور چلتے ہی نظر آتا تھا
دل کا ویران کھنڈر

اب سمجھتا ہوں کہ وہ یوں نہیں یوں چلتی ہے
لیجئے مغیں ہوا جاتا ہوں
جسکی دہلیز مرے ہونٹوں کی بانہیں ہر دم
کھینچنے کے لئے بیتاب رہا کرتی تھیں
جیسے بے خوابی میں اک خواب گراں دیدہ پر
تیرے پنگھٹ کے قریب
اب سمجھتا ہوں کہ کیوں ہاتھ مرے لگ نہ سکی
آپ ہی آپ بنی ہو تو کہوں بن نہ سکی
آپ ہی آپ گھڑی چلتی ہے
اسکی رفتار بھلی لگتی ہے
آپ ہی آپ وہ گھبراتی ہے
اس کا چہرہ نظر آتا ہی نہیں
پھر وہ بذات ادھر آتا ہے
آپ ہی آپ گھڑی چل بھی سکی

ن۔م
راشد
سے
متاثر ہو کر
یہ وہ جملہ ہے کہ جس کا ہمیں اُلٹا سیدھا

ن۔م۔ راشد

میراجی کے بعد پنجاب کے دوسرے ترقی پسند اور پیغمبر سخن جناب ن۔م۔ راشد ہیں۔ آپ نام ہی سے ترقی پسند ہیں جہانتک کلام میں معنی آفرینی کا تعلق ہے آپ میراجی سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ پنجاب کے بیشتر ترقی پسند شعراء کے "ملکوتی کلام" پر آپ کا اور میراجی کا مقدمہ ضرور ہوتا ہے آپ کے مجموعہ پر سرسری نظر ڈالتے ہی انسان "سماج کی گہرائیوں" تک پہونچ جاتا ہے۔ اور اسکی تہہ میں اسکو "ادبِ لطیف زندگی" نظر آنے لگتا ہے۔

"کشاف" (حبیب احمد قدوائی صاحب) نے "سنگ میل داقی" کے متعلق اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا تھا، وہ لفظ بہ لفظ بلکہ اُس سے زیادہ جناب ن۔م۔ راشد پر صادق آتے ہیں۔ چنانچہ اگر آپ ن۔م۔ کا مطالعہ کرینگے تو "کشاف" کے الفاظ میں "آپ فنکار کے دُھندلے نقوش اور اُبھری قلم کاریوں کے صناعانہ امتزاج تک پہونچ جائینگے آپ کے ہر مصرعہ اور ہر بند میں ایک "نابغیت" (genius) پائی جاتی ہے پوری شاعری برنائی حیات کا خواب بیداری ہے۔ ابہام کے پردۂ رنگیں میں حقیقت ڈرامائی انداز میں جلوہ گر ہے۔ بنا بریں مدرسانہ تنقید سے بالاتر ہے۔ آپکا کلام ماحول کی بےکیفی اور پستی سے ریش ریش ہے۔ کل کلام معنویت سے دست وگریباں نظر آتا ہے" ن۔م۔ "فرسودہ خیالات وتقلیدی تشبیہات کو فطری پرخلوص اظہار کی قربان گاہ پر چڑھا دیتا ہے۔ اسکی نظموں میں تخلیقی فن کاری کے مثالی نمونے ہیں۔ اسمیں زندگی کی بھرپور تلخی اپنی جھلک دکھا رہی ہے جمالیات حقیقت سے یک دست ہے۔ واقعیت کی کھردری سطح پر رومانی نقوش مرتسم ہیں۔ اور "جنس" کا ساز جسکے تار دل تک پہونچے

زنگ لگا ہے بجتا ہوا معلوم ہوتا ہے نظم سرتاپا آزاد ہے۔ ردیف و قافیہ کی تنگ دامنی پر خندہ زن اشاریت و ایمائیت کی قابل قدر تخلیق اس ذہنی کشاکش کی نشاندہی کرتی ہے جس میں نئی پود گرفتار ہے۔ ایک کاروان شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔ اور عذرا پاؤنڈ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظموں سے حیرت انگیز مماثلت رکھتی ہے اسکو روائتی داد کی حاجت نہیں کیونکہ یہ انتہائے شوق کی ایک مرتعش سی آواز ہے!!

گُناہ

ن۔ م۔ راشد کی ایک نظم "گناہ" ملاحظہ ہو

آج پھر آ ہی گیا
آج پھر روح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آکے مجھے ....
ہوش آیا تو میں دہلیز پہ افتادہ تھا
خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مرے روح کے تار ....
آج وہ آ ہی گیا

روزنِ در سے لرزتے ہوئے دیکھا میں نے
خرم و شاد سرِ راہ اسے جاتے ہوئے
سالہا سال سے مسدود تھا یارانہ مرا
اپنے ہی بادے سے لبریز تھا پیمانہ مرا
اسکے لوٹ آنے کا امکان نہ تھا

اس سے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا
کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی

یہ ہے "گناہ" جس واقعہ سے متاثر ہو کر پنجاب کے اس ہونہار ترقی پسند شاعر کے دماغ میں یہ "لطیف خیالات" پیدا ہوئے وہ واقعہ بھی سنتے جائیے پھر اُن محاکات کی داد دیجئے جو ہمارے ترقی پسند ادیب نے بے کم و کاست آپکے سامنے پیش کر دئے ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ نظم مندرجۂ ذیل واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے کہ

کوئی نواب اغن صاحب ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے پوتڑوں کے رئیس تھے۔ ان کے یہاں ایک ملازم فتح محمد نامی تھا نحیف الجثہ مگر دل پھینک، یہ حضرت محلہ کی ہر جوان لڑکی پر بازار جاتے مسمریزم کی مشق کرتے چلتے انہی لڑکیوں میں ایک لڑکی جو کافی قوی ہیکل اور جوان تھی اسیر آپکی توجہ اس قدر بڑھی کہ آپ نے نظری گستاخیوں کے علاوہ جنسی گستاخی بھی کرنا چاہی جسمیں غالباً کوئی زیادہ کامیابی کی صورت نہیں پیدا ہو سکی مگر لڑکی کی بدنامی کافی ہو گئی اُدھر فتح محمد صاحب کو دھڑکا لگا کہ نہ جانے کون آکر پیٹ دے اور فریقین میں کئی سال تک بول چال اور میل جول ترک رہا اور دونوں ایک دوسرے سے متنفر رہنے لگے لڑکی اس بدنامی کے تلخ گھونٹ کو پی تو گئی لیکن دلمیں بات لگی رہی

ایک دن جب نواب اغن صاحب کے یہاں کے لوگ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے لڑکی نواب صاحب کے مکان پہونچی اور اُسنے فتح محمد ملازم کو پکڑ کر

یہی درست کی کہ یہ حضرت بیہوش ہو کر گھر کی دہلیز پر گر پڑے، کپڑے کیچڑ میں لت پت
مرہ افسردہ غمگین و نزار۔ روح پارہ پارہ مگر ہوش آنے پر ایسا معلوم ہوا کہ وہ عورت
جو تانا نے سر پر سوار کھڑی ہے بھاگ کر کوٹھے پر آ گئے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا
کہ کھڑی ہے یا چلی گئی بارے یہ دیکھکر بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو گئے کہ وہ
خرّم و شاد سر راہ فاتحانہ انداز میں چلی جا رہی ہے۔ پچھلے واقعات آنکھوں میں
پھر گئے مگر پھر دل نے کہا کہ اتنے سال سے یارانہ ترک ہونے کے بعد وہ کیسے پلٹ
پڑی جبکہ اس کے لوٹ آنے اور انتقام لینے کا کوئی امکان باقی نہ تھا اور دنیں
بھی اس واقعہ کے بعد کبھی اس سے ملنے کی خواہش نہیں پیدا ہوئی آخر وہ پھر
کیسے آئی کمبخت کیسی شیطان ہے .... مجھ سے تگڑی نہ ہوتی تو بتا دیتا
دوسرے یہ کہ خداوند نعمت نواب اغن صاحب بھی گھر پر موجود نہ تھے جن سے
مدد ملتی۔ خیر گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط را

شرابی

(از ن۔ م راشد)

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں!
شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنےٰ غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں،
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ؟
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جامِ رنگیں کے بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو؟
شکر کر اے جاں کہ میں
اور بہتر عیش کے قابل نہیں!

انتقام

(از ن ۔ م ۔ راشد)

اُس کا چہرہ، اُس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس،
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بُت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے!
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
اُن بتوں کی بے حسی پر خشمگیں!
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
اُن فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ!
اُس کا چہرہ، اُس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

دھندلکوں میں کبھی سنّاٹوں میں!

(ن م راشد کی نظم "بیکراں رات کے سنّاٹے میں" سے متاثر ہو کر)

تیرے پہلو میں مری جان کبھی
دھندلکوں میں کبھی سنّاٹوں میں
جوشِ وحشت میں اُبھرتے ہوئے اعضا کے نقوش
اک گراں بار سی لذت میں نہائے ارماں
اور پھر تیری مچلتی ہوئی دلدل کے قریب
میرے ویرانے کا اک نقش چھپا جاتا ہے
ٹھنڈ کے گرم زمستاں کا سفید اک گرگٹ
خوف سے لذتِ موہوم کے افسوں پہ سوار
اک بلندی پہ کھڑا ہنستا ہے
تیرے پرتو کی قسم
بیکراں دن کے دہکتے ہوئے سنّاٹے میں
تیرے پہلو میں مری جان کبھی
آرزوؤں کا پہاڑ
چپکے چپکے کسی حبشی کی طرح رینگتا ہے
ایک لمحے کے لئے دل میں اُجاگر ہو کر
میرے کٹتے ہوئے جھڑتے ارمان اُبھر آتے ہیں
بلکہ ہنگاموں کے ساحل کی کوئی دوشیزہ

جب درِ زیست سے گھبرا کے بلاتی ہے مجھے
اور سلاتی ہے مجھے
ایک مدت سے جسے خواب نظر کی فطرت
روحِ نرگس کو سبکبار کئے بیٹھی ہے
بے سبب میرا گرہ گیر گریباں کھینچے
ارضِ مشرق کی طرف مجھکو لئے جاتی ہے
میرے بستر کے قریب
دھندلکوں میں کبھی سنّاٹوں میں

ناتمام

(ن م راشد کی نظم "انتقام" سے متاثر ہوکر)

اس کا گھر، اور اسکی رہ گذر یاد آتے ہیں
اک زنانہ جسم ابتک یاد ہے
اور ریشمی کوٹ میں لپٹا بدن
لان پر سبزہ تھا اور سبزہ پہ لان
تھی یہی جاڑوں کی رُت
دیدۂ شلوار پہ ہنستے رہوئے!
اسطبل میں دل سے ارمانوں کا شور
اور کنواری لڑکیوں کی بے حسی پہ خشمگیں
جسم کے پوشیدہ گلیاروں میں گُم
اک پرانی عاشقی کی یادگار
تالیوں سے ٹھوکنے پر جسکے ہنستا ہے جہاں
جنس میں مردوں سے تنگ
اس کا گھر، اور اسکی رہگذر یاد آتے ہیں
ایک ریشمی کوٹ میں لپٹا بدن
اک زنانہ کا بدن
جس کو میں سمجھا تھا کچھ نکلا وہ کچھ
میرے ہونٹوں نے لیا تب رات بھر
جس سے اپنی تشنگی کی بے بسی کا انتقام
وہ زنانہ جسم ابتک یاد ہے!

کبابی

(ن م راشد کی نظم "شرابی" سے متاثر ہو کر)

آج میں پتّوں کو چاٹ آیا ہوں
دیکھ کر سیخیں مجھے شعلہ بداماں ہو گئیں!
چاٹ کر دو کان کے پتّے تمام
شکر کر اے خاکِ رب
اس حماقت پر کوئی نادم ہو میں نادم نہیں،
ورنہ اک سیخ کباب ناتواں
کیا بجھا سکتی تھی میرے پیٹ کی دوزخ کی آگ!
صبح سڑ جاتی نہ وہ
رات کھا جاتا جو میں
سیخ نرگس کی بجائے
ایک موٹی مچھلی والوں کی دو حلوہ؟
شکر کر اے خاکِ رب
چاٹ کر دو کان کے پتّے تمام
ایک لقمہ بھی ہضم کرنے کے میں قابل نہیں!

سنترہ کی موت

حسین زندگی کی ایک دھندلی رہگذار میں
کھڑی ہوئی ہیں بستیاں، لباس کے فریب میں
اور ہوتے ہوئے جا رہی ہیں چاندنی کے دوش پر
نگاہِ چشمِ مست پر غبارِ زندگی کا زنگ
ہے جلترنگ
اُدھر سے آہنی سڑوں میں آ رہی ہے، بے بسی کی گرم گرم سی ہوا
اسی سڑک کی موڑ پر، ہے ایک سنترہ پڑا
مگر کسی کی ٹھوکروں کی زد سے ہے بچک گیا
مسافرِ حیات تھا
اٹھا لو اس غریب کو ——— غریب ہے، غریب ہے، چھٹا ہوا، لٹا ہوا
غبارِ زندگی سے دور ہے پڑا
غموں سے چور چور ہے
کسی کی جنبشِ نظر نے اِس کو ایسا کر دیا
اِسے نگاہ گرم کے تغافلوں سے ہے گلہ
پڑے پڑے وہ سُن رہا ہے زندگی کے قہقہے
اُسی سڑک کی موڑ پر
وہ ہاتھ جس نے توڑ کر گرا دیا اس کو باغ سے
بدل دی اُس کی کائنات
اُفق کی ملگجی شفق کا آج رنگ زرد ہے

ہے چشم مست غمزدہ میں موتیوں کی چادریں
ہیں اشک غم کی چادریں
اور اسکی نرم پھانک میں ہیں رس بھری شکایتیں
آنچل کے رکھدیا جنھیں کسی خرام مست نے
اٹھالو اس غریب کو ——— غریب ہے، غریب ہے
کسی کی ٹھوکروں سے ہے پچک گیا
وہ اُس کے نالہائے غم، سیاہ فضا کے دوش پہ
ہوں جیسے غم کی بدلیاں
حسین زندگی کی ایک دھندلی رہگذار میں
کھڑی ہوئی ہیں مستیاں لباس کے فریب میں

حسن بے بال و پر

پھیل کر بے کراں ہو جائے گی
ایک دن تم دیکھ لینا
اُس تخیل کی ہوس
جو شام کو اُس کے حریم خاص میں
جھانکے ہے اُسکے حسن کو
اور ہو جائے گا افشاں رازِ عشق
ہاں، رازِ عشق
جسکو چھاتی سے لگائے گھومتا رہتا ہوں میں
اِس طرف سے اُس طرف
جیسے بندریا اپنے بچے کو دبائے
باغ میں ڈالی بڈالی
ہر طرف
پھر اگر رسوائیاں
ہوتی رہیں گی اس طرح
تو دیکھ لینا ایک دن
آرزؤں کے دو دڑے
پھوٹ آئیں گے مرے کل جسم پر
اُسوقت اک کھجلی زدہ

کتّے کی صورت میں مجھے
وہ سر جھکائے دُم دبائے
ہر طرف چھپتا ہوا
بھاگتا، رکتا ہوا
سڑکوں پہ مجھکو پائینگے
اُس وقت حالت پر مری
آنسو اگر اُس نے بہائے
اور چشمِ مست کو
رو رو کے اندھا کر لیا
اور پھر مجھ سے کہا
بیکس ترا لکھا ہیں ہوں
تو یاد رکھئے، حشر تک
ایسا کبھی ممکن نہیں
میں بھی نشترِ غمزوں سے تب
ان کو بہت رلواؤں گا
لرزاؤں گا، دہلاؤں گا
جلواؤں گا، خونِ جگر پلواؤں گا
اُس وقت پچھتائیں گے وہ
اور مجھ سے فرمائیں گے وہ
اچھا خدا کا واسطہ
مجھ سے ہوئی بیشک خطا

اور آج سے میں ہوں تری
منکوحہ بیوی کی جگہ
اسوقت دنیا کو یقیں
اس بات پر آجائے گا
ہے عشق میں سچا اثر
اور حُسن ہے بے بال دپر
پھیل کر یہ بیکراں ہو جائیگی

جوانی

چاٹ کر دیوارِ شب
چشمِ آہو کے اشارے دیکھکر
اس طرح دوڑے گی میرے خوں بھرے مژگاں کی آہ
چیل کے ڈر سے کوئی چوہا سڑک پر جس طرح
اِس طرف سے اُس طرف بھاگا کرے
اور پھر چڑھ آئے گا آنکھوں میں تیرے یوں ابھار
جس طرح رمضاں میں ہو پیٹ ملا کا بھرا
پڑا حتیاطاً سحر کو
اونگھتے ہیں دودھ پیکر سو رہے

اور دن میں اسطرح بےچین ہو
جیسے پہلی بار ہو دوشیزہ کوئی حاملہ
اور شب کو درد زہ میں مبتلا ہونے کے بعد
کہہ نہ سکتی ہو کسی سے حالِ دل
کروٹیں لیتی رہے
اِس طرف سے اُس طرف
چاٹ کر دیوارِ شب

زُلف!

چاندنی میں نوحہ خواں ہو جائے گا
اجنبی عورت کا وہ ٹھنڈا پیار
جو مجھے دیتی ہے اکثر رات کو
درس آزادی کے خواب
اور خیابانِ چمن کے لالہ زار
دست غارتگر کی جیسے انگلیاں
زندگی کی خوابگاہوں کے قریب
آہ روبانی ادا کی تازگی
دیو آسا مشتعل قندیل میں
وہ سسکتی سی تمناؤں کے راگ
خوف سے لرزاں نظر آنے لگے
جیسے کوّے کی نزعی کیفیت
یا کسی کے نقرئی بالوں میں کنگھے کا ورم
اس طرح معلوم ہوتا ہے مجھے
فیل پا کا مرض جیسے آنکھ میں
چاندنی میں نوحہ خواں ہو جائے گا

اندھیرا

استخوانِ زندگی کے بند دروازوں کے پاس
آ کے جوڑی اور بخار
رفتہ رفتہ جسم کی کنڈی مرے
اسطرح پر کھٹکھٹاتا ہے کہ میں
دینے لگتا ہوں دہائی موت کو
اور اپنے سر پہ سارا گھر اٹھا لیتا ہوں یوں
جیسے اک مدقوق عورت پیٹ سے
اوّل اوّل دردِ زہ میں مبتلا ہونے کے بعد
پھاڑ دے سارے محلہ کا سکوں
اپنی چیخوں کی نکیلی نوک سے
اور پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد
کپکپی کے دوش پر اچھی طرح چڑھنے کے بعد
اسطرح دیتا ہوں دانتوں سے صدائے کٹ کٹاک
جس طرح ٹیلیگرافر کی نکیلی انگلیاں
کرتی ہیں اسٹیشنوں پہ کٹکٹاک و کٹکٹاک
اور دیتی رہتی ہیں پیہم خبر
اسٹیشنوں پر اس طرف سے اُس طرف
سواری گاڑی چھوڑ دی

تیرے نغمے!

تیرے نغموں کی صدا کان میں اکثر آئی
جھٹپٹے وقت کے سہمے ہوئے سناٹے میں
اسطرح جیسے کسی ریڈیو اسٹیشن پہ
کسی بہکے سے ترقی زدہ شاعر کی صدا
ایک جذبات میں ڈوبا ہوا نغمہ گا دے
اور اُس گائے ہوئے نغمے سے
کوئی آثارِ قدیمہ کا پُرانا شاعر
اسطرح کان میں اُنگلی دے لے
جیسے لیمنٹ کی بوتل میں لگا دے کوئی ڈاٹ
ہاں تری رس بھری انگڑائی میں اکثر میں نے
تیرے بدمست اشاروں کو چھپا دیکھا ہے
جسطرح کوئی ترقی زدہ شاعر کا کلام
اپنے الفاظ کے معنوں میں چھپا رہتا ہے
اور اس ڈر میں ترنم کے نہاں خانوں سے
باہر آتے ہوئے گھبراتا ہے
کہ کہیں کوئی پُرانا شاعر
اعتراضات کا گندہ پانی
ڈال کر اُس کو نہ تر کر ڈالے
اور اُس شعر کی پوشاک کے گُل بوٹوں سے
کسی بگڑے ہوئے مطلب کی نہ بُو آجائے

کہار

شام سے زیست کے کندھوں پہ لٹکتا ہوا داغ
ایک خیالات کے دریا میں رواں
خوابِ خرگوش بنا جاتا ہے زنداں کی طرف
آگ ٹوٹے ہوئے کاشانوں میں لگتی ہی چلی جاتی ہے
اور دیوار پگھلتی ہی چلی جاتی ہے
جس طرح اک سگِ مدقوق کسی نالی میں
جان دیتا ہوا دریا کی طرف بہ نکلے
اور ہو جائے خموش
شام سے زیست کے کندھوں پہ لٹکتا ہوا داغ

سے

متاثر ہو کر

چند ہی روز کی ہے مشق فقط چند ہی روز

فیض احمد فیض

ہمارے دوستوں میں ایک صاحب ہیں انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم اے
بے حد ذہین اور سمجھدار بات چیت میں شائستہ اور معقول ایک مرتبہ کئی سال کے بعد
ملاقات ہوئی تو اتفاق سے ایک روزنامہ کے دفتر میں جسمیں اُس زمانہ میں ہم کام
کرتے تھے۔ بڑی محبت اور خلوص سے ملے۔ برابر کی کرسی پر بیٹھکر باتیں کرنے لگے
مزاج پرسی کے بعد ہم نے پوچھا کہ یہ قطع کیا بنا رکھی ہے؟ کہاں انگریزی بال اور
کہاں یہ صفا چٹ ٹینس لان بلکہ کھوپڑیاں تک نکلی ہوئی، بولے استرا پھروا دیا
ہم نے کہا بیمار ہو گئے تھے؟ بولے نہیں یہ حجام صاحب کی عنایت ہے اور اس کے
ذمہ دار وہی کمبخت ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ پیر میں جو وارنش کا پمپ ہے
اسپر دو کلائی کی نئی گھڑیاں بندھی ہیں، ہمنے کہا خیریت یہ کیا؟ بولے اسکا سلسلہ
بھی سر سے ہے ہم نے کہا یعنی؟ بولے کہ ایک روز بال بنوانے کیلئے حجام کو بلوایا۔
آیا تو بڑے فیشن سے۔ بولا کیسے بال بنیں گے؟ میں نے کہا بھئی انگریزی فوراً
اپنے سر کی ٹوپی اتار کر بولا ایسے بنا دوں، کچھ نہ پوچھئے آگ ہی تو لگ گئی کہا
گھوٹ ڈالے۔ چنانچہ اُس روز سے آج تک سر گھٹواتا ہوں۔ ہم نے کہا اور یہ گھڑیوں کا
کیا معاملہ ہے بولے چلتے وقت میں نے کہا کہ کوئی تین کا وقت ہوگا، اُسپر اپنی
کلائی کی گھڑی دیکھکر بدتمیز بولا کہ آپ کی گھڑی سست ہے اسمیں ساڑھے تین
بجے ہیں اُس روز سے میں نے بجائے ہاتھ کے جوتے پر گھڑی باندھنا شروع کر دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض کی آزاد شاعری کی ایسی ہی کوئی وجہ ہوگی
اور کسی بنئے بقال سے یاران طریقت نے انکے برابر کسی مشاعرہ میں کوئی نظم پڑھوا دی

ہو گی جب سے انھوں نے اس شاعری کو ترک کر کے آزاد شاعری شروع کر دی ہو گی۔ ورنہ فیض خوشگو شاعر ہیں اور اچھے شعر کہتے ہیں آزاد شاعر ہونے پر آپ لیڈر کی تصویریوں کھینچنے لگتے ہیں ۔ نظم کا عنوان ہے "لیڈر" ملاحظہ ہو۔

سالہا سال سے بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے
جسطرح تنکا سمندر میں ہو سرگرم ستیز
جسطرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہات تو ہیں
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہات تو ہیں
تجھکو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھکو منظور ہے یہ ہات قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اب اس نظم کا تخلیقی پس منظر ملاحظہ ہو جو غالباً یہ ہو گا۔
رات کو شاعر نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ پہلے اُسے زنجیروں میں بندھے ہوئے دو ہاتھ دکھائی دیئے، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بغل میں رات کھڑی ہوئی ہے جس کے سخت اور سیہ سینہ میں دو جکڑے ہوئے ہاتھ پیوست

ہورہے جارہے ہیں اور ہاتھ اسکے سینہ میں اسی طرح سرگرم ستیز ہیں جیسے تنکا سمندر میں ہوتا ہے یا تیتری کہسار پر یلغار کرتی ہے اسکے بعد شاعر کو رات کے سنگین اور سیہ سینہ میں گھاؤ دکھائی پڑے اور یہ گھاؤ اس کو نہ صرف رات کے جسم ہی پر نظر آئے بلکہ جسطرف نظر گئی ہر طرف گھاؤ ہی گھاؤ نظر آنے لگے۔ گویا پورا ماحول گھائل تھا اُف کس قدر بھیانک خواب ہوگا خیر خدا خدا کرکے روشنی پھیلی اور دور یہ صبح کی چھاتیوں کے دھڑکنے کی آواز آتی معلوم ہوئی اس کے بعد شاعر خواب ہی کی حالت میں اس جسم سے مخاطب ہوتا ہے جسکے ہاتھ تاریکی میں ظاہر ہوئے تھے اور کہتا ہے کہ اے نہ نظر آنے والے جسم تیرا سرمایہ اور تیری آس یہی ہاتھ ہیں اور فقط ہاتھ ہی ہاتھ ہیں بظاہر تو کوئی اور چیز معلوم نہیں ہوتی لیکن تجھکو اس اندھیرے کا غلبہ غالبًا منظور نہیں اسی وجہ سے تو نے ہاتھ نکال کر ثابت کر دیا کہ اندھیرا سب کچھ چھپا لے مگر تیرے ہاتھ نہیں چھپا سکتا پھر اُسی جسم سے عالم خواب میں کہتا ہے کہ کیا تو ان ہاتھوں کو قلم کر دانا پسند کرتا ہے؟ اس کے بعد خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے تو بے ربط فقرے شاعر کے منہ سے نکلنے لگتے ہیں اس کو مشرق کی کمین گہ میں دھڑکتا ہوا دن نظر آنے لگتا ہے اور وہ آرزو کرنے لگتا ہے کہ رات کی آہنی میت کے تلے دن غریب دب جائے۔ اور اس بھیانک خواب سے شاعر کی آنکھ اُسوقت کھلتی ہے جب شالدیوپی کے اخبار "لیڈر" کا ہاکر زور سے لیڈر کی آواز لگاتا ہے جس سے شاعر جاگ پڑتا ہے، چنانچہ اس نے غالبًا اسی وجہ سے اس نظم کا عنوان "لیڈر" رکھا ہے۔ شاعر فرائیڈ کے کسی خواب سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔

بول

(از فیض احمد فیض)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے شعلوں سے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہو
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہ بول
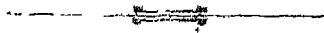
تنہائی

جناب فیض احمد صاحب فیض

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوان میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار
اجنبی خاک نے دھندلا دئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا

چٹخارے
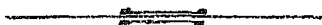
۱- ہائے وہ تیرا پیار
وہ ترا لمبا پیار
جسکی گالوں پر نکھار
آجتک قائم ہے یوں
جسطرح کیچڑ میں ہو
اک فوجی جوتے کا نشاں
اور خشک ہو جانے پہ بھی
قائم رہے، دائم رہے
اس کا نشاں

تیرے رنگیں، رس بھرے
ہونٹوں کا رس میں چوس لوں
کیسے ؟
جیسے چوستے ہیں آم کو
یا زخم کو اور خون کو
وہ جونک جسکی آہ قیمت کچھ نہیں
ننھی سی جونک
منی سی جونک
اور پھر کلی کروں اس شہد خالص کی کہ جو

چوسا ہے تیرے ہونٹ سے
دشمن کی اجلی شرٹ پہ

اور اگر وہ کچھ کہے
تو اسپہ اک دم پل پڑوں
اور دوں ایسا ثبوت
اپنی شجاعت کا کہ تو
اُسکے صلہ میں مجھکو دے
دو چار بوسے گرم گرم
اُس دیگ سے نکلے ہوئے
جس میں اُبلتا ہے شباب
کیسے بوسے؟
جنکے چٹخارے لبوں کے واسطے
آبِ حیات
وجہ نجات
اور حاصلِ عمرِ فنا

گھر اپنے واپس آؤنگا

اک گناہِ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد
۱۶ – اسطرح بھاگوں گا میں تیری نگاہِ گرم سے
جسطرح بندا کوئی گھبرا کر بھاگ جائے
اور دنیا ہکا بکا ہو کے دیکھے کون تھا
اور کچھ نہ چل پائے پتہ
اس رمز کا

دوسرے دن تیری فردوسِ نظر کے سامنے
مسمریزم آنکھ سے رخسار پر گرتا ہوا
جب میں گذروں گا تو کیا
تو جان جائیگی مجھے
پہچان جائیگی مجھے
اور پھر جسکر نوکر کوئی
جسکو پکڑا منگوا دیتیگی
اور باپ سے پٹوا دیتیگی
لگوا دے گی
جو ستے مرے

اچھا تو سُن، لے بیسوا!
اتنا سمجھ لے اُس گھڑی
تو اپنے منہ کی کھائیگی
جب اُس سبھا کے مجمع میں میں
چلّا کے کہہ دوں گا، سُنو
میں تو کسی قابل نہیں
میرا کوئی حاصل نہیں
اُس وقت تیرے باپ کا
چہرہ تو فق ہو جائے گا
اور میں اُچھلتا کودتا
گھر اپنے واپس آؤں گا

اندیشہ

تو نہ جانا کبھی اُس راہ سے ہرگز اے دوست
اس میں پوشیدہ ہیں ارمانوں کے صدہا گرداب
اور کچھ خاک کے ادنےٰ تودے ....
کہیں پرپیچ سی راہوں میں نہ تو کھو جائے
اور پھر مل نہ سکے تیرا پتہ بھی مجھ کو ......
میری گھبرائی ہوئی نظروں .... کو

سُن مرے دوست یہ میری ہی تمنائیں ہیں
ہیں بظاہر تو یہ اک خاک کے ادنےٰ تودے
مگر ان تودوں میں پوشیدہ ہیں ....
سیکڑوں خوف کے مارے طوفاں
جسطرح آرزوئیں دل میں سوسے کوئی
اور خاموش سی گھبرائی نگاہوں سے تجھے
اسطرح دیکھے کہ جیسے کسی گونگے کی نظر
چند گھبرائی ہوئی موجوں کو ساحل کے قریب
سر کے جو آئی ہوں دریا میں کسی کشتی کو غرق
اور یہ جرم چھپانے کے لئے ....
چوسنے آئی ہوں ساحل کے قدم ......
تاکہ آغوش میں لے لے ساحل ....
تو نہ جانا کبھی اس راہ سے ہرگز اے دوست

تنہائی

آج خوابیدہ چراغوں میں ہیں ایوان کھڑے
اور ایوانوں کے پہلو میں ہیں دروازے لگے
رہ گذر اونگھ گئی تیرا تصور کر کے
اجنبی کیف کی آواز میں دھندلا گئے پاؤں
گُل کرو شمعوں کو اور باندھ دو داب گردن زاغ
اور سوئے ہوئے کوئلوں کو اکٹھا کر لو
اور یے خواب بے حقّہ اُسے تازہ کر لو
پھونکنے کون یہاں آئے گا
میرے سُلفے کی چلم
آج خوابیدہ چراغوں میں ہیں ایوان کھڑے

خواب

اُچٹی اُچٹی تری نظروں میں کہیں سازِ الم
کوئی نغمہ نہ مرے سوزِ جگر کا گا دے
اور ترے صبر کے موہوم گلابی بادل
جھک کے دامن پہ مرے اشک فشانی نہ کریں
اور تری مست جوانی پہ تصدق ہو کر
ذرّہ ذرّہ مری محرومی پہ رونے نہ لگے
پھر اُسی خواب میں بھولے ہوئے رازوں کو مرے
طشت از بام نہ یہ مست اشارے کر دیں
روشناس اس غمِ ہستی سے انھیں آہ نہ کر
ان کو بے کیف یونہی رہنے دے
اور مری فطرتِ خاموش محبت کے گلے
تری پازیب کی جھنکار سے یوں کرتی ہے
جیسے سہمے ہوئے ساون میں محبت کی عروس
ہو کے ششدر کسی بہکے ہوئے سنّاٹے میں
ایسے چھپ جائے کہ جیسے کسی خوشبو سے کلی
اپنے دامن کو بچاتے ہوئے کملاتی ہے
اور پھر خواب میں بہکی ہوئی تخئیل تری
اسکے دیدار کو تا عمر ترستی رہ جائے
اور پھر خاک کے ذرّوں میں نگاہیں اسکی
چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہو جائیں
اچٹی اچٹی تری نظروں میں کہیں سازِ الم!!

خدمت

چند مسند کے گدھے
خواجہ سرائے ہستی
اپنی بے کیف وفاؤں کا سہارا لے کر
قوم کے درد سے یوں کانکھ رہے ہیں ہا ہا
جیسے حجرے میں کوئی حاملہ رنڈی تھک کر
بے سُرے پن کو چھپانے کے لئے
کانکھ کر تان کو کر دیتی ہو بند

ناخداؤں کے خدا
جبر یہ باپ بنے بیٹھے ہیں
اور مزدور — بچارے مزدور
جنکے پیٹوں کو یہ سب کاٹ کے یوں لیٹے ہیں
جیسے دریا کے کنارے پہ چوہے
اور اسطرح اڑاتے ہیں یہ عہدوں پہ مزے
جیسے گدھ لاش کو مرحوم گدھے کی نوچیں

چند مسند کے گدھے
ہو کے اعزاز غلامی پہ سوار
شان میں اپنی ہیں اکڑے جیسے
بکرہ خانہ میں چار
اور اشارے سے اسطرح اڑ اٹھتے ہیں
جیسے بقر عید کا بڑھیا بکرا
دیکھ کر چکوے کو ڈر جاتا ہو

چند مسند کے گدھے

چند مسند کے گدھے
قوم کے درد میں دن رات گھُلے جاتے ہیں
آہ! مزدور کی سلگتی آہیں
اُن یتیموں کے وہ گھُٹے نالے
اور وہ بیواؤں کی تیکھی چیخیں
اتنے اونچے پہ پہونچی ہیں پہونچیں گی کبھی
جس جگہ ٹھاٹھ سے مسند پہ یہ سب لوٹتے ہیں
اور ہیں فرش غلامی پہ پڑے
چند مسند کے گدھے

تڑپ

برق آسا ترے رُخسار کو چھُو لینے سے
ہو گیا ہے مرے ہونٹوں کو زکام
اپنی پیشانی کے ہتھوڑوں سے مجھے
اسطرح پر تو بنالے ہے شکار
جسطرح سے کسی بگلے کی نظر مکھی پہ
اور تیری شوخ نگاہوں کی طربناک ہوا
یوں پکارے ہے مجھے رات کے سناٹے میں
گائے سے چھُوٹ کے بچھڑا جیسے
کھیت کی مینڈ سے دیتا ہو صدا
یا کسی عید کے موقع پہ برائے تفریح
کوئی گمراہ ترقی زدہ شاعر شب کو
اختر سی بائی کے بعد اپنا کلامِ عریاں
ریڈیو والوں کے کہنے سے اچانک گادے
اور پھر ریڈیو کے سٹ کی شریفوں کے یہاں
اسطرح سُوئی اُگھاڑے کوئی بوڑھا بڑھ کر
جسطرح کان اُمیٹھے کسی بچے کا بزرگ
منھ سے گالی کے نکل جانے پہ
برق آسا ترے رخسار کے چھو لینے سے!

جواب

تیری باہوں کی گلابی نظریں
گُل کی آغوش میں وا بیٹھی ہیں
جسطرح تیری نگاہوں کے کروڑوں نغمے
میری مفقود سماعت کے نہاں خانوں میں
خوف سے بیٹھے ہوں پردے سے لگے
جیسے جوڑی کو بخار آجائے
اور تری خواب گہ نازکی ننگی دہلیز
اسطرح سامنے آآکے گذر جاتی ہے
جیسے سادھو کوئی جٹ باندھ کے بازاروں سے
سیکڑوں بچوں کے جھرمٹ میں یہ کہتا گذرے
"صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"
تیری باہوں کی گلابی نظریں
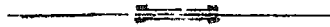
خزاں!

ننگ انسانی کی ڈھلتی چھاؤں میں
نہ سہی جوش و خروش
خیر میدانِ عمل میں تو اتر آئے ہیں
ٹوٹی پھوٹی سی بچی ہڈی
ایسے لڑتے ہیں درندوں کی طرح
آہنی قدموں سے ہیں روندی ہوئی
اور یہ مردہ غلام
ہنس رہے ہیں اور روتے بھی نہیں
پس رہے ہیں اور مرتے بھی نہیں
خیر چلنے دو انھیں
کون ہیں تم نے انھیں پہچانا؟
یہ ہیں سب مل کے بغاوت کا نشاں
ننگ انسانی کی ڈھلتی چھاؤں میں

نغمہ

تیرے جذبات کے طوفان میں ڈوبا ہوا ساز
میری تقدیر کے نغموں کے گلے گاتا ہے
اور میری حسرت و اندوہ کے ٹوٹے موتی
چشم آہو کے خماروں کا پتہ دیتے ہیں
کیا تیری بزم شبستاں سے تڑپتا ہوا سوز
ہولے ہولے مرے کاشانہ میں آجاتا ہے
اور پھر چھوڑ کے آغوش محبت میں مجھے
ڈھونڈنا اور بھٹکتا ہوا کاشانوں میں..........
مسکراتا ہوا ارمانوں پر..................
میرے ناکردہ گناہوں کا پتہ دیتا ہے..........

تیری پازیب کی جھنکار کے روٹھے نغمے
میری بچھڑی ہوئی رنگین امنگوں پہ نثار
تیرے سینہ میں نہاں میری تمناؤں کا راز
یوں شرر افشاں ہے جیسے کہ جہنم کا عذاب
اپنے مخمور تغافل سے نہ کہنا ہرگز
آہ اس کو مرے اس غم کا پتہ مت دینا
تیرے جذبات کے طوفان میں ڈوبا ہوا ساز

نیفہ سرکا کے نیل ریشمی شلوار میں ڈال؟

مخمور جالندھری

مخمور جالندھری

مخمور بالکل ترقی پسند ہے۔ سماج کی گہرائیوں سے بھی کچھ نیچے اتر گیا ہے
ایک ترقی پسند شاعر کو صحیح معنوں میں جن چیزوں سے متاثر ہونا چاہئے مخمور انھیں
میں مخمور اور مدہوش ہے۔ رجعت پسند شعرا قدرتی مناظر۔ محبوب کے خدوخال
چال ڈھال اور عشوہ سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں مگر مخمور خالص جنس لطیف کی ان
چیزوں سے متاثر ہے جن کو اس کے نزدیک فردوس کے میووں کی منزلت
حاصل ہے جب وہ جنس لطیف کی عریانی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے تو اس کا ہر
شعر آرٹ بن جاتا ہے۔ اس کی جلوہ گاہ میں آپ کو یہ "ادبی جواہر ریزے" جگہ جگہ
پڑے ہوئے ملیں گے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کو بجنسہ لکھکر دوسروں کو
بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کی نظم "عورت کو کپڑے پہنتے دیکھکر" اسکے لطیف جذبات
کا شاہکار ہے۔

شاعر کا قیام ایک کمرہ میں ہے۔ پاس ہی ایک گھر ہے جسمیں کوئی دوشیزہ رہتی ہے
ایک دن وہ اپنی تہذیب کی ساری پہنے نل کے نیچے بیٹھ جاتی ہے اور نہانا
شروع کر دیتی ہے۔ ساری بھیگ کر جسم میں جب تک جاتی ہے اور وہ نیم عریاں
نظر آنے لگتی ہے۔ جس کمرہ میں شاعر رہتا ہے اسکے دروازے دوشیزہ کے مکان
کے صحن کی طرف کھلتے ہیں جہاں سے روز صبح وہ مکان کی ہر چیز کو دیکھتا
رہتا ہے۔ ایک روز لڑکی کو نہاتا دیکھکر شاعر غیر معمولی طور پر متاثر ہو گیا اور
اُس نے خوشی میں آکر یہ نظم کہہ ڈالی۔ شاعر کو اُس کا نیم عریاں سینہ میووں کا
ایک خوان نظر آتا ہے۔ اگر ان میووں میں سیبوں کی تخصیص کر دی گئی ہوتی تو

زیادہ مناسب تھا۔ بہرحال لڑکی نے اپنی بھیگی ساری اُتاری، بدن پوچھا، اور قدآدم آئینہ کے قریب آکر اپنی صورت دیکھنے لگی۔ شاعر کو جو دوپڑے کمرہ کے کواڑوں کی آڑ سے مسمریزم کی مشق کر رہا تھا اس کے جسم کا عکس شیشے پر رقصاں نظر آنے لگا۔ اُس نے کپڑے بدلنا شروع کئے، پہلے مونگیا رنگ کی انگیا پہنی اور جوانی کے جوش میں انگیا کے بند اس قدر کس کر باندھے کہ شاعر کا دل دہل گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی انگیا کے بند شاعر کے سینے پر کس دیئے ہیں۔ اب تک جن رس بھرے میووں کو وہ دیکھ رہا تھا انگیا کس دینے سے جب اسمیں خلل واقع ہوا تو اس نے گھبرا کر کہا کہ اِس دار میووں کو ابھی مت چھپاؤ ورنہ میری مخمور آنکھیں اُن کے نظارے سے محروم ہوجائیں گی مگر جب وہ نہ مانی تو کہتا ہے کہ کیا اس خوان کی نمایش تجھے منظور نہیں ہے اور کیا محض راہ گیروں سے داد دوشیزگی لینے کے لئے تو نے انھیں عریاں کیا تھا لیجئے کمر سے اُوپر کے حصے کا کُل لباس اُسنے پہن لیا۔ اور وہ اپنے الجھے ہوئے بالوں کو کنگھی سے سلجھانے لگی۔ اُدھر شاعر کو اختلاج اور الجھن شروع ہوگئی اور اُسے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر چوٹی نہ باندھ لے اور وہ بکھری ہوئی زلفوں کے منظر سے محروم ہوجائے مگر وہ نہ مانی غالبًا اس نے چوٹی باندھ ہی لی۔ یا ممکن ہے کہ جوڑا کس لیا ہو بہرحال اسی درمیان میں "ترقی پسند شعرا" کا ایک بھولا بھٹکا "کوا" دوشیزہ کے مکان کی کھڑکی پر آبیٹھا جس سے لڑکی قدرے جھجک گئی۔ اس چیز نے شاعر کو سخت غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اور اس کا مفہوم اس نے یہ لیا کہ لڑکی اُس کی طرف ملتفت ہے ورنہ ایک ادنیٰ "کوے" سے جھجکنا اور اسکی مستقل مسمریزم کی مشق سے نہ جھجکنا کیا معنے؟ ضرور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ شاعر کو "کوے" پر ترجیح دی گئی

اس کے بعد ہی لڑکی نے جو چست قمیص زیب تن کی تو اس سے شاعر کے فردوسی رس بھرے میوے بالکل باہر نکلنے پر آمادہ ہو گئے اور شاعر کی جملہ ہمدردیاں اُس بٹن کے ساتھ ہو گئیں جو اُسکی قمیص کو کسے ہوئے تھا اور اُس کو یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں بیچارہ بٹن ٹوٹ کر اپنی جگہ سے علیحدہ نہ ہو جائے مگر کے اُوپر کے لباس سے فراغت پانے کے بعد اب نیچے آئیے۔ اپنے شلوار پہنی غلطی سے یا علانیہ شاعر کو بتانے کے لئے تاکہ وہ اس حصہ سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکے شلوار پہن کر لڑکی نے شلوار کے نیفے کو سرکا کر شلوار میں بل ڈال لئے جس نے شاعر کی غلط فہمی اور بڑھا دی، بد نصیب یہ سمجھا کہ وہ آئیوالی دشواریوں اور عشق کی صعوبتوں سے آگاہ کر کے اُسے یہ بتانا چاہتی ہے کہ ہفت خوان کی پر پیچ منزل تک پہونچنے میں اُسے کیسے کیسے سخت مصائب برداشت کرنا ہونگے۔ اور محمور صاحب کو اس سوچ میں ڈال دیا کہ معلوم نہیں اُن کو منزل مقصود تک پہونچنے میں کامیابی بھی ہو گی یا نہیں اسکے بعد محمور صاحب کی فرمائش ہوئی کہ فردوسی میووں کو بادل کے غلاف میں نہ چھپایا جائے مگر جب لڑکی نے محمور کی اس فرمائش کو بھی ٹھکرا دیا تو وہ تمدن کو گالیاں دینے پر اُتر آئے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ایسی "حسین" چیز کو لباس میں چھپانا تمدن کا ظلم ہے۔ بہر حال پھر حکم ہوتا ہے کہ اچھا اب ذرا اس لباس کو زیب تن کر کے گھر سے اٹھلاتی ہوئی نکلو کیونکہ آنکھوں کا نظارہ بھیجنے سے راہ میں پڑا انتظار کر رہا ہے۔

محمور صاحب کی شاعری کا تخلیقی پس منظر اسی قسم کا ہوتا ہے۔ آپ کی دوسری نظم "میرے مجرے" ہے۔

ایک عورت کو کپڑے بدلتے دیکھکر

(از مخمور جالندھری)

نیم عریاں ہی نہا کر تو چلی آئی ہے
رس بھرے میووں سے لبریز ہے فردوس تیری
صاف آئینے میں رقصاں ہے ترا عکسِ جمیل

مونگیا رنگ کی انگیا پہ گرہ کس کے نہ دے
کیا نمائش نہیں منظور تجھے جوبن کی
رہرووں سے نہیں تو چاہتی کیا دادِ نگاہ؟
سمجھا سمجھا ہیں تری فطرتِ چالاک کے داؤ
تیری خواہش ہے تری سب سے بڑی خواہش ہے
دیکھنے والوں کو دوشیزہ نظر آئے تو

بار بار آئینہ میں زلف کے سلجھاؤ نہ دیکھ
تو نہیں جانتی کیا گیسوئے مشکیں کی لٹیں
بکھری بکھری ہی نگاہوں پہ ستم ڈھاتی ہیں

خوف سے کیوں تو سمٹتی ہے جو کوئی کوّا
تیری کھڑکی پہ بھٹکتا ہوا آ بیٹھا ہے
گو اکیلی ہے تجھے پھر بھی حیا آتی ہے

جانے کیا بات ہے؟ تجھ سے نہیں پردہ کوئی
میں کہ کھڑکی میں ہے ہر روز تجھے جھانکتا ہوں

چپٹا جاتا ہے ترے جسم سے یوں تیرا قمیص
ڈر ہے شانے نہ بٹن توڑ کے عریاں ہو جائیں
نیفہ سرکا کے نہ بل ریشمی شلوار میں ڈال
ڈر رہا ہوں میں کہیں یہ ترا مطلب تو نہیں
کہ مجھے منزل مقصد کے پہونچنے کے لئے
اتنے پر پیچ مراحل سے گذرنا ہوگا

کیوں نگاہیں نہیں ہٹتیں تری آئینہ سے
کیوں تجھے شک ہے دلاویز نہیں تیرا لباس
مجھ سے پوچھے تو یہی بات کہوں گا تجھ سے
مرصنو پاش پہ سجتا نہیں بادل کا غلاف

اس تمدن نے بڑا ظلم کیا ہے تجھ پر
ہر حسین شے پہ ضروری تو نہ تھی قید حجاب
خیر ہنستی ہوئی اٹھلاتی ہوئی گھر سے نکل
آنکھیں تجھنے کو ہیں بیتاب ترے رستوں میں

میرے معجزے

(از مخمور جالندھری)

تجھے یوں عشق کا اعجاز دکھایا میں نے

بھر دیا آگ سے لبریز تری سانسوں کو
بھر دیا برق کی لہروں سے ترے ہونٹوں کو
جسم میں تیرے حسیں لوچ سموئے میں نے
فتنے اعضائے جواں میں ترے بوئے میں نے
چال میں تیرے کیا رقص بھنور کا پیدا
نرم سا ڈال دیا تیری کمر میں جھولا
تیرے گالوں کے گڑھے پاٹ دیئے شعلوں سے
ساغر آنکھوں کے بھی چھلکا دیے حسیں نغموں سے
تیری سانسوں کو دیا تیز نئے دھاروں کا بہاؤ
قد رعنا کو عطا کر دیا شیشم کا تناؤ
گفتگو میں تری رس گھول دیا پھولوں کا
تیرے نغموں کو دیا ساز رواں جھرنوں کا
پہلے تھا شانۂ بلور ترا ایک چٹان
اب ہے دو تازہ بگولوں کی جواں عمر اٹھان
رکھ دیئے تیری نگاہوں میں اشارے میں نے
قافلے پلکوں پہ مستی کے اتارے میں نے

بند دل میں رکے طوفان کے سب توڑ دیئے
سینے میں قید امنگوں کے ہرن چھوڑ دیئے
تیرے سینے کو سمٹنے کے دیئے رنگ ایسے
خوف سے دل میں ہوں دبکے ہوئے آہو جیسے
تجھے انگڑائی سے اظہارِ تمنّا بخشا
نیچی نظروں کو دھڑکنا بھی سکھایا میں نے
اپنے قابل تجھے اس طرح بنایا میں نے
گیت رگ رگ میں تری چھیڑ دیئے ساون کے
بھر دیئے خوشبو سے کٹورے یہ ترے جوبن کے
کھینچ کر تیرے لبوں تک ترا دل لے آیا
تیرے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کو بھی گرمایا
تیری آغوش کی فردوس کا در کھولدیا
نرم باہوں کو تری حلقۂ زنجیر کیا

ساری

کیا تری ساری کا آنچل اور ہٹ سکتا نہیں
اور ترے سینے کا وہ رنگیں اُبھار
سامنے میرے نکھر سکتا نہیں
دے رہا ہے دیر سے جو
میری لاغر انگلیوں کو ہاتھ کی
شوخیوں کی دعوتیں

اک ذرا اپنی نگاہِ گرم سے
یلب آسا نور کے ٹکڑوں کو پھر
اس طرح جھنجلا کے جنبش دے ذرا
جسطرح ہوں سیب پتوں میں چھپے
اور ہوا کا سخت جھونکا زور سے
ان کو پختہ اور پکا دیکھکر
اپنی لاغر انگلیوں سے چھیڑ دے
اور مجھ سے یوں بگڑ کر تو کھنچے
جسطرح نیچے جھکا کر کوئی ڈال
دفعتاً ہاتھوں سے اپنے چھوڑ دیں

خواب میں

دیکھ جمپر کا بٹن تیرے کھلا جاتا ہے
اور رس دار جنوں خیز جوانی تیری
میری شرمائی نگاہوں میں کھبی جاتی ہے
آہ! دو تیز نگاہیں مری گھبرائی ہوئی
تیری زلفوں کی گھٹاؤں میں نہ گم ہو جائیں
اور پھر اُنکی جدائی میں مرا دیدۂ تر
خون رو رو کے کہیں حشر نہ برپا کر دے

اپنی رفتار کی شوخی سے اشارہ کردو
کہ وہ ان ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے نہ کرے
کیوں کہ ان ٹکڑوں میں پوشیدہ ہیں
میری مرحوم تمناؤں کے داغ
جن سے اٹھیں گے ہزاروں طوفاں
اور ترے کوچے سے کچھ خاک کے ذرّے لیکر
اسطرح اُن کو اُچھالیں گے زمانے بھر میں
جسطرح آندھیاں صحراؤں میں
ریگ کے ڈھیر اڑا دیتی ہیں
آہ! پھر ہاتھ نہ ملتا ہے دوست
دیکھ جمپر کا بٹن تیرے کھلا جاتا ہے

شبستاں کے قریب

شب کے سناٹے میں تیری خوابگاہِ ناز سے
کچھ دور اٹھلاتا ہوا
میں دیکھتا ہوں
اک گدھا

ہاں
اک گدھا
خالص
گدھا
بالکل
گدھا
سچ مچ کا اک ٹکڑا
گدھا
معصومیت کا بادشاہ
مظلومیت کا ناخدا
خرمستوں سے کنیاتا
تیرے محل کو دیکھتا
کچھ جھجکتا کچھ رینگتا
گردن کو کچھ موڑے ہوئے
کل رسیاں توڑے ہوئے

کب سے کھڑا ہے منتظر
تجھکو نہیں اس کی خبر
تونے کبھی دیکھا بھی ہے
اور یہ کبھی سوچا بھی ہے
کیسے کھڑا رہتا ہے یہ
کسکی نظر کا صید ہے
کیا راز ہے کیا بھید ہے
تجھکو نہیں معلوم مگر
مجھکو ہے سب اسکی خبر
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا
تیرے حریم قلب کو
ہرگز نہ میں لرزاؤں گا
دہلاؤں گا تھرّاؤں گا
جانے بھی دے جانے بھی دے
اُس بات کو
اُس رات کو
جب میں نے دیکھا تھا گدھا
خرمستوں کی چھاؤں میں
تیری شبستاں کے قریب

لیکن غسلخانہ میں ہیں
خاموش دروازہ بند کر بیٹھکر
یہ سوچ کر اکثر ہنسا
یہ حُسن بھی کیا چیز ہے
اک عشق کی دہلیز ہے
مانگے ہے جس کو کل جہاں
جس سے نہ دنیا بچ سکی
کیا جانور کیا آدمی
سب ہی کو ہے اسکی لگن
خرمستیاں [illegible] کرتے ہیں سب
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا
لرزاؤں گا دہلاؤں گا
یعنی کہ تیرے حُسن پر
گدھے بھی ہیں مچلے ہوئے
تیری شبستاں کے قریب

کھڑا رہنے دے!

کھڑا رہنے دے اسکی خوابگاہِ ناز کے آگے
ستونِ آرزو ہوں
اور نشانِ رنگ و بو ہوں میں
مری خاموشیوں کی آڑ میں کچھ آرزوئیں ہیں
جنھیں اے دوست تری مست آنکھوں نے نہ پہچانا
نہ جانا آہ تو نے آجتک ان کو نہیں جانا
کھڑا رہنے دے اسکی خوابگاہِ ناز کے آگے
میں اُس کے ایک پوشیدہ خزانہ کا بھکاری ہوں
کہ جسکی کیف آور موج میں جنت کے نقشے ہیں
نہ راہیں آجتک مجھکو ملیں اُس آستانہ کی
کہ جسکی لذتوں میں چھپ رہی ہیں میری فردوسیں
نہ مجھکو اب ستا اے حسرتوں کے بانٹنے والے
کھڑا رہنے دے اسکی خوابگاہِ ناز کے آگے

چھوڑ دے تنہا ہمیں

حُسن والوں سے شہا
اس سمت آ
اور جلد آ
تو مجھکو دیکھ
اور اُن کو دیکھ
اور ہاتھ میں لے میرا دامانِ حیات
اور رحمتوں کو حکم دے نازل نہ ہوں مجھ پر کبھی
کیونکہ میں ہوں اک مریض
حُسن و خواہش کا حریص
حُسن کیسا؟
جسپہ دوزخ کے حوادث ہوں نثار
اور مچی ہو ہر طرف کو "آ گہار
بھیجدو اُسکو مری آغوش میں
اور چھوڑ دو اک بند کمرے میں ہمیں
اچھی طرح سے
ہو کے آسودہ تمناؤں کے ساتھ
لوں انتقام اُس حُسن سے
جسنے کر رکھا آجتک
دُور اُن لذّات سے

جو وقف تھیں سب کے لئے
لیکن فقط تیرے لئے
تجھے اُن کے سب در وا نہ تھے بند

اّبا کی اسمیں کیا خطا
امّاں کی اسمیں کیا خطا
میری سراسر تھی خطا
کیوں چھپ رہا
اب دیر میں پہونچا تو کیا
اچھا اڑانے دے مزا
اور چھوڑ دے تنہا ہمیں
ہاں چھوڑ دے تنہا ہمیں
اور کنڈی دے لگا
اندر سے بھی باہر سے بھی
باہر سے بھی بھیتر سے بھی
تا خوب سے کرلیں مزے
ان حُسن والوں سے ذرا
اِس چند روزہ زندگی کی آڑمیں

سہمی جوانی

مچلتی اور ننگی بدلیوں میں
چلے جاتے ہیں بادل مسکراتے
ہجوم زندگی کی سرخ انگیا
بہت گھبرا رہی ہے زندگی سے
خمیدہ اور رتیلی مسکراہٹ
تری نظر دل کو لوری دے رہی ہے
تری سوئی ہوئی خوابوں کی دنیا
نہاں خانوں میں اسکے آج گم ہے
نہیں اٹھتا عروس زندگی سے
تری اُف مدبھری آنکھوں کا کاجل
محبت کی جوانی سو رہی ہے
ترے جمپر کے کونے کے بغل میں
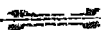
دباؤ

اپنے رنگیں ازاربند سے تو
میرے سازِ خموش کو مت چھیڑ
تیری لہرائی مدبھری زلفیں
میرے جذباتِ عشق کیا جانیں
جن سے آباد ہے ترا سینہ
وہ مرا سوز و ساز کیا سمجھے
ہاں مری بے زبان خاموشی
تجھکو تنہائیوں میں چھیڑیگی
اور شرما کے دونوں ہاتھوں سے تو
بھینچ لیوے گی آہ وہ سینہ
جس سے ملنے کے واسطے مرے ہاتھ
چٹکیاں رات دن بجاتے ہیں
اور ہر وقت دھڑکنوں کے بغل
اسی بے راگنی کو گاتے ہیں
تو نہ آئے گی کیا نہ آئے گی
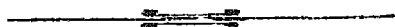
گناہ!

ہاں گناہ اور کروں گا اب تو
کسی للچائی جوانی کی بغل میں جا کر
بیسوا اینٹھی ہوئی جھانک رہی ہے مجھکو
میری بیدار جواں ٹانگوں کو
تیری بیباکی پہ ہنستی ہے جوانی میری
تو سمجھتی ہے کہ میں ریجھ گیا ہوں تجھپر
تیری اس روندی ہوئی لاش کو روندیں گے ہزار
پھر بھی آئے گا نہ کمبخت ترے دل کو قرار
مفلسی مجھکو پریشان کئے ہے ورنہ
میں کچل کر ترا بھرتا ہی بنا ڈالوں گا

زندگی کی کروٹ

چمن سکوں کی سے لے رہا ہے
ننھی ننھی کروٹیں
نگارِ کوہ میں تھا اک نحیف چشمہ سو رہا
کھلی جو آنکھ اُبل پڑا، روش کے خوابِ ناز پر
تخیّلِ کی بساط پر
اِدھر نحیف سی نَس اڑی پروں کو تولتی
ہر ایک قید و بندگی رکاوٹوں کو توڑتی
ردائے گرم گرم میں چھپا ہوا تھا اک خروش
ہو جیسے مد بھرا ہوا کسی کی چشم مست میں
لہما لہما کے چل پڑی فضائے خوشگوار میں
بہار کے کنار میں
اور اُسکے نرم بازوؤں کے گیسوؤں کے سائے میں
خرد کا ایک پاسباں
مگر وہ ایک منزلِ ستم زدہ لپیٹ میں
نہ جانے کیسے گر پڑی
اٹھا پھر اک خروشِ غم
کہ جس میں اسکی زیست کا چھپا ہوا تھا زیر و بم
تو پھر تمام فرش پر وفورِ غم سے شور کا ڈھلک گیا

تڑپ گیا، مچل گیا
مگر قضا کے دوش پر لدے ہیں ذلتوں کے داغ
کہ جیسے آج سوگ میں ہیں جو گھٹیں اُداس اُداس
مگر ابھی تلک یہ راز کسی پہ بھی نہ کھل سکا
چمن سکوں کی لے رہا ہے
ننھی ننھی کروٹیں
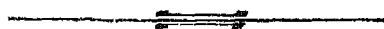
بیتے زمانہ کی یاد

وہ ملنسار سی شلوار تری ٹانگوں پر
خیر مقدم کو مرے وہ ترے سینہ کا ابھار
اور ڈھلکتا ہوا ساری کا وہ آنچل ہر دم
دعوتیں دیتا ہوا میری نظر کو پیہم
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
تیرے جمپر کا وہ رنگین بٹن
کتنا ایثار پسند ——— ایک مجسّم ایثار
قمقمے نور کے پوشیدہ کئے دونوں طرف
اور شدّت سے وہ کھنچتا ہوا انگیا کا تناؤ
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
سرخرو گالوں پہ ہنستا ہوا غازہ تیرا
اور ترے لب پہ لپ اسٹک کی وہ باریک لکیر
تری آنکھوں کا گرد گیر خمار
تیری باہوں کی وہ کمزور گرفت

دعوتیں دیتا ہوا تیرا خرام
یاد آتا ہے مجھے

تیرے غمزوں کا سبک گام فریب
تیری انگڑائی کی بل کھائی ہوئی ایک لہر
لوٹتی رہتی ہے اب تک جو مرے سینہ پر
برق آسا لبِ لعلیں پہ مچلتا ہوا جھوٹ
ریشمی وعدوں کی رنگین رداؤں پہ سوار
آخری بار ملاقات کے وقت
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
شعلہ آسا ترے کوچہ کا دہکتا پتھر
سیکڑوں جس پہ طلبگار پڑے لوٹتے تھے
اور تری راہ کے کتے جنہیں رپٹاتے ہوئے
دور۔ دور۔ آہ بہت دور بھگا آتے تھے
بارہا میں بھی رہا ہوں ان میں
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
اک جواں رات کا سین

تیرے کوچہ میں وہ یلغار، ہجوم اور ریلا
اور پھر سنگیہ گروہ
تیرِ مژگاں کا ترے ناوک چارج
اک الٹا کسی بھگدڑ ترے متوالوں میں
گرتے پڑتے ہوئے عشاق کا غل
اور ترا حکم ــــــــــ "بندرن"
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
ہو کے مایوس مرا فوج میں بھرتی ہونا
اور یہ سن کے ترا خوش ہونا
شکر میں اس کے نمازیں پڑھنا
اور کہنا ــــــــ "کہ چلو خوب ہوا"
اچھا چھٹکارا ملا
اور پھر بن کے جمعدار مرا گھر آنا
اور پھر جانا ترے کوچہ میں
پانا دروازوں کو بند
نیند سے قبل بڑی دیر تلک
یاد آتا ہے مجھے

پتّی

ڈھل رہی تھی دوپہر
جیسے حسینوں کا شباب
ضو پاشیاں کرنے کے بعد
ڈھلنے لگے !
ناگہاں کانوں میں آئی اک صدا
نغمہ ریز و نغمہ بار
میرا احساسِ خفی بیدار یوں ہونے لگا
جس طرح برسات میں بنجر زمیں سے اُگ پڑیں گھاس اور پھول
یا شجر سے نیم کے
میٹھی میٹھی پتیاں !

کیا کہا؟ .... یہ پتیاں میٹھی نہیں؟
سچ ہے اے ہمدم!
تیرے ذائقے کا پتہ بالکل نہیں
جس کو تو کڑوی سمجھتا ہے وہ ہے ایسی مٹھاس
جو کسی معشوق کے ہونٹوں میں مل سکتی نہیں !
زندگی بھر تو انہیں چوسے تو کیا !

ہاں تو تھا ذکر صدائے دلنواز
لاؤ جھانکوں تو ذرا
دیکھوں یہ آخر کون ہے
ہیں! یہ تو اک نٹنی ہے جو
انداز سے اور ناز سے
اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
گاتی ہے کچھ ہنستی ہے کچھ

اے مہ لقا، اے مہ جبیں
تجھ کو قسم اُس جسم کی
اور اس میں جو کچھ ہے چھپا
وہ الجھی یا ہو وہی

تجھ سے مری درخواست ہے
ٹوٹے ہوئے مجروح دل کی ایک یہ آواز ہے
جنتا کی تو اک فرد ہے
میں بھی اُسی کا رکن ہوں
تو اور میں چاہیں تو کر دیں انقلاب

گر ایک رات
کرلے بسر تو میرے ساتھ

تو حرج ہی کیا، کچھ نہیں
کوئی دیکھے گا نہیں اور کوئی جانے گا نہیں
اور کوئی جانے گا بھی تو کیا ہوا؟
صبح جب ہوگی تو ہم نکلیں گے باہر اسطرح
جسطرح نکلے تھے جڑواں کوئی
دور کہیں سے لوٹ کر
رات ہم نے اس طرح کی ہے بسر
جسطرح کرتے تھے ہم
اپنی جوانی میں بسر

اب نہیں وہ دور جب چھپ چھپ کے تم
شب کے سناٹے میں جاتے تھے کہیں
آگیا اب انقلاب،
انقلاب اے انقلاب

پیغامات

کچھ آزاد نظم کے متعلق

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی

دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور بدلتی رہے گی لیکن کچھ ذوقی اور وجدانی چیزیں ایسی ہیں جن میں اگر تغیر ہوتا بھی ہے تو اتنی سست رفتار سے کہ صدیوں تک اس کا احساس نہیں ہوتا۔ گلاب کا تختہ اور بلبل کا نغمہ آج بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا آج سے سیکڑوں برس پہلے تھا۔ اب اگر کوئی شخص اس دلکشی کی قدامت سے بیزار ہو کر طے کرے کہ میں آج سے دستور کے پھول کو دیکھ کر وجد کیا کروں گا اور کوے کی کائیں کائیں سن کر جھومنے لگوں گا تو اس فیصلے میں جدت ضرور ہوگی۔ مگر یہ جدت "خشکہ با آگندہ بروزہ" والی جدت ہوگی۔ آزاد نظم کے وکیل آج کل اسی قسم کی جدت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے انوکھے خیالات کے اظہار کے لئے وہ لفظ اور محاورے، وہ صرف و نحو کے قاعدے، وہ فصاحت و بلاغت کے معیار، وہ بحروں اور وزنوں کے پیمانے جو صدیوں سے استعمال ہوتے چلے آتے ہیں، کام نہیں دیتے۔ اس دعوے میں اگر کچھ اصلیت ہوتی تو یہ ناگہانی، قلب ماہیت یا تاریخی تسلسل کے انقطاع کی ایک عدیم النظیر مثال ہوتی۔ مگر آزاد نظمیں خود اس دعوے کی تکذیب کرتی ہیں۔ ان میں کچھ فرسودہ خیالات ہیں، کچھ سوفیانہ جذبات ہیں جن میں اجنبی اسلوبوں، بے محل لفظوں، بھونڈی تشبیہوں اور رکیک استعاروں سے ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بحروں کے استعمال سے ایک بے ڈھنگا پن آ جاتا ہے۔ اسی ابہام کی بدولت اسے قدامت پسند

ذہنیت سے بالاتر بتایا جاتا ہے اور اسی بے ڈھنگے پن کو جدت طرازی قرار دیا جاتا ہے
حقیقت یہ ہے کہ آزاد ناظموں کو نہ زبان پر عبور ہے نہ نظم کی قدرت ہے
آزادی اور جدت کے پردے ان کمزوریوں کو چھپا نہیں سکتے۔ مشاق سخنوروں کا
ذکر نہیں معمولی ناظم بھی ہر آزاد نظم کو، بشرطیکہ وہ محض آزاد نہ ہو، موزوں
مقفیٰ نظم میں آسانی سے تبدیل کر سکتا ہے۔ وزن اور قافیے کی اصولی بحثوں کو
چھوڑ دیئے، حقیقی شاعروں کے عملی تجربوں پر نظر کیجئے۔ اکبر کی اصلاحی شاعری
چکبست کی سیاسی شاعری، جوش کی انقلابی شاعری اور اقبال کی فلسفیانہ شاعری
میں کیسے کیسے جدید خیال کیسے کیسے حسین انداز سے ادا کئے گئے اور وزن قافیہ
اظہار خیال میں کبھی حائل نہ ہوا۔ یہ آزاد ناظم کون سے عرش کے تارے توڑ کر
لاتے ہیں جو موزوں مقفیٰ نظم کے جامے میں نہیں سماتے؟

اردو کے بعض مخلص بہی خواہ اس بے لگام شاعری کو دنیائے ادب میں
ایک تباہ کن فتنہ سمجھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فتنہ تو ضرور ہے مگر تباہ کن
نہیں ہے۔ چوپٹ والوں کے لٹکے اور چنا جور گرم والوں کی بانیاں سن کر محظوظ
ہونے والے ہمیشہ موجود رہا کیے مگر حقیقی شاعری کو ان سے کیا نقصان پہنچا؟
ڈفالیوں کے رباتے اور کہاروں کے ہڑک ہمیشہ بجتے رہے مگر ان سے ستار اور طبلے
کی مقبولیت پر کیا اثر پڑا؟ دھوبی اپنے برہے اور کنجڑے اپنے "خیال" ہمیشہ گایا
کیے مگر ان سے ہندوستانی موسیقی کا کیا بگڑا؟ آزاد نظم زبان پر ناکافی عبور،
صوتی آہنگ کے ناقص احساس، اور شعریت کے نا تربیت یافتہ مذاق کے مجموعی
اثر کی پیداوار ہے۔ دل کی دنیا جو شاعری کی قلمرو ہے آزاد نظم کا وہاں گزر نہیں۔
وہ زبان سے نکلتی ہے اور کانوں تک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ نہ از دل خیزد، نہ
بر دل ریزد۔

آزاد نظم کی کل کائنات اُس کی جدّت ہے اور جدّت کو ثبات کہاں؟ جو عمارت صرف جدّت کے ستونوں پر کھڑی ہو اُس کا انجام ظاہر ہے کہ اِدھر جدّت رخصت ہوئی اُدھر وہ عمارت زمین پر آرہی۔ ایسی بودی اور پھُسپھُسی نظم میں کیا دم ہے کہ وہ ہماری شاعری کے فطری ارتقا کا رُخ موڑ کر اُسے پھر ابتدائی منزلوں کی طرف پلٹا دے۔

آزاد شاعری — کدھر؟

از مولانا نیاز فتحپوری

یوں، اگر ہم کسی سے سوال کریں کہ آزاد شاعری کے متعلق جناب کا کیا خیال ہے تو وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا کیونکہ لفظ آزاد کا جو مفہوم ہمارے سیاسی اثر پذیری نے پیدا کر دیا ہے اس پر کسی کو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا اور اس سے منسوب ہونے کے بعد ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اول اول جب میں نے "آزاد شاعری" کا ذکر سنا تو میں نے بھی اس کا مفہوم کچھ ایسا ہی قرار دیا تھا جیسے آزاد سیاست آزاد تجارت، آزاد صحافت وغیرہ، لیکن جب میری نگاہ سے اس شاعری کے بعض نمونے گزرے، تو میں ان میں سے بعض کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

شاعری میں آزادی کا کوئی مفہوم اگر قابل قبول ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ قدماء کی تقلید ترک کر کے اسلوب بیان، تشبیہ و استعارات، مطالب و معانی میں جدت سے کام لیا جائے، لیکن ہمارے بعض نوجوان شاعروں نے "آزاد شاعری" کا مفہوم وہی قرار دیا ہے جسے ہم اپنی زبان میں بے لگام، دریدہ دہن غیر ذمہ دار، اور منہ پھٹ کے الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

ایسی شاعری کرنے والوں کا نصب العین جو کچھ ہو لیکن ہمیں اس میں صرف دو باتیں نظر آتی ہیں، ایک یہ کہ جو دل میں آئے اسے بے پس و پیش کہہ ڈالنا اور جب کہنے پر آنا تو یہ ضرور دیکھنا کہ ہمارا اسلوب بیان کیا ہے، گویا آزاد شاعری کا مقصود و مدار، ان کے نزدیک صرف ناگفتنی باتوں کا اظہار ہے اور وزن کے لحاظ سے بے نیاز [illegible] گیت گانا جسے ہم نظم تو یقیناً نہیں کہہ سکتے اور نثر کہتے اسلئے

ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقعی نثر نگاری کا یہی اسلوب کہیں قائم ہو گیا تو پھر ہمارے لٹریچر کا خدا حافظ ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ "ترقی پسند لٹریچر" اس نوع کی شاعری کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ ناروا بدعت واقعی اس کے حدود سے باہر نہیں تو پھر۔

الوداع اے صبر و تقویٰ الوداع اے عقل و ہوش!

نئی شاعری

(مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر انقلاب لاہور)
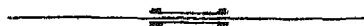
بعض جدید شعراء نے آج کل عروض سے بے نیاز ہو کر جو شاعری اختیار کر رکھی ہے۔ اس پر ہمارا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس شاعری کے کوئی اصول قواعد نہیں ہیں۔ یہ طرز تخیل اور یہ انداز نظم کبھی مقبول عام نہیں ہو سکتا اس لئے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس جدید شاعری کو موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تجدید اور تجدد کا مخالف نہیں ہوں لیکن تخیل ہو یا عروض دونوں میں حد معین سے تجاوز کرنے والے کو اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنے ملک کے مجموعی کلچر کو کسی حالت میں نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ورنہ اہل ملک کا ذوق ایسی بے سرو پا تخیلات کو رد کر دے گا اور اس جدید شاعری کو رواج حاصل نہ ہو گا تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اپنی ادبی مساعی کو رائگاں کر دینا بے حد دردناک ہے۔

ہمیں اس جدید شاعری کی حوصلہ شکنی کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا چاہئے اور فرقت صاحب نے جو حربہ اختیار کیا ہے وہ سب دوسرے حربوں سے زیادہ موثر ہے۔

آزاد شاعری

(مسٹر شوکت تھانوی)

میں اُس غلام دور میں پیدا ہوا ہوں کہ آزادی کا کوئی تصوّر اُس غلام
گردش میں سما ہی نہیں سکتا جس کو عرف عام میں دماغ کہتے ہیں خصوصًا وہ
آزادی جو سیاسی طور پر تو حاصل نہ ہو سکے مگر اتفاقاً فنی طور پر حاصل کرنے کی
کوشش کی جائے۔ اسی قسم کا جو عنصر آج کل ادب اور شاعری پر اُتارا جا رہا ہے
اس کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے باوصف میں قاصر ہوں اور صرف اتنا سمجھ
سکا ہوں کہ آزاد شاعری۔ دورِ جدید کا وہ تقاضا ہے جس کو سمجھنے سے پہلے
سمجھانے کی کوشش ہمارے بعض "سمجھناک" شاعر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ
اب وہ وقت نہیں ہے کہ طول طویل مثنویاں اور مسدس لکھے جائیں۔ نہ ہمارے
پاس اب اتنی فرصتیں ہیں کہ نظموں اور غزلوں کے مقررہ اوزان اور پیمانوں
سے سر کھپایا جائے۔ سچ پوچھئے تو یہ راز اب سمجھ میں آ چکا ہے کہ شاعری فی الحقیقت
شغل بیکاری ہے۔ اور بیکار وقت آج کل کے بیروزگاروں کے پاس بھلا
کہاں ممکن ہے لہذا وہ اپنی فرصت کے معیار پر شاعری کو بھی لے آئے ہیں
ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی کو صرف ایک منٹ فرصت کا ملتا ہے اور وہ ایک منٹ
والا مصرع کہہ لیتا ہے کہ ع

اے حسینہ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا ضرور

پھر کبھی نصف منٹ کا وقت ملا لہذا نصف منٹ والا مصرع کہہ لیا۔ ع

تو کہاں جا کے چھپے

پھر کبھی چوتھائی منٹ، ملا اور مصرع ہوا۔ ۴

آنکھ سے دُور

اسی طرح وقت کی مقدار کے مطابق نظم مرتب ہو کر کچھ یوں ہو جاتی ہے کہ :-

اے حسینہ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا ضرور

تو جہاں جا کے چھپے

آنکھ سے دور

اس کی پرواز نظر کے بھی ہر امکان سے دُور

اور اگر

تو نے وہاں سے بھی کھسکنا چاہا

تو ترے سر کی قسم

میں بھی کھسک جاؤں گا

اپنے ادراک سے دُور

اس قدر دُور کہ تو مجھ سے قریں ہو جائے

پھر جدا کر نہ سکے

اپنے دریچہ سے کبھی

سُرخ آندھی کے تھپیڑوں سے بھی کچھ ہو نہ سکے

وہ بھی ناکام رہیں

تو بھی ہنسے

ہم بھی ہنسیں

جیسے دونوں کے دانتوں میں نظر آئے فتور

اے حسینہ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا ضرور

ترقی پسند ادب

(ابن صاحب سلونوی)

نیا ادب اور ترقی پسندی کی ابتدا کیسے ہوئی یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ تجربہ کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں پہلے اُسے سُن لیجئے، انتہائی بے ادبی کا نام نیا ادب اور تمام بے اصولیوں کو ترقی پسندی کہتے ہیں۔

نئے ادب کے حلقہ میں ترقی پسندی کے ماتحت رہنے والوں کے خیال سے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایک لڑکا اپنے باپ کے وجود ہی سے دلچسپی لے اور ایک باپ ہمیشہ لڑکے کو لڑکا ہی سمجھتا رہے۔ اس دور ترقی میں ہر نظریہ کو اسی اعتبار سے بدل جانا چاہئے اور ہر حیثیت سے لوگوں کو منکر ہو جانا چاہئے خواہ وہ سورج کی طرح روشن ہو۔ یہی دلیل ترقی پسندی ہے۔

عورت اس دور میں آزادی چاہتی ہے تاکہ شعبۂ حیات میں مردوں کے دوش بدوش وہ بھی اپنی زندگی کا ثبوت دے سکے یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن نیا ادب جس "دین" کی تبلیغ کر رہا ہے اس کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ عورت خود ایک زندگی کی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو ہمیشہ بے نقاب ہونا چاہئے تاکہ سارا عالم اس عریانی سے لطف اندوز ہو۔ اس کی آزادی پابندی کی حد سے بالاتر ہے اگر اس کی راہ میں اس کی عصمت بھی حارج ہو تو اسے ٹھکرا دینا چاہئے۔

ظاہر ہے ایسی جگہ شعر کو موزونیت سے اور ادب کو اخلاق سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے جہاں بے اصولی ہی کو اصول کہا جاتا ہو اور بے عنوانیاں حسن رنگین عنوان ہوں ایسے ادب اور ایسی ترقی پسند شاعری کو کہیں گہرائی میں دفن کر دینا چاہئے۔

آزاد نظم

جناب افسر میرٹھی

آزاد نظم اصل میں ترجمہ ہے (FREE VERSE) کا، انگریزی میں فری ورس کا رواج ایک مدت سے ہے لیکن اوّل تو انگلستان کے باشندوں کی طبائع اس قسم کی نظموں سے مانوس ہیں دوسرے وہاں اخلاق کی پستی کو کبھی ادبیات عالیہ میں راہ پانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ہمارے یہاں کچھ ابتدا ہی سے رنگ بگڑ گیا، یہاں ترقی پسند شاعری اخلاق اور مذہب، خدا اور رسول سب کے خلاف شمشیر برہنہ ہو کر نمودار ہوئی۔

ہر ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور زندگی میں جو انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں وہ ہمیشہ ادب میں جگہ پاتے ہیں، اس طرح اگر زندگی ترقی پسند ہے تو ادب بھی ترقی پسند رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ ادب میں ہمیشہ نئی نئی راہیں نکلتی رہتی ہیں۔ اخلاق و کردار کی بلندی ہمیشہ شعر و ادب کے پیش نظر رہی ہے، اگر ادبیات ہی کو ہم فواحش کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنالیں تو پھر اصلاح اخلاق و کردار کا کیا ذریعہ باقی رہ جائے گا۔

پھر یہ بھی کوئی نئی چیز تو نہیں ہے جعفر زٹلی، جرکین، جان صاحب نے کیا کسر چھوڑ دی تھی جس کو جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل کے جدید علم بردار پیش فرمانے کی تکلیف گوارا کر رہے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ قدیم زمانے کے فحش نگاران مزخرفات کو فخر و مباہات کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

میرے نزدیک ترقی پسند شعراء کو انکے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ انکی تحریروں کا کوئی اثر زبان پر نہیں پڑے گا زبان ایک سمندر ہے اس کے پانی کو تھوڑی بہت گندگی خراب نہ کرسکے گی۔

آزاد شاعر

از پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے

پروفیسر کنہیا لال کپور نے ادب لطیف میں جو بیج بوئے تھے وہ حضرت غلام احمد فرقت کی آبیاری سے اس مجموعے میں مع برگ و بار نمودار ہوئے ہیں۔ اس لئے دو گھڑی دل بہلانے کی غرض سے اس کے چھتنار اور گھنیرے سائے میں بیٹھنا ہر ادیب پر فرض ہے۔ البتہ یہ دھڑکا ضرور لگا رہے گا کہ کہیں اس ظریفانہ خوشہ چینی کے سلسلے میں جدید اُردو شاعری کے وہ رطب تازہ بھی نہ اڑا دئے جائیں جن کا باقی رہنا اُردو کے نمو کے لئے ضروری ہے یا محض ضد میں وہ سڑے گلے پھل نہ مطبوع طبائع بن جائیں جن کا دفن کر دینا ہی زبان و ادب کے صحت اور وقار کیلئے لازمی ہے۔

بہر نوع وہ صاحبان ذوق و نظر جن کے کام و دہن صرف ترقی پسندانہ شاعری سے لذت یاب ہونے کے عادی بن چکے ہیں حضرت فرقت کے اس نئے "سلاد" میں بھی بہت کچھ "سواد" پائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ "نئی قدروں" پر ان کی قدرت کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھیں گے۔

شعر میں موزونیت کی اہمیت

ماخوذ از "ہماری شاعری"

مصنفہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اردو
لکھنؤ یونیورسٹی

کلام کے موزوں ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے جن کو ادا کرتے وقت آواز میں ایک خوبصورت تسلسل یا ترنم پیدا ہو جائے اور جن میں باہم ایک لذت بخش تناسب اور توازن ہو۔ عروض کی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ موزوں کلام وہ ہے جس کے حرفوں کی حرکتوں اور سکونوں کی ترتیب میں ایسا نظام ہو اور ان حرکتوں اور سکونوں کی تعداد اور مقدار میں ایسا تناسب ہو کہ اس نظام اور تناسب کے ادراک سے نفس کو ایک خاص طرح کی لذت حاصل ہو۔ اس لذت کا احساس انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اسی فطری احساس پر غور کرنے اور اس کا استقرا اور تجزیہ کرنے سے وہ اوزان دریافت ہوئے جن کی مطابقت سے کلام میں موزونیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان وزنوں کے نام اور پیمانے عروض کی کتابوں میں دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن اصول موزونیت کے ماتحت شعر کے نئے اوزان دریافت کرنے کا امکان اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

لفظوں کا وہ مجموعہ جس میں موزونیت کی صفت پائی جائے مصرع کہلاتا ہے۔ اور مصرعوں کا وہ مجموعہ جس میں فکری تسلسل یا معنوی ربط پایا جائے "نظم" کہلاتا ہے یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ مصرعوں کی انفرادی موزونیت اور چیز ہے اور نظم کی مجموعی موزونیت اور چیز ہے۔ مصرعے کی موزونیت یہ ہے کہ وہ کسی عروضی وزن کے مطابق ہو

اور نظم کی موزونیت یہ ہے کہ اُس کے مصرعوں میں باہم تناسب اور توازن ہو۔ اس کے لئے مصرعوں کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ کلام کی ایک ہیئت معین ہو جائے۔ اس ہیئت کے وجود کا علم یا اُس کی تکرار نظم کی موزونیت کے احساس کے لئے ضروری ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ اُس ہیئت کا تصور یا تو پہلے سے ذہن میں موجود ہو یا اُس کی تکرار سے ذہن اُس کا تصور پیدا کرے۔ دونوں صورتوں میں نظم کی ہیئت کا ذہنی تصور اور اُس (نظم) کی واقعی ہیئت ان دو چیزوں کی مطابقت سے نظم کی موزونیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس احساس سے کلام میں وہ دلکشی پیدا ہوتی ہے جو موزونیت کے ساتھ فطرتاً وابستہ ہے۔ نظم کی ہیئت معین کرنے اور اُس ہیئت کو محسوس کرنے میں قافیہ بہت مدد دیتا ہے اور ردیف اُس ہیئت کو اور واضح کر دیتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شعر کے لئے موزونیت ضروری نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ خیالات نثر میں بھی ادا ہو سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کہے کہ سائنس کے مسائل نظم میں بھی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں قولوں میں صداقت کا عنصر غالباً برابر نکلے گا۔ لیکن یہاں اس سے بحث نہیں کہ کیا ہو سکتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہوتا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

جس طرح یہ ایک بدیہی بات ہے کہ علمی مسائل کی تفصیلی بحث کے لئے وزن کی قید سے نظم کا دامن تنگ ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ شعر کا اثر نثر کی نامحدود وسعت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وزن کی پابندیاں شعر کے اثر کو قوی کر دیتی ہیں۔ انسان کی فطرت خود بتاتی ہے کہ شاعرانہ خیالات کا اظہار یا خیالات کا شاعرانہ اظہار اپنی تکمیل کے لئے نظم کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہے۔ اور انسان کے گہرے جذبات فطرتاً موزونیت اور موسیقیت کے ساتھ ظاہر ہونا چاہتے ہیں۔ اس نکتے کو سمجھنا ہو تو کسی بیٹے کی موت پر

ماں کے بین سنو کسی سحر بیان مقرر کی پر جوش تقریر پر غور کرو۔ نثر کی وہ عبارتیں پڑھو جن میں جذبات کا زور شور دکھایا گیا ہے۔

لفظوں کو نظم کی صورت میں ترتیب دینا کلام میں اثر یعنی جذبات کو متحرک کرنے کی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ "دنیا کے واقعات دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں جو کچھ آج ہو رہا ہے یہی بارہا ہو چکا ہے" تو اس کلام سے دل ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا لیکن اگر اسی بات کو نظم کی صورت میں یوں ادا کریں سے

دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں دنیا کے واقعات
جو آج ہو رہا ہے یہی بارہا ہوا (صفی)

تو دل پر ایک خاص طرح کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ موزونیت سے کلام میں اثر پیدا ہوتا تو مسلم ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی کلام میں کوئی ایسی بات ہو جو موزونیت کے اثر کو زائل کر دے۔ مثلاً سے

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا ہے
لیچے کو کھڑا کیا کھڑا ہے

یہ کلام بھی موزوں ہے مگر اس میں اثر نہیں۔

جب یہ مسلم ہے کہ موزونیت سے کلام میں جذبات کو متحرک کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، تو شاعری جس کا مقصد ہی جذبات کا اظہار اور احساسات کا اشتعال ہے، اُس کے لئے پیرایۂ نظم کا فطری ہونا کسی دلیل اور بحث کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔ موزونیت سے شعر کے حسن اور اثر میں جو اضافہ ہو جاتا ہے اُس کا اندازہ کرنا ہو تو کسی اچھے شعر کی نثر کیجئے اور دیکھئے کہ اُس میں وہی اثر باقی رہا جو اصل شعر میں تھا اور کسی شعر کی نثر کرنے کے معنی یہی تو ہیں کہ موزونیت کی ضرورت سے لفظوں کی نظمی یا اصولی ترتیب میں جو فرق کرنا پڑا تھا وہ دور کر دیا جائے۔ شعر کی نثر کرنے کے بعد یعنی لفظوں کی ترتیب درست ہو جانے پر کلام کے اثر کا کم ہو جانا اور نظم کی حالت میں

ترتیب الفاظ ناقص ہونے کے باوجود اثر کا بڑھ جانا! یہ کیوں؟ اسی لئے تو کہ موزونیت نے نہ صرف بے ترتیبی کے عیب کی تلافی کر دی بلکہ اس سے بڑھ کر کلام کے اثر میں اضافہ کر دیا۔ اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعقید لفظی یعنی جملے کے لفظوں کی صحیح ترتیب میں خلل پڑ جانا کلام کا ایک نمایاں عیب ہے۔ لیکن نظم میں یہ عیب ایک حد تک محسوس ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً نثر کے دو فقرے ہیں "یہ جور کے خیال" اور "اب زمین سے وہ شکوے ہیں"۔ اگر لفظوں کی ترتیب بدل کر یوں کہیں "خیال جور کے یہ" اور "زمین سے اب ہیں وہ شکوے" تو یہ فقرے سماعت پر بار ہوتے ہیں لیکن یہی فقرے جب نظم میں آ جاتے ہیں تو تعقید کا احساس تک نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

خیال جور کے یہ گردش جہاں سے نہ تھے

زمیں سے اب ہیں وہ شکوے جو آسماں سے نہ تھے

نظم کی دل نشینی یوں بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ نثر سے کہیں جلد یاد ہو جاتی ہے اور کہیں دیر تک یاد رہتی ہے۔ اُن نظموں کا ذکر نہیں جن میں خیال کی ندرت یا طرز ادا کی دلکشی سے حافظے کو مدد پہنچتی ہے۔ ایسی نظمیں بھی آسانی سے یاد ہو جاتی ہیں جن کو نثر سے ممتاز کرنے والی چیز موزونیت اور صرف موزونیت ہوتی ہے جب ہماری قوت حافظہ جب کسی چیز سے رم کرتی ہے تو نظم ہی کے منتر سے اُس کو رام کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان پر جن مسلمان خاندانوں نے حکومت کی اُن کے نام تاریخی ترتیب کے ساتھ یاد رکھنا بچوں کے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن اس بیت کے یاد کر لینے میں ذہن کو کوئی دقت نہیں ہوتی ؎

غزنی و غوری ہوئے اور بعد ازاں آئے غلام

خلجی، تغلق، سید و لودی، مغل پر اختتام

اسی طرح آسمانی بُرجوں کے نام ترتیب کے ساتھ بچوں کا کیا ذکر بوڑھوں کو بھی یاد

نہیں رہتے لیکن یہ قطعہ ایک دفعہ یاد ہو جائے تو پھر کبھی نہیں بھولتا ؎

برجہا دیدم کہ از مشرق بر آوردند سر
جملہ در تسبیح و در تہلیل حق لا یموت

چوں حمل، چوں ثور، چوں جوزا و سرطان و اسد
سنبلہ، میزان و عقرب، قوس و جدی و دلو و حوت

بے معنی کلام کا یاد رکھنا بہت مشکل ہے لیکن نظم کی مدد سے یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ بیت کس کو یاد نہ ہو گی ؎

ڈوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں

ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موزونیت کو ہمارے دل کے ساتھ کوئی خاص لگاؤ ہے۔ اور اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شعر کے لئے موزونیت نہ کوئی رسمی چیز ہے نہ اتفاقی۔ بلکہ شاعری کی حقیقت اور مقصد دونوں کا مقتضا یہی ہے کہ شعر نظم کے لباس میں ظاہر ہو۔ دنیا کی تمام زبانوں میں شعر نے نظم ہی کی صورت اختیار کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاعرانہ خیالات کے اظہار کا فطری ذریعہ نظم ہے۔

اس سلسلے میں قافیے اور ردیف کے متعلق چند لفظ کہنا خلاف محل نہ ہوگا۔ نظم کی صورت یا ہیئت کو واضح کرنے میں قافیے اور ردیف سے جو فائدہ پہنچتا ہے اُس کا ذکر اوپر ہو چکا۔ یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ کلام کی شعریت کو ان سے کیا مدد ملتی ہے۔ اگر یہ چیزیں وزن کی طرح شعر کے عناصر میں شمار نہیں ہو سکتیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جن چیزوں سے شاعری ساحری بن جاتی ہے اُن میں قافیے اور ردیف کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ بدیہیات کے لئے دلیل کی حاجت نہیں صرف ایک مثال پیش کی جاتی

تنقیدی مضامین

تعارف

(مسٹر صباح الدین عمر ایم، اے)

غلام احمد صاحب فرقتؔ بی اے میرے بڑے مخلص دوست ہیں جن سے سال بھر میں چھ مہینے میری لڑائی رہتی ہے۔ نام کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر شاعر معلوم ہوتے ہیں مگر اس کمی کو انھوں نے تخلص سے پورا کر لیا ہے گو اس میں "رجعت پسندی" کی بو آتی ہے۔ جب انکی خانگی زندگی کی تنہائی باقی نہیں رہی تو میں نے اُن سے بہت کچھ کہا کہ وہ اپنا تخلص "وصلؔ" رکھ لیں، مگر وہ کسیطرح اسپر راضی نہیں ہوئے "پتہ نہیں کیوں" شائد اس تخلص میں کچھ "رازہائے سربستہ" ہوں جن کی وجہ سے "وصل" کے بعد بھی "فرقت" کا پہلو موجود ہے لیکن اسپر بحث کرنے کا نہ یہاں موقع ہے نہ اسکی ضرورت۔

فرقتؔ صاحب اُس وقت سے شاعری کر رہے ہیں جب سے انھوں نے فرقتؔ تخلص رکھا ہے لیکن نہ تو کبھی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں، نہ ہر ایک کو اپنا کلام سناتے ہیں۔ اور نہ اپنی نظمیں رسائل و جرائد میں بھیجتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے اپنے "ہفتہ وار پرچہ" "صداقت" میں اپنی قومی نظمیں شائع کرنا شروع کی تھیں مگر وہ پرچہ بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ نظمیں بھی۔ اگر وہ چاہتے تو اُن متعدد جرائد میں جن میں وہ کام کرتے تھے آسانی سے کہیں دور گئے بغیر اپنی نظمیں شائع کرتے رہتے مگر انھوں نے یہ بھی نہیں کیا۔ کچھ نظمیں اِدھر اُدھر کبھی کبھار چھپنے کیلئے بھیجدیتے ہیں ورنہ اُن کا سارا مجموعہ اُن کے کپڑوں کے بکس میں رکھا رہتا ہے معلوم نہیں جب انکی اہلیہ محترمہ ان کے گرم کپڑے دھوپ میں رکھنے کے لئے نکالتی ہیں

تو اس مجموعہ کو کبھی دھوپ دکھا دیتی ہیں یا اسکی زبان سے کبھی یہ کہلانا بہتر سمجھا
جاتا ہے کہ ؎ برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

بہرحال جن لوگوں نے فرقت کے اشعار سنے ہیں وہ اُن کی فنّی خوبیوں
سے واقف ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ان کی شاعری میں کتنے جوہر پوشیدہ ہیں
اس کتاب میں فرقت کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں اسلئے
میں انکی صرف ایک آدھ غزل اور نظم سے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں
ارباب نظر کو ان سے کچھ نہ کچھ فرقت کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ہو جائیگا
ان کی غزلوں میں سے صرف تین شعر مجھے یاد ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں ؎

تھے دل کے حوصلے ہستی سے بھی کہیں آگے
جنوں میں پائے طلب ڈگمگا دیئے کس نے؟

دیر پا ہوں حیات کو آواز
زندگی ہے کہ سوئی جاتی ہے

میں دامانِ حوادث پر مچل جاؤں تو کیا ہوگا
غم ہستی سے بھی آگے نکل جاؤں تو کیا ہوگا

فرقت کی ایک نظم کے چند بند جس کا عنوان ہی عزم ملاحظہ ہوں ؎

تری راہ میں سخت کانٹے پڑے تھے مصائب تری راہ روکے کھڑے تھے
ہر اک سمت دشمن کے لشکر پڑے تھے مگر حوصلے تیرے ان سے بڑے تھے
سپاہی مبارک ترا عزم منزل

تو دشمن کو خاک اور خوں میں ملا دے ۔۔ جدھر جائے تو قصر و ایوان ڈھائے
غلامی سے دنیا کا دامن چھڑائے ۔۔ خدا تیری قربانیاں راس لائے
سپاہی مبارک ترا عزم منزل

انکی دوسری نظم جس کا عنوان ہے "سپاہی" اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

سج لے پھر ہتھیار سپاہی ۔ سج لے پھر ہتھیار
دیش کی رکھشا کا تو سہارا ۔۔ بھارت کی جنتا کا دلارا
تیرا جیون سب سے پیارا ۔۔ تو ہے اک سیلاب کا دھارا
کر دے بیڑا پار سپاہی ۔ کر دے بیڑا پار
زور پہ آئی دکھ کی بہیا ۔۔ ڈوب نہ جائے دیس کی نیّا
تو ہی اس نیّا کا کھویّا ۔۔ تو ہی ہے ڈھارس کا دویا
تو ہی کھیون ہار سپاہی ۔ تو ہی کھیون ہار

ہمارے نوجوان ادیبوں اور شعرا پر موجودہ جنگ نے گہرا اثر ڈالا ہے اور بعض حلقوں سے، خصوصاً اُس حلقہ سے جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتا ہے، یہ آواز اب برابر بلند ہو رہی ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شعرا کا فرض ہے کہ وہ قوم میں "انٹی فاشسٹ" جذبہ پھیلانے میں اپنی پوری قوت سے کام لیں۔ فرقت شروع سے اس فرض کو خاموشی سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے موجودہ جنگ کے مختلف پہلوؤں کو اتنی ہی پرجوش نظمیں لکھی ہیں جتنی پُرزور وہ قومی نظمیں کہہ چکے ہیں۔ اِن میں سے بعض فرقت کے نام سے شائع ہو چکی ہیں اور بعض بغیر نام کے۔ ذیل میں انکی دو ایک نظموں کے اقتباسات درج کرتا ہوں۔

وطن کی آبرو کے پاسباں!

وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

تمھاری تیغ کے سایہ میں طوفانوں کی دنیائیں
تمھارے وار سے ممکن نہیں دشمن اماں پائیں
جو تم چاہو تو محکوموں کی تقدیریں بدل جائیں
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

مچلتی ہیں تمھاری جرأتیں تیغوں کی دھاروں میں
تمھاری دھوم ہے انسانیت کے جاں نثاروں میں
تمھاری ہمتوں کے تذکرے ہیں چاند تاروں میں
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

تمدن کے سفینے کا سہارا بن کے آجاؤ
شدائد کے سمندر کا کنارا بن کے آجاؤ
پلٹ دے رخ جو طوفاں کا وہ دھارا بن کے آجاؤ
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

کچل دو، روند دو، ٹھکرا دو ظالم کے ارماں کا
سمندر میں بنا دو مقبرہ دشمن کے طوفاں کا
سفینہ غرق ہونے سے بچا لو نوع انساں کا
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

یہ تو فرقت کی سنجیدہ شاعری تھی، ان کی طنزیہ نظمیں اس مجموعہ میں آپ خود دیکھیں گے۔ ان نظموں کی شان نزول یہ ہے کہ کچھ عرصہ گذرا ایک روز ایک صحبت میں "آزاد شاعری" کے سلسلہ میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے فرقت صاحب سے فرمائش کی کہ وہ ذرا اس طرف بھی متوجہ ہوں۔ فرقت صاحب نے دو ہفتوں میں باوجود اپنی غیر معمولی دفتری مصروفیتوں کے نہ صرف تیس، چالیس نظمیں کہہ ڈالیں، بلکہ احباب کے کہنے سننے سے ایسا مجموعہ تیار کرنے پر آمادہ ہو گئے جس میں خود اُن کی

طنزیہ نظموں کے علاوہ "آزاد شاعری" پر ملک کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں کی آرا شامل ہوں، یہ کام آسان نہ تھا مگر فرقت صاحب نے ایسی مستعدی دکھائی کہ ایک قلیل مدت میں انھیں کافی پیغامات اور بلند پایہ تنقیدی مقالات موصول ہو سکے جنھیں آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت سے نہ "نئے ادب" کی مخالفت مقصود ہے نہ "ترقی پسندی" کی، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ "آزاد شاعری" جس چیز کا نام ہے وہ بقول حضرت نیاز فتحپوری "نہ نظم ہے نہ نثر" اور اس پردہ میں جو لوگ شاعری کرنے لگے ہیں وہ شاعر نہیں اور چاہے جو کچھ ہوں۔

آزاد شاعر اور ان کے ہم خیال اصحاب آزاد شاعری کے جواز میں یہ دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) پرانی اور پابند شاعری میں فرسودہ خیالات، ہجر و فراق کی داستانیں، اور حقائق سے کوسوں دور واقعات نظم کئے جاتے ہیں مگر ہماری شاعری میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں نمایاں کی جاتی ہیں، سماج کے عریاں جلوے پیش کئے جاتے ہیں، ہر چیز کی گہرائیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، کارزار حیات کی تلخیاں اور شیرینیاں واضح کی جاتی ہیں، بورژوا اور پرولتیریت کی طبقاتی کشمکش کو جنتا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، ادب کو زندگی کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے وغیرہ۔

(۲) نہ صرف ردیف اور قافیہ بلکہ مروجہ بحور کی پابندیاں بھی بلند پایہ اور نئے خیالات کی نظم کہنے میں مانع ہیں۔

(۳) ہم کو مروجہ بحور بدل دینے اور نئی بحور وضع کرنے کا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح ہمارے اگلوں کو اُن کے وضع کرنے کا حق تھا۔

(۴) بحور بدل دینے کے بعد آزاد شاعری میں حسن صورت بھی پایا جاتا ہے۔

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ ایک زمانہ میں علی العموم ہجر و فراق کی داستانیں ہی ہماری شاعری کا سرمایہ تھیں لیکن جب حالات بدلنے لگے اور ہندوستانیوں میں ایک نیا شعور پیدا ہونے لگا تو ہماری شاعری میں بھی جنبش ہوئی اور اس میں آزاد، مولوی اسمٰعیل، حالی اور اکبر پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اسکول تک جس پر ہمیشہ لعن طعن رہی کہ اسے معاملہ بندی، الفاظ کے الٹ پھیر اور معشوق کی کنگھی چوٹی کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف خیال نہیں ہوتا، رفتار زمانہ اور وقت کے تقاضوں سے متاثر ہوا اور چکبست وصفی وغیرہ قومی اور اصلاحی نظمیں کہنے لگے۔ ادھر اقبال نے اردو شاعری کے دامن کو فلسفہ و معارف حقائق زندگی اور تمام دیگر بلند و اعلیٰ خیالات سے جن کا تعلق حیات اور جد و جہد حیات سے تھا مالا مال کرنا شروع کر دیا پھر یہ رنگ عام ہو گیا اور ردیف و قافیہ نیز بحور کی پابندیوں کو قبول کرتے ہوئے ہمارے شعراء نئے نئے خیالات پیش کرنے لگے اور نیچرل نظمیں کہنے کے علاوہ ہندوستانی سماج کی کمزوریوں پر ایک پر شکوہ اور چبھتے ہوئے انداز میں روشنی ڈالنے لگے۔ غرض اس پابند شاعری نے جوش ملیح آبادی، ملا لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، روش صدیقی، مجاز، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، جاں نثار اختر، مخدوم، شمس الدین شمیم، علی سردار جعفری، وغیرہ بھی پیدا کئے اور آج ان شعراء کی نظموں کی موجودگی میں پابند شاعری پر یہ الزام لگانا کہ اس میں ابھی تک فرسودہ خیالات پیش کئے جاتے ہیں اور یہ کہہ کر آزاد نظم کا جواز پیش کرنا یقیناً غیر معمولی جرأت کا کام ہے۔

(۲) اگر مروجہ بحور کی پابندیاں نئے رجحانات اور خیالات کو نظم کرنے میں حقیقتاً مانع ہیں تو ضرور انھیں ترک کر دینا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ الزام صحیح ہے؟ اگر یہ واقعہ ہے تو آزاد شاعروں اور ان کے حامیوں کو لازم ہے کہ وہ کوئی ایسی آزاد نظم پیش کریں جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہو کہ ردیف و قافیہ

اور بحور کی پابندی کے ساتھ ایسی نظم نہیں کہی جاسکتی۔ یا کم سے کم نثر ہی میں وہ کوئی خیال پیش کر دیں اور یہ کہیں کہ اس قسم کے خیالات پابند شاعری میں نظم نہیں ہو سکتے اگر ردیف و قافیہ اور مروجہ بحور کی شاعری کرنے والا کوئی شاعر ان خیالات کو پابند شاعری میں نظم نہ کر سکے تو یقیناً آزاد شعراء کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا کہ اردو شاعری کی پابندیاں، وقت کے تقاضوں اور زمانہ کی ضرورتوں کو نظم کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اگر آزاد شاعر اس امتحان کے لئے تیار نہیں ہیں تو انھیں یا ان کے طرفداروں کو "پاکی داماں کی حکایت" بیان کرنے سے پہلے، دامن اور قبا کو دیکھ لینا چاہئے۔

(۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ مروجہ بحور الہامی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں تغیر و تبدل ہو نہ سکے۔ یقیناً ہم کو ان بحور میں تبدیلی کا حق حاصل ہے اور نئی بحور وضع کرنے کا بھی۔ اسی طرح جیسے ہمارے اگلوں نے مروجہ بحور متعین کی تھیں لیکن یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ اگر مروجہ بحور اور مروجہ پابندیاں نئے خیالات کو نظم کا جامہ پہنانے کی اہلیت نہیں رکھتے تو انھیں بدل دیجئے، ان کے ارکان بدل دیجئے اور نئی بحریں وضع کر لیجئے لیکن جب پابندیوں کے باوجود بہتر سے بہتر خیالات نظم ہو سکتے ہیں تو خواہ مخواہ ایسی جدت کیوں کیجئے جس سے نظم کی لطافتیں اور اس کی وہ تمام خوبیاں جو نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہیں ختم ہو جائیں۔

(۴) رہ گیا حسنِ صوت کا مسئلہ۔ آپ کہنے کو ہر آواز کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں "حسن" پایا جاتا ہے۔ آپ کو گدھے کے رینکنے میں بھی "حسنِ صوت" مل سکتا ہے لیکن یہ آپ کی بد مذاقی ہوگی یا خوش مذاقی؟ اگر حسن صوت اسی طرح ہر چیز میں ملنے لگے اور صرف یہی "حسن" شاعری کا معیار قرار دیا جائے تو کوئی نثر کوئی گفتگو، کوئی آواز مثلاً مشین کی گڑگڑاہٹ، بادل کی کڑک، شیر کی دھاڑ،

گدھے کی "ڈھی پوں" گھوڑے کی ہنہناہٹ، کوّے کی کائیں کائیں، غرض ہر چیز میں ترنم اور حُسنِ صوت ملے گا جسکے معنی یہ ہوں گے کہ ہر ایسی آواز میں موسیقی یا شاعری بھی ہے۔

آزاد شاعری کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک مرتبہ مجھ سے ایک صاحب نے جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتے تھے بڑے پتہ کی بات کہدی تھی، انھوں نے کہا کہ ردیف و قافیہ ڈھونڈھنے میں اور دونوں مصرعوں کے ارکان برابر رکھنے یا مروجہ بحور میں شعر کہنے میں بڑی دقت ہوتی ہے مگر "آزاد شاعری" میں یہ دقتیں حائل نہیں ہوتیں اور مزے سے خیالات "نظم" ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بات انھوں نے واقعی بہت معقول کہی اور اصلیت یہی ہے کہ آزاد شاعری محض اس لئے کیجارہی ہے کہ "آزاد شاعر" میں۔ مروجہ پابندیوں اور قیود میں رہ کر شعر کہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

جناب جوش ملیح آبادی نے بمبئی کے ایک جلسہ کی مخالفت میں (جس میں آزاد شاعری کے علاوہ اس امر پر احتجاج کیا گیا تھا کہ جدید شاعری میں عریانیت کی تبلیغ کی جارہی ہے) رسالہ ایشیا پونا (بابت ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء) میں ایک طویل مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے دراصل "عریانیت" اور "الحاد و بیدینی" کے اعتراض کا جواب دینے میں زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ یہاں اس خاص اعتراض اور اس کے جواب پر بحث نہیں ہے البتہ جناب جوش نے ضمناً بلینک ورس (اور نظم معریٰ) پر جس رائے کا اظہار کیا ہے اسکا نقل کرنا یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ جوش صاحب فرماتے ہیں۔

"مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ شاعری ہنوز کھردری ہے "بے جوڑ" غیر مترنم اور ژولیدہ و پیچیدہ ہے۔ تسلیم کرنا پڑیگا کہ آج کل کا نوجوان مجبور اور سخت مجبور ہے کہ وہ بلینک ورس ہی کو اپنے افکار کے اظہار کا آلہ بنائے۔ یہ خطا نوجوانوں کی

نہیں اس کے آبا اور اصول تعلیم کی ہے کہ وہ اپنی مادری زبان پر قدرت نہیں رکھتا اور فارسی سے قطعی بیگانہ ہوتا ہے جس کے بغیر اُردو زبان آ ہی نہیں سکتی۔"

"اس ناواقفیت اور عدم قدرت کے بعد ظاہر ہے کہ اس کے واسطے بلینک ورس کے سوا اور کوئی دوسری صنفِ سخن ہے ہی نہیں جسے وہ اختیار کرے" جناب جوش کی یہ نثر آزاد نظم میں اس طرح پیش کی جا سکتی ہے۔

"مجھے یہ بھی تسلیم ہے
کہ یہ شاعری
ہنوز
کمزور سی ہے
بے جوڑ، غیر مترنم
اور ژولیدہ و پیچیدہ ہے
تسلیم
کرنا پڑے گا
کہ آج کل کا نوجوان
مجبور
اور سخت مجبور ہے
کہ وہ
بلینک ورس ہی کو
اپنے افکار کے اظہار کا آلہ بنائے۔"

یہ ملحوظ رہے کہ جوش صاحب یہ اعتراض "بلینک ورس" پر کر رہے ہیں جس میں مصرعوں کے ارکان برابر ہوتے ہیں، مقررہ بحور ہوتی ہیں۔ صرف

ردیف وقافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی درآنحالیکہ آزاد نظم (FREE VERSE)
میں ردیف وقافیہ سے بے نیازی کے علاوہ بحور سے بھی استغنا برتا جاتا ہے
اور اس کی پروا نہیں کی جاتی کہ ہر مصرع کے ارکان برابر ہیں یا نہیں،
ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی ایک مصرع ایک لفظ پر مشتمل ہوتا ہے جیسے "ایک"
اور کبھی کبھی پوری سطر کا ایک مصرع ہوتا ہے۔ اور یہی وہ اعتراض ہے جو
مروجہ بحور کو رکھنے کے حامی آزاد نظم پر عائد کرتے ہیں۔ آزاد نظم کے پرستار
اپنے ان مخالفین کو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ رجعت پسند ہیں، ان کے دماغ
اس قابل نہیں کہ وہ "ترقی پسندی" کی باریکیوں کو دیکھ سکیں لیکن دیکھنا یہ ہے
کہ وہ جوش ملیح آبادی صاحب کے اس اعتراض پر انھیں کس خطاب سے سرفراز
فرماتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں جوش صاحب نے آگے چل کر یہ فرمایا ہے کہ
"باوجود اس کمزوری کے ہم کو ایسی شاعری کی محض اس لئے مخالفت نہ کرنا چاہئے
کہ وہ ایک جدت ہے بلکہ ایسے شعرا کی ہمت افزائی کرنا چاہئے۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب جوش صاحب ایک چیز کو غلط اور شاعرانہ نااہلی
سے تعبیر کر رہے ہیں تو یہ کیوں فرماتے ہیں کہ پھر بھی اس کی ہمت افزائی کی جائے۔
ایک شخص غلط راستہ پر چل رہا ہو تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اسے ٹوک دیں
کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے؟ آخر ہم یہ توقع کیوں قائم کرلیں کہ جو شخص غلط راستہ پر
چل رہا ہے وہ آگے چل کر صحیح راستہ پر چلنے لگے گا اور منزل مقصود تک پہونچ
جائے گا۔ غلط راستہ پر چلنے والا یقیناً منزل مقصود کو نہیں پا سکتا۔ اب اگر ہم
اسے راہ راست نہیں دکھاتے یا اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو ہم ایک گناہ
سنگین کے مرتکب ہو رہے ہیں جو ناقابل معافی ہے۔

شاعری میں ہر قسم کے قیود اور پابندیوں کو ترک کر دینے کے بعد جو آسانیاں

ایک شخص کو حاصل ہو جاتی ہیں اُس کے مدنظر ہم اس چیز کے متوقع تھے کہ آزاد شاعر جو خیالات پیش کریں گے وہ واقعی ہمارے لئے "بصیرت افروز" ثابت ہونگے وہ ہم کو اپنے سماج کی خرابیوں اور کمزوریوں سے روشناس کرائینگے، ہم کو جدوجہد حیات میں حصہ لینے کی دعوت دیں گے، قوم کو ایک تازہ پیغام عمل دینگے اور ہم میں روح بیداری پیدا کریں گے۔ مگر آزاد شاعری میں ہم یہ چیزیں تو نہیں پاتے البتہ ایسے نمونے بکثرت ملتے ہیں جن میں نہ تو قوم کو کوئی پیغام دیا جاتا ہے نہ زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا جاتا ہے ہاں کسی "عورت کو کپڑے پہنتے دیکھکر" اپنی "جنسی بھوک" کا اظہار، یا انگلستان کی کسی دوشیزہ کو دیکھکر اُسے "چھیڑنے" اور "اکیلی پاکر کبھی نہ چھوڑنے" کا چیلنج ضرور ہوتا ہے یا پھر "فرنگی حاکموں" سے "انتقام" لینے کا یہ انوکھا اور دلچسپ نسخہ پیش کیا جاتا ہے کہ اپنے "ہونٹوں" سے رات بھر کسی برہنہ جسم کے بوسے لیتے رہو (اب یہ "انتقام" حکومت ہند کے ریڈیو ڈپارٹمنٹ میں "ملازمت" کر کے لیا جا رہا ہے) اور یا پھر چند بے ربط اور مہمل فقرے ہوتے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کی آزاد شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کو پڑھئے اور انصاف سے کہئے کہ کیا یہ شاعری اس قابل ہے جس کی تائید اور حمایت میں دوسروں کو جاہل اور رجعت پسند کا خطاب دیدیا جائے۔

۲۔ میراجی کی ایک سطر والی نظم جس کا عنوان ہے "محرومی" اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

میں کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارہ نہ دیکھا تو اس پر تعجب نہیں ہے، نہ ہوگا۔

ازل سے اسی ڈھب کی پابند ہے شام کی نا ہموار [illegible] شوخ ناگن

ابھرتے ہوئے اور لچکتے ہوئے اور اچکتے ہوئے کہتی جاتی ہے۔ آؤ ساتھ دیکھو کہ
میں نے تمہارے لئے ایک رنگین محفل جمائی ہوئی ہے۔
وہ کیا سا ایوان ہے، پراب جس میں پردے گرے ہیں، وہاں پہ جو ہو اُس کو
کوئی نہیں دیکھ سکتا۔
تھیں اس کے پردوں کی ایسے لچکتی چلی جاتی ہیں جیسی پھیلی ہوئی سطح دریا سے
اٹھ کر دھند لکے کی مانند پنہاں کیا ہو فضا کو نظر سے۔
ذرا دیکھو ـــــ چھت پر لٹکے ہوئے فانوس، اپنی ہر اک نیم روشن کرن سے چھپاتے
ہیں اک بھید کی بات کا گیت جس میں سہری سے آغوش کی لرزشیں ہوں۔
ستونوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ رکتا ہوا اور جھجکتا ہوا چور سایہ یہی کہہ رہا ہے
ـــــ وہ آئے، وہ آئے!
ابھی ایک پل میں یونہی جگمگانے لگے گا یہ ایوان یکسر
ہر اک چیز کیسے قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔
میں کہتی ہوں مانو، چلو کیسی محفل سج رہی ہے۔

۳۔ عبد المجید کی نظم "ایک سادہ سوال" صفحہ ۱۴۸ پر ملاحظہ ہو۔

۴۔ راشد کی نظم "انتقام" صفحہ ۱۵۰ پر ملاحظہ ہو۔

اور اگر حقیقی شاعری واقعی یہی ہے تو فرقت صاحب یقیناً اسکے امام
اور مسلم الثبوت استاد ہیں جو دو ہفتوں میں اس رنگ کی پچاس نظمیں کہہ سکتے ہیں
جن میں "ادبی قدریں" ہیں "گہرائیاں" ہیں "جنسی بھوک" ہے "شعور و لاشعور"
ہے "پیٹ کا فلسفہ" ہے "جنتا کی آواز" ہے "بورژوا اور پرولتاریت کی
کشمکش" ہے اور "ادب برائے زندگی" ہے۔
میں پھر کہوں گا کہ اس کہنے سے میرا یا فرقت صاحب کا مقصد ترقی پسند کی

کی مخالفت نہیں ہے۔ دنیا میں کون ایسا شخص ہوگا یا کون ایسا ہوا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ ادب، خیالات، طرزِ معاشرت غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں "ترقی" ہو۔ مگر "ترقی پسندی" کی آڑ میں اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا اپنی خود ستائی کرنا اور اگر کوئی اس کی حمایت نہ کرے تو اُسے جاہل و رجعت پسند کہہ دینا، ادب میں اصلاح کرنے کے بجائے غلط راستہ پر چلنا، اور شاعری نہیں آتی مگر اپنے کو شاعر کہلانا کون سی ترقی پسندی ہے۔ دورِ جدید کے اکثر نوجوان شعرا جو حقیقی معنوں میں "ترقی پسند" ہیں۔ وہ ردیف و قافیہ کی پابندی کرتے ہوئے اردو شاعری کو چار چاند لگا رہے ہیں مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" آزاد شاعری کے نام سے گندی باتیں اور لچر پوچ خیالات، اشعار میں نہیں بلکہ ناموزوں غیر مربوط اور غلط نظم نما نثر میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اگر کسی طرف سے اعتراض ہوتا ہے تو اس کا فوراً جواب یہ ملتا ہے "یہ ترقی پسندی" ہے تم اسے کیا سمجھو۔ ضرورت ہے کہ اردو ادب کو ایسے لوگوں کے بے دردہاتھوں سے پامال ہونے سے بچایا جائے اور انھیں بتایا جائے۔ ع

کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

ایک اصلاحی اقدام

(سید اعظم حسین صاحب اعظم ایڈیٹر روزنامہ سرفراز لکھنؤ)

نظموں کے ذریعے زبان ادب کو ترقی دینا ایک مستحسن فطری کوشش ہے۔ چنانچہ اُردو ادب کا دامن آج سے بہت پہلے بھی نظموں سے خالی نہیں تھا جس زمانے میں غزل کو انتہائی عروج تھا اس زمانے میں بھی مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، شہر آشوب وغیرہ کی شکلوں میں نظم برابر موجود رہی۔ اپنے دور میں نظمیات کی ان شاخوں نے معیاری ترقی حاصل کی۔ اس دور کے بعد مختلف جدید عنوانات کے ماتحت نظمیں معرض وجود میں آنے لگیں۔ محمد حسین آزاد، حالی، شبلی وغیرہ نے ایسی کثیر التعداد نظمیں لکھیں۔ پھر اس شعبے نے اور ترقی کی اور چکبست، اکبر، صفی، اقبال اور جوش کے ایسے صاحبان کمال پیدا ہوئے اور انھوں نے اُردو نظم کو چار چاند لگا دیے نظم کی دنیا میں تنظیم تخیل و سنجیدگی نظر کے لحاظ سے اقبال، اور استعداد شعریت کمال شاعرانہ کے لحاظ سے جوش نے بلند ترین معیار قائم کر دیے ہیں جن تک ہنوز کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا۔ تاہم احسان بن دانش۔ اسرار الحق مجاز ساغر نظامی، اختر شیرانی، آنند نرائن ملا، جاں نثار اختر، شمس الدین شمیم، سردش طباطبائی، وغیرہ ہم اس شاہراہ کو ایک حد تک طے کر چکے ہیں اور ان کے کلام سے روح عصر محفوظ ہوتی ہے۔ اصول ارتقا کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ چکبست، اکبر، اقبال اور جوش کا کارواں گزر چکنے کے بعد کوئی اور بھی عظیم الشان کارواں ضرور گزرے گا۔

لیکن کیا وہ کارواں اس روح و پیکر شاعری سے معرا اگر وہ مشتمل ہوگا

جو اپنے کو ترقی پسند کہنے اور کہلوانے پر خوش ہوتا ہے اور جسے آج کل ریڈیو اور رسالوں کے ذریعے اچھالنے کی بے انتہا کوشش کی جارہی ہے لیکن جو استعداد نہ ہونے کی وجہ سے نعمت پرواز سے محروم ہے۔ کیا آج کل کے موزونیت و مطالب سے بیگانہ شاعری کرنے والے کوئی ایسا درخشاں مستقبل رکھتے ہیں جو انھیں میر، غالب، انیس، اقبال، جوش کی صفِ اولیں میں جگہ دلا سکے؟ ہرگز نہیں۔ ان میں اس کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ ان کو فطرت کی طرف سے ویسا فلسفیانہ دل و دماغ، شاعرانہ طغیانِ احساس اور فن کارانہ سلیقۂ بیان حاصل نہیں ہوا ہے جو شاعر کو غالب و جوش بناتا ہے۔ دراصل عطیۂ فطرت کی اسی قلت کا نتیجہ ہے کہ ان افراد نے مجبور ہو کر ایک "غیر شاعرانہ شاعری" کا سہارا ڈھونڈھا ہے۔ اب یہ اور سوال ہے کہ جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے۔ انسان میں طرح طرح کی کمزوریاں ہوتی ہیں کمزوری کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان اپنے کو شاعر اور بہت اچھا شاعر سمجھنے لگے۔ اعظم گڑھ کے حاجی صاحب اور لکھنؤ کے منطق انفونوی اپنی شاعری سے متعلق کیا کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر اسی مثال کو بڑے پیمانہ پر دیکھنا ہو تو آج کل کے پنجابی رسالوں یا ان کے منظومات کے مجموعوں پر ایک سرسری نظر کر لیجئے۔

اس جدید شاعری کے دو عناصر نمایاں ہیں، ایک عنصر وہ ہے جس میں کہنے والوں کی ساری کوشش یہ ہے ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ایسوں کے میر کارواں میراجی معلوم ہوتے ہیں۔ اس عنصر کا طرۂ امتیاز

مہمل گوئی ہے۔ وافر الفاظ پر مشتمل ناہموار فقرے ہوتے ہیں جن کے مجموعے کو یہ حضرات نظم کہتے ہیں لیکن اگر شاعری کے لئے الفاظ اور معانی کی تنظیم ضروری ہے تو یہ ہرگز نظم نہیں ہوتی بلکہ اُس انتہائی ذہنی انتشار و پراگندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے جو انسان کو آخر کار پاگلوں کی صف میں شامل کردیتی ہے کہا جاتا ہے کہ دیوانے کی دیوانگی میں بھی ایک نظم ہوتا ہے، اس قول کی صداقت اگر کہیں سے ثابت ہوتی ہے تو یہیں سے کہ آج کل کی شاعری کرنے والے بھی اپنی اوّل درجہ کی مہمل گوئی میں خیالات کا تسلسل سمجھتے ہیں!

جدید شاعری کے حامیوں کا یہ ایک عام پروپیگنڈا ہے کہ وہ اپنی اس شاعری کے ذریعے نوع انسانی کو آگے بڑھانے کی جد وجہد کر رہے ہیں گویا ان کے کلام میں دنیا کے موجودہ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام کو منقلب کرکے ایک ایسا بہتر و ارفع نظام قائم کرنے کا پیغام دیا جاتا ہے جس میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کی تفریق باقی نہ رہ جائے اور ساری دنیا یکساں طور پر خوشحالی و آسودگی کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن کیا جدید نظموں میں واقعتاً یہی معیار قائم رکھا جاتا ہے؟ جہاں تک فحش نگاری کا تعلق ہے اس میں ایسے کسی پیغام و معیار کے پیش کئے جانے کا امکان ہی نہیں ہے۔ اب رہ گیا جدید نظموں کا پہلا عنصر یعنی مہمل گوئی سو اس میں بھی کوئی آفاق گیر پیغام نظر نہیں آتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ نظمیں بے معنی ہوکر کیوں رہ جاتیں۔ ان کے بے معنی ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ان کے کہنے والے نظم کا محور صرف اپنی ذات کو قرار دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اُس میں خود اپنے دل و دماغ کی غیر اہم الجھنوں اور پریشانیوں کو بیان کرنیکی کوشش کرتے ہیں یا اپنی ذات سے متعلق غیر ضروری واقعات و خواہشات

وامکانات کو بے ربط و مبہم طریقے سے پیش کرنا چاہتے ہیں مثلاً ایک شخص بخار کی شدت
میں محسوس کرتا ہے کہ اس کا پلنگ اُڑ کر کسی پہاڑ سے ٹکرا گیا جہاں ایک ہُدہُد
کا گھونسلہ تھا جس سے وہ ہُدہُد نکل کر اُس کی مزاج پرسی کو آیا اور پھر دونوں
وہاں سے اُڑ کر قطب مینار پر آ بیٹھے جہاں ایک گرگٹ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا
اور پھر وہ سُرخ گرگٹ اُسے لیکر دریائے جمنا کے اندر گھس گیا جہاں مچھلیوں
نے اُس کے سر میں اصغر علی محمد علی کی دوکان کا تیل لگایا وغیرہ وغیرہ۔ اب
یہ شخص اس پراگندہ خیالی کو نظم قرار دے کر "ادب لطیف" یا "ادبی دنیا"
میں شائع کر دے تو یا فہم دنیا اس کے معانی و مطالب کیونکر سمجھ سکتی ہے۔
غرض ایک تو داخلی و شخصی غیر اہم و ناقابل التفات موضوعات ہونے کی
وجہ سے ان نظموں میں ابہام ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے انداز بیان اور
طریقۂ اظہار میں بھی ژولیدگی و کاواکی ہوتی ہے جسکی وجہ سے ان کی نظمیں
گونگے کا خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔

غزل میں غزل کی ٹکنیک سے ناواقف لوگوں کے لئے ابہام ہوتا ہے
میر کا شعر ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے

ایک بزرگ بیان کرتے تھے کہ ایک انگریز جج کو اسکے مسلمان پیشکار
نے ایک دن میر کا یہ شعر سنایا اور سمجھایا۔ دوسرے دن عدالت میں جج
کسی ملزم کو سزا دے رہا تھا اُسے دفعتہً یہ شعر یاد آیا اور اُس نے پیشکار
سے پوچھا "ول پیشکار وہ کیا بولا تھا۔ ہم تھا، تم تھا، میر تھا اور سب کالی
کوٹھری میں بند تھا" بیچارے انگریز جج نے اس شعر کو سمجھنے کی کوشش کی

لیکن وہ اس سے زیادہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کالی کوٹھری میں بند تھا لیکن جو لوگ غزل کے مسلمات، زبان اور انداز بیان سے واقف ہیں وہ اس شعر کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جدید شاعری والے کہہ سکتے ہیں کہ یہی حال اُنکے کلام کا ہے۔ پہلے اس کی ٹکنیک کو سمجھئے اس کے بعد اُس سے لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن کا یہ کہنا بالکل غلط ہے اس لئے کہ غزل کے جو مسلمات ہیں وہ کسی غزل گو کے انفرادی یا شخصی مفروضات نہیں ہیں بلکہ پورے فارسی و اُردو ادب کے اجتماعی مفروضات ہیں جنھیں اتنی عمومیت و ہمہ گیری حاصل ہے کہ فارسی و اُردو ادب کا ہر طالب علم اُن سے مطلع ہوتا ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ "زلف کے اسیر ہوئے" تو اس کے یہ معنی ہر اُردو داں پر واضح ہو جاتے ہیں کہ "کسی حسین کے عشق میں مبتلا ہوئے" یا مثلاً جب شعر پڑھا جاتا ہے کہ

پہنچتے ہیں اُن تک پہنچ جانے والے\
تہہ تیغ ہو کر، سر دار ہو کر (آرزو)

تو وہ تمام اُردو داں جو تصوف کے معین و مروج نظریات سے واقف ہیں بآسانی سمجھ جاتے ہیں کہ شاعر کہہ رہا ہے کہ جن کو معشوق حقیقی یعنی خدا تک پہنچنے کی لگن لگ جاتی ہے وہ اس کی قربت ضرور حاصل کرتے ہیں خواہ اس دھن میں اُنھیں سرمد، منصور، اور دیگر اولیا کی طرح تہہ تیغ ہونا یا دار پر کھنچنا پڑے۔ اگر جدید شاعری والے اپنی نظموں میں اپنے ذاتی مفروضات کو موضوع و مرکز بیان بنانے کے بجائے دنیا کے مسلمہ نظریوں اور فلسفوں کو موضوع و مرکز بناتے تو اُن پر ہرگز کوئی اعتراض نہ ہوتا مثلاً اگر وہ مارکس یا فرائڈ کے نظریات کا حوالہ دیں تو اس کے لئے اُنکو

کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا بلکہ کوئی اس بنا پر ان کی نظموں کو مبہم بتائے تو یہ اسکی کم علمی ہوگی لیکن جبکہ جدید شعرا ایسا نہیں کرتے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کو اپنی ذات کے غیر اہم و غیر واضح داخلی تصورات میں محدود کر لیا ہو تو پھر اسکے معترض پر کم علمی کا الزام ہرگز نہیں عائد کیا جا سکتا۔ آج کل جدید ادب کے حامیوں کا یہ ایک وطیرہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ہر معترض کو جاہل و کم سواد بنا دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ معترض نے مارکس، لینن، اینجلس، فرائڈ وغیرہ کو پڑھا ہی نہیں ہے لہذا وہ ہماری شاعری کیا سمجھ سکتا ہے مگر یہ اعتراض اُس وقت کہاں حق بجانب رہ جاتا ہے جبکہ یہ شعرا جدید شاعری میں ان مفکرین کی ترجمانی کے بدلے خود اپنے غیر اہم اور مبہم مفروضات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس طرح شاعری کو ناقابل فہم چیستاں بنا دیتے ہیں۔

ہم ادب برائے زندگی کے نظریہ کے مخالف نہیں ہیں اگر اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادب میں زندگی کی نامحدود حقیقتوں کی ترجمانی و نقاشی کی جائے لیکن اگر "ادب برائے زندگی" کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی مہیا کی جائے اور بس، جیسا کہ آج کل کے نام نہاد ترقی پسند ادیب گفتگو میں ظاہر کرتے رہتے ہیں تو ہمیں ایسے "ادب برائے زندگی" کو بحیثیت کلیہ کے منظور کرنے سے قطعاً انکار ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان نے جو مختصر و ناقص زندگی پائی ہے جس کی "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" اس کو کیونکر استعمال کرنا چاہئے کیا اس کا مصرف محض یہی ہے کہ "کھاؤ پیو اور مگن رہو" یا یہ کہ زندگی کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اُسے علوم و فنون کے دائروں کو بڑھاتے رہنے ...... کائنات کے رازہائے سربستہ معلوم کرتے جانے اور اسطرح نوع انسانی کے تمدن میں [illegible]

دور کرنے کی جد و جہد کرتے رہنے کے لئے وقف رکھا جائے۔ ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است

تو معتقد کہ زیستن بہر خوردن است

کھانا محض ذریعہ ہے نہ کہ عین مقصد، زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کھانا ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان محض کھانا کھانے کے لئے زندہ رہے۔ اس کا مقصدِ حیات "ذکر و فکر" کرکے نوع انسانی کے نقائص اور معذوریوں کو گھٹانا ہے اور اُسے ایسی بلند سطح پر لانا ہے جہاں اُس کی حیثیت محفوظ ہو سکے۔

ہمارے قدیم شعراء زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی آج سے کہیں بہتر کرتے تھے۔ شیخ سعدی نے محولۂ بالا شعر میں زندگی کا صحیح معیار پیش کیا ہے سودا کہتے ہیں۔ ؎

سودا اپنے دنیا تو بہر سو کب تک

آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک

حاصل یہی نا کہ، اس سے دنیا ہوئے

بالفرض ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

اسے توکل کا درس کہنا غلط ہے، شاعر کا حساس و باخبر دل انسان کے بنیادی نقص کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اپنے کو اور دوسروں کو متوجہ کرتا ہے کہ اصل سوال تو یہ ہے کہ "تو کب تک" انسان کی یہ ناپائداری یہ بے بسی دُور ہونا چاہئے۔ ساری جد و جہد اسی مقصد کے لئے کرنا چاہئے نہ کہ دنیا کی آسائشوں اور کھانے پینے کے مزے کے لئے اپنے قیمتی اوقات ضائع کرنا چاہئے۔ انسانی زندگی بے شبہ اپنے نقص کی بنا پر ایک ٹریجڈی ہے

آج کل کے سطحی دل و دماغ رکھنے والے اس ٹریجڈی کی سنگینی سے بچنے کے لئے "کھاؤ پیو اور مگن رہو" کے نظریہ کو مختلف طریقوں سے دُہرا رہے ہیں۔ یہ دراصل اُن کی فراریت ہے۔ وہ شاعر و ادیب جو نباض فطرت ہیں جو دردِ انسانیت کی تڑپ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں ہرگز یہ فراریت اختیار نہیں کر سکتے وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور اسلئے وہ "ادب برائے زندگی" کے اُس ناقص نظریہ کو قبول نہیں کر سکتے جو کہ محض شکم پُری اور تن آسانی تک محدود ہے اور جس کے سامنے نوعی ترقی کا کوئی بلند مقصد نہیں ہے۔

بہرحال ہم جدید شعراء کو "ادب برائے زندگی" کے عقیدے سے باز رکھنا نہیں چاہتے۔ انفرادی غیر اہم ذہنی مفروضات کے اظہار کی کوشش سے یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی خاص اجتماعی مقصد کے ماتحت شاعری کریں شرط صرف اتنی ہے کہ شعریت، معنویت، قابل قبول حدودِ نظم اور اخلاقی تعمیر کا ضرور لحاظ رکھیں۔ بقول آرنالڈ شاعری "تنقیدِ حیات" ہے مگر اُن شرائط کے ماتحت جو اس "تنقیدِ حیات" کے لئے "شاعرانہ صداقت" اور "شاعرانہ حسن" کے قوانین نے عائد کر رکھے ہیں یعنی شاعری میں "تنقیدِ حیات" کی جائے مگر لازم ہے کہ وہ "تنقیدِ حیات" شاعرانہ مسلمات اور شاعرانہ محاسن سے خالی نہ ہو اگر شاعرانہ مسلمات و محاسن ہی باقی نہ رہے تو پھر شاعری، شاعری نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر نئے شعراء واقعتاً قدرتِ شاعری رکھتے ہیں تو پھر وہ "تنقیدِ حیات" کے لئے شاعرانہ محاسن سے معرا ہو جانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں وہ اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بھی صحیح معنوں میں شاعری کیوں نہیں کرتے؟ آخر کالیداس، فردوسی، انیس، اقبال اور اکبر نے بھی تو معین مقاصد پیش نظر رکھتے ہوئے شاعری کی اُن مقاصد سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر آج

دنیا اُن کے کمال شعری کا اعتراف کرنے پر بہرحال مجبور ہے۔ آپ مارکسی نظریات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں ضرور کیجئے لیکن اسے پہلے طے کر لیجئے کہ تبلیغ کا ذریعہ آپ نثر کو بنانا چاہتے ہیں یا نظم کو؟ اگر آپ اپنا ذریعہ تبلیغ نظم قرار دیتے ہیں تو اس نظم کو نظم کے معیار پر رکھئے اور نثر سے ممتاز کیجئے۔ جو اصحاب نظم و نثر میں امتیاز پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں ملک کا کون سا قانون انکو مجبور کرتا ہے کہ وہ شعر ضرور ہی کہیں، وہ اپنے خیالات نثر میں شوق سے ظاہر کریں ہم بھی خیر مقدم کرنے کو تیار رہیں۔

بہرحال یہ تو ہوا نئے شاعروں کا ایک طبقہ، دوسرا طبقہ وہ ہے جو کلام کا معیار فحش گوئی و عریاں نویسی کو سمجھتا ہے اس ضمن میں مخمور جالندھری وغیرہ کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ یہ افراد مرد و عورت دونوں کو اس طرح ننگا مادرزاد دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کے جسم پر ایک تار بھی نہ ہو، انھیں عریاں کرنے کے بعد وہ ان کے مختلف اعضا کی سختی، نرمی نشیب و فراز عمق و سطح کے متعلق ایسا بیباکانہ و بیباکانہ اظہار خیال کرتے ہیں جیسے وہ کسی خاص عالم میں لفظوں کے بدلے کام و دہن سے کام لے رہے ہوں، وہ اپنے ان ناگفتنی حرکات کی راہ میں مذہب اور سماج کو حائل پاتے ہیں اس لئے وہ مذہب اور سماج کو بھی ایک ہی زبان میں ہزاروں گالیاں دے ڈالتے ہیں اور مذہب و معاشرت کے سارے نظام کو توڑ پھوڑ ڈالنے کی بھونڈی خواہش میں اپنے سر ٹکرائے دیتے ہیں۔ ادبیات میں پہلے بھی ایک صنف ایسی رہی ہے جس سے اُن شاعروں نے جن کے اعصاب پر بقول اقبال عورت سوار تھی اپنے جنسی جذبات کے لئے سامان تسلی مہیا کرنے کی کوشش کی مگر یہ صنف ہمیشہ سے معیوب و مکروہ سمجھی گئی اور سوسائٹی سے نفرت عام میں

اس طرح الگ تھلگ اور چھپ چھپا کر رکھی گئی جس طرح مکانوں میں پاخانے کبھی کسی صاحب مکان نے اپنے آنے والے دوست کو اپنے مکان کے پاخانے میں لیجا کر نہیں بٹھایا، یہ اور بات ہے کہ اگر کسی وقت دوست کو اس کے مادی تقاضے نے مجبور کیا تو وہ پاخانے میں تھوڑی دیر کے لئے تن تنہا جا کر فارغ ہو آیا۔ مگر آج کل کی جدید شاعری والے تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ اور اُن کے تمام احباب واعزا بلکہ ساری دنیا ہر وقت پاخانہ ہی میں بیٹھی رہے۔ بھلا صحیح الدماغ انسان اسے کیونکر برداشت کر سکتے ہیں۔ پہلے اگر انفرادی طور پر کوئی عُریاں نویسی کرتا تھا تو اُسے سات پردوں میں چھپاتا تھا جبکہ آج کل اسے محل فخر میں پیش کیا جاتا ہے اور فحش گوئی کی نشر و اشاعت کو حق بجانب ٹھہرایا جاتا ہے۔ زیادہ تر اعتراض اسی طرزِ عمل پر ہے۔

آج کل کے کالج اور یونیورسٹی کے طلبا پنجاب کے ادبی رسالوں میں نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کا کلام پڑھ کر اس سے اس لئے متاثر ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے سامنے تصویر کا دوسرا صحیح رُخ موجود نہیں ہے لاتعداد رسالوں کے شور و غل میں اعتدال کی آواز سنائی نہیں دیتی ان رسالوں پر مستزاد ہے ریڈیو اسٹیشنوں کا مسلسل پروپیگنڈا جن میں اتفاق سے انتہا پسند نوجوان بڑی تعداد میں داخل ہو گئے ہیں اور اپنے فحش گو اور عُریاں نویس دوستوں اور ان کے دھیرا دھنوں کا رناموں کو اچھالنا اپنا بہترین مشغلہ قرار دے رہے ہیں لہٰذا اپنے نوجوانوں کے ادبی مذاق کو بگڑنے اور شعر و ادب کے غلط معیار کا شکار ہو جانے سے بچانے کے لئے نیز اس طرح اسلاف کے بے نظیر ادبی کارناموں کی قدر و قیمت

اور اعلیٰ فنی خصوصیات باقی رکھنے کے لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے
کہ اصلاحِ حال کی طرف فی الجملہ منظم طور پر متوجہ ہوا جائے۔ چنانچہ یو۔پی۔
کے اخبارات سرفراز، حقیقت، سرپنچ وغیرہ میں اس طرف جدید شاعری کی
بے راہ روی پر متعدد مضامین شائع کئے گئے ہیں نیز لکھنؤ میں احباب کا
ایک حلقہ سا بن گیا ہے جو تعمیری مقصد کے ساتھ اصلاحی جد وجہد کر رہا ہے
اس حلقۂ ادب کے ایک رکن ہمارے ہر دلعزیز دوست مسٹر غلام احمد فرقت
ہیں جو ذوقِ سلیم کے ساتھ ساتھ فطری زندہ دلی کی روح افزا خصوصیات سے
متصف ہیں۔ وہ ہمیشہ دنیا کی الجھنوں پر ہنستے ہنساتے رہتے ہیں اور مسائل
کو خشک خاموشی سے دیکھ کر ان کی تلخیوں کو نہیں بڑھاتے چنانچہ حسبِ عادت
انھوں نے نئی شاعری کو بھی دیکھنے کے بعد اپنے لئے تفننِ طبع کا اچھا خاصا
مواد پایا وہ دوستوں کے درمیان اس انوکھی شاعری پر ظرافت وطنز کے
پردے میں تنقیدیں کرنے لگے، مگر چونکہ نئی شاعری کی حمایت میں بعض
پڑھے لکھے اور ذمہ دار افراد بھی پائے گئے اس لئے انھوں نے اس قسم کی
شاعری پر اپنی عادت کے خلاف سنجیدگی سے بھی غور کرنا شروع کیا
انھوں نے نئے ادب اور نئی شاعری کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھا اور اسکے
حامیوں کے خیالات کا جائزہ لیا۔ آخر اس سلسلے میں خود انھوں نے طبع زاد
نظم ونثر کا خاصا بڑا مجموعہ تیار کر لیا جس کا مطالعہ گم کردہ راہوں کیلئے
سبق آموز اور صاحبانِ ذوق کے لئے باعث تفریح ہے۔

ناانصافی ہوتی اگر اس مواد کو مخصوص احباب تک محدود رہنے
دیا جاتا اس لئے طے پایا کہ اسے شائع کر دیا جائے جس سے نہ صرف صاحبانِ نظر
محظوظ ہوں بلکہ بھولے بھٹکے ہوئے افراد صحیح راستہ بھی پا جائیں۔ مجھے

امید ہے کہ ملک میں اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اس کے مطالعے سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اس نتیجے تک پہنچ سکیں گے کہ آج جس طرح کے کلام کو "نیا ادب" اور "جدید شاعری" کے خوش آیند ناموں سے پکارا جا رہا ہے وہ دراصل لوچ اور لچر ہے جس میں نہ کوئی جان ہے اور نہ مطلب، نہ معنی۔

آج جدید شاعری کی دونوں قسموں پر جو کہ مہمل گوئی اور فحش نویسی پر مشتمل ہیں تمام مہذب پبلک صدائے نفرین بلند کر رہی ہے، نہ صرف ملک کے سنجیدہ جرائد اس کے خلاف پُر زور تنقیدیں شائع کر رہے ہیں بلکہ مختلف شہروں میں عام جلسے کر کے اس شرمناک شعبۂ ادب کے خلاف نفرت و ملامت کی تجاویز منظور کی جا رہی ہیں۔ یہ زیر نظر مجموعہ بھی ایک مستقل نعرۂ ملامت ہے جسے سن کر ان لوگوں کو ہوش آنا چاہئے جو مہذب دنیا پر ایسی لغو اور گندہ شاعری رسالوں اور ریڈیو کے ذریعہ زبردستی عائد کرنا چاہتے ہیں اور جن سے عاجز آ کر آج ان کو سبق دینے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ نام نہاد ترقی پسندوں کے لئے ابھی پہلا نسخہ ہے اگر یہ خاطر خواہ مداوا ثابت نہ ہوا تو ایسے ایسے نہ معلوم کتنے نسخے تجویز کئے جائیں گے۔ اگرچہ یہ عمل جراحی شائستہ ادبیات کے ماننے والوں کی طبیعت اور مروّت کے خلاف ہے مگر اردو ادب اور نوجوانان قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے بادل ناخواستہ ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ ہم کو احساس ہے کہ گمراہ ادب کو سدھارنے کیلئے صالح ادب کو اپنی جگہ سے ایک ذرا نیچے آنا پڑ رہا ہے مگر قومی و ادبی مفاد کے لئے یہ ناگزیر ہے اس لئے بادل ناخواستہ یہ طرزِ عمل اختیار کیا جا رہا ہے بقول [illegible]

ایمانِ وفا میں شک تھا اُسے ہم کھینچ کے قشقہ بیٹھ گئے
اللہ گناہ معاف کرے کلمہ کافر کو پڑھانا ہے!

اس صدائے بیزاری کی تہہ میں ایک اپیل بھی چھپی ہوئی ہے جو اُن نوجوان شاعروں سے کی جاتی ہے جن میں نسبتاً صلاحیت موجود ہے اور وہ اگر "فیشن پرستی" کے تقاضے سے مقابلہ کرکے اپنے کو غلط راستے سے ہٹالیں تو اُن کی شاعری کا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے۔ ان اصحاب میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں ہمیں علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی کی اُن نظموں کو سُننے کا موقع ملا ہے جن میں وزن و قافیہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یقیناً اُن کی ایسی نظمیں بہت قابلِ قدر ہیں، اگر یہ صاحبان اپنی شعری صلاحیت کو انھیں صحیح حدود کے اندر ترقی دیں تو وہ دنیائے شعر و سخن میں بڑی ناموری حاصل کر سکتے ہیں۔

آخر میں ہم ایک بار پھر اس امر کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا اور ہمارے حلقۂ احباب کا مقصد اس اصلاحی اقدام سے یہ ہرگز نہیں ہے کہ شعر و سخن میں جدت و تنوع سے کام لیا ہی نہ جائے اور اردو شاعری جس منزل پر ہے وہیں اُسے روک دیا جائے۔ شاعری بھر اس میں بند نہیں رکھی جا سکتی، روانی و بالیدگی اس کی فطرت میں داخل ہے اور اگر زبان جغرافیائی و تاریخی حالات کی بنا پر اپنی موت آپ نہیں مرجاتی تو پھر اس کی شاعری کا ترقی پذیر رہنا ناگزیر ہے۔ ہماری اس تنقید سے اس قدامت پرست طبقہ کو خوش نہ ہونا چاہیئے جو اُردو کی کائنات صرف غزل کو سمجھتا ہے، محض قدامت کے انکار کو سینے سے لگائے رہنا

پاہتا ہے۔ اور ہر جدید کلام سے صرف جدید ہونے کے جرم میں تعصب برتتا ہے۔ اس طبقے کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس اقدام کے ذریعے اسکی ترجمانی یا حمایت کی جا رہی ہے اور وہ اپنی بوسیدہ قدامت پرستی کی بقا کیلئے ہمارے حلقے سے کچھ مدد حاصل کر سکے گا۔ جہاں تک اصول و بنیادی نقطۂ نظر کا تعلق ہے ہمارے اور ترقی پسندوں کے درمیان بہت کم اختلاف ہے۔ زیادہ تر اختلاف طریقۂ کار اور تفصیلات میں ہے۔ اگر اختلاف کو وزن کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں جتنا اختلاف جدید ترقی پسندوں سے ہے اتنا ہی اختلاف رجعت پسندوں سے بھی ہے۔ ہمارا پیغام دونوں ہی کو ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور اعتدال کے نقطے پر آئیں کہ "امر خیر" یہی ہے۔

اردو شاعری کے موجودہ دور کی تنقید

(مولانا سید اختر علی صاحب تلہری)

۲۴ر اکتوبر کے سرفراز میں محترمی جناب احتشام حسین صاحب پروفیسر
لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک مراسلہ بعنوان بالا سے شائع ہوا ہے۔ اس فاضلانہ مراسلہ
میں علمی حیثیت سے موجودہ دور کی نظمیہ شاعری کی اہمیت واضح کرنے کی
کوشش کی گئی ہے۔ لائق مراسلہ نگار نے اس ضمن میں بعض ایسی باتیں کہی
ہیں جن کے متعلق کچھ گزارشیں پیش کرنا مسئلہ زیر بحث کی تنقیح کیلئے ضروری
ہیں۔ مسئلہ کے متعلق پہلوؤں کی اہمیت کے لحاظ سے تفصیلی بحث چاہتے ہیں
مگر ایک روزنامہ کے محدود کالم اس کی گنجائش نہیں رکھتے اس لیے مختصر
طریقہ پر مسئلہ کے بعض خاص خاص حصوں پر ذیل کی سطروں میں اظہار خیال
کیا جائے گا۔

وزن اور شعر

فاضل مراسلہ نگار نے زندگی اور زندگی کے آئینہ دار مظاہر کے متعلق
جو تغیر کا نظریہ پیش کیا ہے اسے بعینہٖ تسلیم کرنے کے بعد بھی اُن نتائج سے
جو شاعری کے متعلق اخذ کئے گئے ہیں مجھے اختلاف ہے۔ فاضل نامہ نگار
نے تغیر کی ذہنی و معاشی و نفسی وجہیں ظاہر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے
کہ بحر، وزن، اور قافیہ سب کچھ انسانوں نے بنایا ہے۔ وہی اس کو بدل
بھی سکتے ہیں۔ یہ چیزیں نہ الہامی ہیں اور نہ شاعری کی راہ میں حائل ہوتی
ہیں۔ بالفعل قافیہ کو چھوڑئیے۔ اس کی نوعیت دوسری ہے۔ وزن کو لیجئے۔

اس کے متعلق یہ کہنا کہ "اسے انسانوں نے بنایا ہے" کچھ زیادہ موزوں پیرایۂ بیان نہیں ہے۔ اس مقام پر یہ کہنا مناسب ہے کہ وزن کا انکشاف زبان کے فطری ارتقا کے سلسلے میں اضطراری طور پر ہوا ہے۔ اب اسے الہامی کہا جائے یا کچھ اور اُسے قافیہ وغیرہ جیسی مصنوعی چیزوں میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھیے کہ انسان نے جب بولنا سیکھا اور اس کیفیت نے ارتقائی منزلیں طے کیں تو اس میں ایک ایسی دبی ہوئی حس اُبھرنا شروع ہوئی جس کا موضوعِ عمل ان بولوں کے باہمی ربط کی دیکھ بھال تھا۔ اس دیکھ بھال میں اس کی نگاہوں کے سامنے تناسب و توازنِ اصوات کی شکل میں اس باہمی ربط کے وہ مخصوص عنوان بھی آنے لگے جن سے اس حس کو ایک گنگناتی ہوئی لطیف لذت محسوس ہوتی تھی۔ اسی انسانی حس کی دریافت کی ہوئی تناسب و توازنِ اصوات کی شکلیں اصطلاح میں وزن سے تعبیر کی گئیں۔ جو عروضی اوزان رائج ہیں وہ اسی حس کے استقرا کا نتیجہ ہیں۔ میری اس بحث کو ایک اور زیادہ قوت پہونچاتا ہے کہ جن افراد میں یہ حسِ تناسبِ اصوات بیدار ہو انھیں رسمی طور سے مروجہ عروضی اوزان کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود فاضل مراسلہ نگار نے اپنے مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ "مولانا روم نے فاعلاتن فاعلات کو جانے بغیر حیرت خیز مثنوی لکھ ڈالی" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص تناسب کی صورتیں ہمارا لسانی نقطۂ نظر سے اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہیں جن کا یہ جاگی ہوئی حس خود ادراک کر لیتی ہے۔ انسانی ذہن ان کی تخلیق نہیں کرتا۔ وزن کے وجود کی نوعیت کی تعبیر میں یہ ضروری [illegible] شعر سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کر سکتا ہے۔

وزن کی نوعیت کے ذہن نشین کرنے کے بعد اس پر غور کی ضرورت ہے

کہ شعر کیا ہے اور وزن سے اُسے کیا تعلق ہے؟

ان لوگوں سے بحث نہیں جو شعر کو "ملفوظی حدود" سے آگے لے جاکر جذبات میں تحریک پیدا کرنے والے مناظر تک کو شعر قرار دیتے ہیں یا پھر ذرا اس عموم سے نیچے ہٹ کر ہر "کلام مخیل" کو جس سے انبساطِ نفس یا انقباضِ نفس پیدا ہوتا ہے شعر بتاتے ہیں۔ یہ اصطلاح کا اختلاف ہے "لا مشاحۃ فی الاصطلاح" جو لوگ شعر کی ان اصطلاحات سے جو غالباً اُس کے مجازی استعمالات کی مختلف صورتیں ہیں یا پھر مفہوم شعر کی ارتقائی منزلوں کی نشانیاں ہیں متاثر ہیں وہ قافیہ کیا وزن کیا شعر کو ملفوظی حدود سے بھی آگے لے جا سکتے ہیں۔ بحث اُن لوگوں سے ہے جو اُن اثر انگیز ملفوظی حقیقتوں کو جن کی باہمی ترکیب میں "لطیف تناسب اصوات" پایا جاتا ہے شعر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شعر کے اس مفہوم کی حقیقت میں وزن داخل ہے اسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جب کہ اس مفہوم کی تعیین و تشخیص کے لئے مخصوص تناسب اصوات کا وجود "فصل" "مُمیز" تمیز دینے والے کی حیثیت رکھتا ہے جو اُسے اُس دوسرے کلام سے الگ کرتا ہے جس میں یہ مخصوص تناسب اصوات نہیں پایا جاتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ "شعراء نے وزن کے وجود کو اپنی آسانی کے لئے جزوِ شاعری بنا لیا"۔ بلکہ اس کے برخلاف حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ وزن شعر کے اس اصطلاحی مفہوم کی ماہیت میں داخل ہے جس کے بغیر شاعری کا تحقق ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس جو اوزان موجود ہیں وہ استقرا کا نتیجہ ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وزن کی اور شکلیں نکل نہ سکیں لیکن جو شکلیں بھی نکلیں گی اُن میں وہ بولتا ہوا گنگناتا ہوا نغمانی

تناسب اصوات ضرور پایا جائے گا جو رائج بحروں میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہ
مخصوص پُر ترنم تناسب اصوات نہیں پایا جاتا تو پھر نثر کے بولتے ہوئے شگفتہ
ٹکڑوں کو شعر کی اصطلاحی حدود سے کیونکر خارج کیا جاسکے گا۔ اُردو میں اوزان
وغیرہ سب ایران و عرب سے آئے ہیں۔ عرب میں شعر کا ذخیرہ جن جن تناسب
اصوات کی شکلوں میں تھا اُن کا خلیل نے استقرا کیا اور انھیں علمی حیثیت
دے کر مختلف بحروں میں منضبط کر دیا۔ ایرانیوں نے انھیں اوزان میں سے
اپنے مذاقِ موسیقی کی مناسبت سے کچھ وزنوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔
اُردو میں بھی انھیں اوزان کی کم و بیش پابندی کی گئی تاہم نشاط انگیز مخصوص
تناسب اصوات کو منطقی حیثیت سے انھیں مروجہ اوزان میں محدود جاننے کا
دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر تناسب اصوات کا احساس کرنے والی حس دوسری
شکلوں میں بھی اس لطیف کیفیت کو پاتی ہے تو وہ ضرور نغمہ و آہنگ کی بنا
کو اس سے روشناس کرنے کا حق رکھتی ہے لیکن یہ حس کبھی کبھی دھوکا بھی
کھا سکتی ہے اور خصوصیت سے اُن لوگوں کے یہاں جنھوں نے اس سلسلے
میں سابق کے تجربوں سے بے نیازی ہی کو تجدد سمجھ لیا ہے۔ ایسے لوگ
اس زبان کے نغمہ و آہنگ کے مزاج سے صحیح طور پر باخبر نہیں ہوتے۔
انھیں اس کے زیر و بم کی لطافتوں کا احساس نہیں ہوتا یہ صلاحیت اُسی وقت
پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اس حس سے انکشافی تجربوں نے جن اوزان کو
دریافت کیا ہے اُن کی ضربیں ہمارے ذوقِ نغمہ کی نبض میں پہلے پورے
طور سے محسوس ہو لیں ایسی حالت میں ہر شاعر و غیر شاعر کو یہ حق دینا کہ وہ
اوزان میں جس طریقے سے چاہے کتر بیونت کرے شعری دنیا کے لئے خطرہ
سے خالی نہیں ہے یہ جمہور کا دور سہی، عوام کا دور سہی اور تہذیب و تمدن

کی شکست و ریخت میں بھی ان کا ہاتھ سہی تاہم مخصوص علوم میں مخصوص فنون
میں "ماہرین" EXPERTS کے مخصوص حقوق نظر انداز نہیں کئے جا سکتے
اس جماعت ماہرین اس جماعت اشراف کے حقوق مخصوص پر عوام کا
جلنا کا حسد کی نظریں ڈالنا خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ جمہور و عوام سے
پوری ہمدردی کے بعد اس صورتِ حال کو ہمیشہ برداشت کرنا پڑے گا
اب خواہ اسکے لئے کورذوقی کے جھونپڑے سے نکل کر خوش ذوقی کے عالیشان
ایوان ہی کی طرف مڑنا پڑے۔ بہرحال اس تمام بحث کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے
کہ منطقی حیثیت سے یہ تو بالکل صحیح ہے کہ موجودہ اوزان استقرا کا نتیجہ ہیں اور
اس لئے نئے اوزان کے انکشاف کی گنجائش نہیں ہے تاہم اسی کے ساتھ
یہ ماننا بھی ناگزیر ہے کہ شاعری کے ذخیرہ میں محض نئے اوزان کے انکشاف
سے کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کے ذیل میں حقیقی شاعرانہ
قوتوں کا اظہار نہ ہو۔ اس کے لئے شدت احساس اور پھر اس شدتِ احساس
کے اظہار کے لئے لفظوں میں اتنی ہی سکت ہونا چاہئے۔ اگر یہ بات نہیں تو
پھر ایسی شاعری شاعری نہیں، شاعری کے ساتھ تمسخر ہے۔

اس نئی اور آزاد شاعری کے علمبرداروں کی طرف سے اب تک جو
ذخیرہ شعری مہیا کیا گیا ہے وہ صحیح تو یہ ہے کہ طفلانہ ڈھکوسلوں سے زیادہ اہمیت
نہیں رکھتا۔ اس میں شعریت کی تلاش بیکار ہے اس میں نہ تو کہیں شدتِ
احساس ہی کی تڑپ محسوس ہوتی ہے اور نہ کہیں اس میں عمیق تفکر ہی
کروٹ لیتا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر مقامات پر ترکیبوں میں جھول ہی لفظوں میں
تنافر کہیں کچھ سطحی اور پیش پا افتادہ اور کہیں غیر واضح و مبہم غیر مربوط خیالات
ہیں جو ٹوٹی پھوٹی بحروں کی موجوں پر بیغائت طریقے سے بہتے چلے جا رہے ہیں۔

اس قسم کی نظمیہ شاعری کو جو شعریت کے ساتھ حقیقت میں ایک قسم کا مذاق ہے۔
جب سنجیدہ عنوان سے سنجیدہ ادیبوں کی طرف سے سنجیدہ لفظوں میں سراہا جاتا ہے
تو واقعی تکلیف ہوتی ہے۔ اس قسم کی غیر مربوط نظموں میں نئے نقادوں کی طرف سے
نہایت اہتمام کے ساتھ "آزاد تسلسل" کا مزعومہ وصف پیدا کیا جاتا ہے مگر
اس قسم کے "آزاد تسلسل" کے نمونے "شعر طلب" دنیا کے سامنے رکھنے کے بجائے
کسی "نفسیاتی معمل" میں رکھے جائیں تو غالباً زیادہ فائدہ کی بات ہو گی کیونکہ وہاں
ان آزاد تسلسل کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے غیر مربوط خیالات کے پیش
کرنے والوں کا نفسی تجزیہ ہو سکے گا اور اس طرح فرائڈ کے نفسیاتی نظریوں
کے لئے کچھ اور مفید کڑیاں دستیاب ہو سکیں گی۔

نفسی حیثیت سے اس قسم کی نظموں کی جو اہمیت بھی ہو مگر شاعری کے
لحاظ سے تو انھیں اس وقت تک اہمیت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ ان میں
وہ کیفیت نہ پایا جائے جو حسن مواد اور حسن صورت کے لطیف امتزاج سے پیدا
ہوتا ہے۔ اس سے غالباً کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ مواد و صورت کا ہر امتزاج
محض اس بنا پر قابل پسندیدگی نہیں ہو سکتا کہ وہ جدید ہے ٹھیک اسی طرح
جس طرح نفس قدامت کی وجہ سے مواد و صورت کے ہر امتزاج کو پسند نہیں
کیا جا سکتا۔

اسی کے ساتھ اس کے بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ لازمی
نہیں ہے کہ اس طلسماتی دنیا میں جو تغیر بھی جنم لے وہ مفید ہی ہو۔ بہت سے
تغیرات مہلک ہوتے ہیں۔ آپ خواہ ان تغیرات کو "تاریخ اور وقت" کا پیدا
کیا ہوا تقاضا ہیں اور خواہ ان کا سیلاب ہماری خواہشوں سے نہ رک سکے تاہم
ہمارا فرض یہ ضرور ہے کہ جن تغیرات کو ہم تباہ کن سمجھ رہے ہیں ان سے

خطرات سے دنیا کو آگاہ کرتے رہیں تغیرات کا خالق آپ شوق سے تاریخ اور وقت کو قرار دیں لیکن بہر حال یہ چیزیں بے شعور ہیں ایسی حالت میں ان کی تغیراتی رفتار ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔

مواد اور صورت کے ہر امتزاج کے ساتھ رواداری برتنے کی تائید ہمارے محترم دوست نے اس پہلو سے کی ہے کہ "ہم بدلنے والے کو کیوں روکیں اگر وہ ہمیں تسکین نہ دے سکا تو اس نے کچھ دوسرے لوگوں کو ضرور تسکین دی ہے" یہ استدلال کسی طرح قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس استدلال کو قبول کیا جاتا ہے تو پھر ہر بری سے بری چیز کے ساتھ رواداری کو مستحسن ثابت کیا جا سکتا ہے کیونکہ کونسی وہ چیز ہوگی جس سے کچھ لوگوں کی تسکین نہ ہو سکتی ہو؟ اس نظریہ پر تو کہیں بھی عمل نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مارکسی فلسفہ بھی اس نظریہ کی جو بظاہر شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے ہمت شکنی ہی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ "قدیم ادب اور ادبی روایات سے دلچسپی لینے والے حضرات جب جدید ادب کے تغیرات پر رائے زنی کریں تو اس کا ضرور خیال رکھیں کہ تغیرات ذہنی نہیں ہوتے ہیں مادی ہوتے ہیں۔ حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور مخصوص حالات مخصوص قسم کے تغیرات ضرور پیدا کرتے ہیں۔" غالباً ان کا مقصد یہ ہے کہ شعر و ادب میں جو یہ تغیرات پیدا ہو رہے ہیں وہ موجودہ مادی تغیرات کا نتیجہ ہیں اس لئے اُن پر رائے زنی بہت سنبھل کر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے فاضل دوست اس کا اطمینان رکھیں کہ ہم اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ مادی حالات ذہنی تغیرات پیدا کرتے ہیں لیکن اس ترمیم کے ساتھ کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اولاً کسی ذہن میں کسی مخصوص مادی حالت کی

وجہ سے تغیر پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ ذہنی تغیر دوسرے مادی تغیرات پیدا کرتا ہے۔ بہرحال ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ اقتصادی و تمدنی و معاشرتی حالات کے بدلنے کی وجہ سے بہت سے ذہنوں میں خیالات کا رُخ بدل رہا ہے اور اُن کی شاعری میں ان بدلے ہوئے خیالات کا عکس مل رہا ہے تاہم اس کے ساتھ بھی یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ہر جگہ یہ عکس جاذب نظر نہیں ہے بعض دماغوں نے ان بدلے ہوئے خیالات کا شاعری میں جو چہرہ اُتارا ہے وہ بہت ہی بھدا اور بد قوارہ ہے۔ آزاد شاعری اسی نوعیت کی چیز ہے۔ مخصوص حالات نے اس کے علمبرداروں میں جو مخصوص قسم کے تغیرات پیدا کئے ہیں وہ شاعری کے نقطۂ نظر سے تباہ کن ہیں۔ یہ مخصوص تغیرات مخصوص حالات اور مادی تغیرات کا نتیجہ ہی مگر ان مخصوص تغیرات میں ان کی مخصوص ذہنی حسّی و شاہدانہ صلاحیتوں نے جو اور تغیرات پیدا کئے ہیں اُن کے نتائج کی طرف سے کیونکر چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔

آزاد شاعری کے بعض نمونے

آج کل کی نئی شاعری کے نقیبوں میں ن۔م راشد، ڈاکٹر تاثیر، میراجی فیض احمد فیض، اور مختور جالندھری وغیرہ ہیں اس شاعری کے تابناک نمونے فیض کے یہاں کم ہیں اگرچہ وہ اس کی یہ نقش فریادی کے دیباچہ میں کچھ ندامت سی محسوس کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی میراجی کے یہاں افراط ہے۔ ن۔م راشد درمیانی درجہ میں ہیں۔

فیض کی ایک نظم ہے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

بول زباں اب تک تیری ہے
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اگرچہ نقشِ فریادی کے لائق مقدمہ نگار ن۔ م۔ راشد نے ان "جواہر پاروں" کے متعلق فرمایا ہے کہ "احساس کی تلخی ان اشعار میں اپنی پوری شدت پر ہے یہاں تک کہ فیض کے ذہن میں بسی ہوئی موسیقی بھی اس تلخی کو مٹا کر ان الفاظ کو لے تغزل میں تبدیل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی" مگر حقیقت یہ ہے کہ ان چند لفظوں کے مجموعہ میں شعریت کا کوسوں بھی نشان نہیں ہے۔ اگر یہ شعر نہیں تو پھر ہے

دندان تو جملہ در دہان اند
چشمان تو زیرِ ابروان اند

کہا جا سکتا ہے کیوں شعر نہیں اگر احساس کی تلخی شعریت کے گلے پر اس طرح چھری پھیر سکتی ہے تو پھر ایک شاعر کو احساس کی تلخی سے پناہ مانگنا چاہیئے۔

اس نظم میں اور ٹکڑے تو خیر جیسے ہیں ویسے ہیں البتہ "جسم و زباں" کا ٹکڑا تو شاعر کے حسنِ مذاق کا خاص طور سے آئینہ دار ہے۔

فیض کی ایک دوسری نظم ہے

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا

نئی شاعری کے مداح فیض کی اس نظم کو "حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں" قرار دیتے ہیں اور اسے شاعری کی "بہت بڑی تخلیق" سمجھتے ہیں۔ یہ اپنا اپنا خیال ہے بہرحال کچھ جو نظم میں ابہام ہے۔

اسے پڑھ کر یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ شاعر کے دو سیاسیات میں الجھے ہوئے کسی ایسے کی پیداوار ہے یا پھر کسی ایسی طوائف کے چلتے پھرتے خیالات کا عکس ہے جو تماش بینوں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی ہے اور آخر میں اس کا خیال اس مرکز پر آ کر ٹھہر گیا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

شاعر کا اصلی مقصد کیا ہے؟ وہ بہرحال ابہام کے پردہ میں مخفی ہے۔ اس نظم میں کیا حُسن ہے اور کیا انتہا درجے کی اثر آفرینی ہے؟ اس کے اندازے کے لئے کس خاص ذوق کی ضرورت ہے۔ ایک طوائف کا کسی تماش بین کے انتظار میں تھک جانا اور اپنے بے خواب کواڑوں کا مقفل کر لینا "حسین تخیل" ہے اور "انتہا درجے کا اثر آفریں خیال" ہے تو اس سے اتفاق نہیں یہ خیال ایک عامیانہ خیال ہے۔ اور جس طرح سے نظم ہوا ہے اثر سے خالی ہے۔ البتہ اگر کوئی قادر الکلام شاعر اس موضوع کو اظہار خیال کے لئے منتخب کر لیتا تو آپ دیکھتے کہ اس میں کتنا اثر آ جاتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ "جنسی و ذہنی بھوک" کی الجھنوں کا جہاں کہیں معمولی نشان بھی مل جائے تو دوسری چیز بن جاتی ہے

قطع نظر کرتے ہوئے اسے بہتر شاعری سمجھ لیا جائے۔ اس نظم میں تاروں کے غبار
کا بکھرنا" اچھی تشبیہ ہے۔ مگر اس کے بعد تو سب زبردستی کی باتیں ہیں۔ یہ بات بھی
قابل اظہار ہے کہ یہ نظمیں فیض کی ہیں جو نسبتاً سلجھا ہوا کہتے ہیں اور بعض اُن کی نظمیں
قابل تعریف بھی ہیں لیکن ن م راشد اور میراجی کی شاعری کی دنیا اور ہے۔

ن م راشد کی شاعری کے متعلق "ماورا" کے مقدمہ نگار کرشن چندر کا
خیال ہے کہ "فنی نقطۂ نگاہ سے راشد ایک صحیح باغی شاعر ہے۔ اُس کا تخیل ہمیشہ
مروجہ زبان کے الفاظ اُن کے معانی، اسالیب بیان، بندشوں اور ترکیبوں کو
توڑتا پگھلاتا، انھیں نئے سانچوں میں ڈھالتا نئی صورتیں دیتا اور اُن میں
سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔" خود ن م راشد نے بھی
ماورا کی اکثر نظموں کے متعلق دیباچہ میں دعویٰ کیا ہے کہ ان میں "ہیئت اور
فکر کے لحاظ سے قدیم راہوں سے انحراف کیا گیا ہے۔"

اس میں تو شک نہیں کہ ن م راشد کی شاعری کا بیشتر حصہ ادب و شعر
سے بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے سابق کے تمام لسانی و ادبی
تجربوں سے چشم پوشی کی کوشش کی ہے اور اس طریقہ سے انھوں نے روایتی
دنیا سے قطع تعلق کرنا چاہا ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُن کی زبان اُن کا
تخیل سب گونگے کا خواب ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنے خیال میں روایتی زبان
کے الفاظ اُن کے معانی، اسالیب بیان، بندشوں کو توڑتے پگھلاتے انھیں
نئے سانچوں میں ڈھالتے نئی صورتیں دیتے اور اُن میں سے نئے مطالب کشید
کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حقیقت میں یہ سب فریب نظر ہوتا ہے۔ اس
توڑ پھوڑ کے بعد اگر بالفرض کچھ نئے مطالب ملتے ہیں تو وہ بیشتر الجھے ہوئے
مبہم بلکہ بسا اوقات بے معنی مہمل بیشتر ادب کی روایتی دنیا سے بغیر سوچے سمجھے

اس خواہ مخواہ کی بغاوت کا نتیجہ بھی نکلنا چاہئے تھا۔ شعر و ادب کی روائتی دنیا سے وابستگی بڑی حد تک ضروری ہے۔

آپ کی ایک نظم ہے "خودکشی"

کر چکا ہوں آج عزم آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے۔ رہگذاروں سے لپٹے سوگوار
گھر پہونچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب۔ الخ

اس نظم میں مرکزی خیال کا پتا چلانا اور پھر اُس کی تدریجی منزلوں کا سُراغ لگانا آسان نہیں ہے کسی "مجذوب کی مستانہ گفتاری" کی یہ بہترین مثال ہے۔ مانا کہ زندگی ایک ہرزہ کار عشوہ ساز مجبوبہ ہے اور اُسکی سفاکیاں دیکھکر آپ خودکشی پر آمادہ ہیں مگر ساتویں منزل سے کودنے کے کیا معنی۔ کیا ساتوں آسمان یاد آگئے؟ مگر خیال بھٹکتے بھٹکتے بھی اس طرف کیوں پہونچا یہ تو روائتی دنیا سے شدید ترین وابستگی ہے۔ شائد ساتویں منزل سے بلندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مگر پھر آٹھویں منزل کیوں نہیں۔ بارھویں منزل کیوں نہیں؟ یہ آخر ساتویں منزل کیوں؟ اس نظم کا یہ مصرع تو بہت ہی لچکش ہے۔

جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بیبا کانہ جست " اس دریچے میں جو جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے دبام کو۔ اس میں کس قدر شعریت ہے۔ کس قدر زندگی کی ترجمانی ہے؟ ترقی پسند شاعر و نقاد ہی اسے بتا سکتے ہیں حقیقت میں اس قسم کی بحیثیت نظم کے کوئی کل درست نہیں ہے۔ ن۔ م راشد کی ایک دوسری نظم ہے "انتقام" وہ ترقی پسند حلقہ میں خاص طور سے پسند کی جاتی ہے اس کا کچھ حصہ جہاں درج کیا جاتا ہے۔

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ جذبہ ہے؟ کس قدر لطیف تخیل ہے؟ ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام کس خوبصورت عریاں طریقہ سے لیا گیا ہے؟ مردانہ حوصلوں کا یہ کتنا اعلےٰ مصرف ہے؟ شاعر کے خیال میں غالباً یہ "مکمل آزادی"

کا صحیح تخیل ہے معلوم نہیں ہندوستانیوں کو اس برہنہ انتقام کے برہنہ جذبہ پر شاعر کا ممنون ہونا چاہیئے یا نہیں؟ میں تو یہی کہوں گا کہ اگر ایک شاعر کے تخیل کا یہی حاصل ہے کہ وہ اس قسم کی نظموں کو تخلیق کرے تو پھر شاعری کی دنیا میں بہت سوچ سمجھکر قدم رکھنا چاہیئے "اجنبی" "عورت کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔

میراجی کے یہاں آزاد نظم کے شاہکار بہت ہی افراط سے ملتے ہیں انھوں نے پرانی شاعری کی ہیئت اور روح دونوں سے بغاوت پورے طور سے کی ہے سنگِ آستاں میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

اس نظم کی ہیئت ایک حد تک قابل برداشت ہے مگر وہ تو کبھی کبھی ایک مصرعہ دو لفظوں کا کہتے ہیں اور دوسرا مصرعہ پوری ایک سطر کا اور کبھی دو سطر کا۔ اُن کے خیالات کی لہروں کا تو پوچھنا ہی نہیں۔ کہاں سے اٹھتی ہیں؟ کیونکر اٹھتی ہیں؟ کہاں جاتی ہیں؟ اس کا جاننا آسان نہیں ہے۔ یہ ہے نئی اور آزاد شاعری اب اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس شاعری میں بدلے ہوئے خیالات کا عکس مل رہا ہے تو کہنا پڑے گا کہ یہ عکس کہیں سے بھی دلفریب اور جاذب نظر نہیں ہے۔ یہ تو اتنے بھدے عکس ہیں کہ انھیں دیکھکر بدلے ہوئے حالات سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے موجودہ شاعری کا یہ سب سے خراب نتیجہ ہے۔

اس مقام پر پہونچکر اپنے سنجیدہ ترقی پسند احباب سے یہ پوچھنے کو جی

جاہتا ہے کہ ہمارے یہ نئے شاعر جن خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اُن کیلئے اب تک کے دریافت کئے ہوئے اوزان اور شاعری کی موجودہ صورتیں کیوں کافی نہیں ؟ نئی شاعری کے نمونوں کو دیکھکر تو یہ خیال خواہ مخواہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک زمانہ کے تجربہ سے فائدہ اٹھاکر اوزانِ عروضی اور دوسری شرطوں کی پابندی جو لازم کی گئی ہے اُس کے بار کو ان نوخیز شاعروں کی سہولت پسندی برداشت نہیں کر سکتی ۔ اس لئے وہ اپنی اس کمزوری کو بغاوت کے پردہ میں چھپاتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ دوسرے نئے اوزان کے سُروں سے ہمارے ساتھ کی ضیافت نہ کی جائے جس طرح ایک بحر کے ہوتے ہوئے دوسری بحر پرانے زمانہ میں اختراع ہو گئیں اُسی طرح اب بھی یہ عمل قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہو سکتا ہے مگر گذارش یہ ہے کہ اس اختراع کے جواز کے لئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ جدید خیالات کا بار مروجہ اوزان نہیں سنبھال سکتے تو یہ بات ضرور قابل غور ہے ۔ مروجہ اوزان اور شاعری کی مروجہ صورتوں کا جدید خیالات کے اظہار کے لئے ناکافی ہونے کا افسانہ تو بہت سنا گیا ہے مگر اب تک کوئی استدلالی تحریر اس مسئلہ کے متعلق نظر سے نہیں گزری ۔ یہ بحث لفظوں کے خوبصورت الٹ پھیر اور نئی نئی اصطلاحوں کے استعمال سے طے نہیں ہو سکتی ۔ ضرورت ہے کہ منطقیانہ طریقہ سے مدلل عنوان پر یہ بتایا جائے کہ یہ اوزان نئے خیالات کا بوجھ کیوں نہیں سنبھال سکتے ۔ ان میں کون سا وہ نیا خیال ہے جو مروجہ اوزان میں مروجہ شکلوں میں ادا نہیں ہو سکتا ؟

یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ اب تک ترقی پسند نقادوں کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ شاعری کو عوام سے قریب ہونا چاہئے ۔ کل کی بات ہے مجنوں گورکھپوری غالب وغیرہ کی شاعری کے متعلق یہ فرما چکے ہیں کہ ان سے صرف

چند افراد لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ عوام کے لئے جنتا کے لئے ان میں کوئی کشش نہیں۔
نظیر اکبر آبادی کی اسی عام پسندی کی وجہ سے تعریف کی جاتی تھی مگر اب جدید شاعری
کی خاص خصوصیت ابہام بتائی جا رہی ہے۔ ما دراکے ایک لائق مقدمہ نگار کرشن چیلیہ
نے صاف صاف اپنے مقدمہ میں لکھا ہے "مشرق اور مغرب کی جدید شاعری
بہت حد تک مبہم اور ناقابلِ فہم ہے۔" ہمارے محترم دوست نے بھی معاشرت
سیاست ادب کی الجھنوں کو بتا کر اسی ابہام کی طرف اشارہ کیا ہے کیا ان باتوں
سے یہ اخذ کیا جائے کہ اب جدید تنقیدی مذاق دوسری کروٹ لے رہا ہے اور
اب شاعری کو عوام سے قریب لانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی؟ ظاہر ہے کہ
جب وہ خواص اور تعلیم یافتہ افراد کے لئے مبہم اور ناقابلِ فہم ہے تو پھر جنتا
کے لئے کیا قابلِ فہم ہو سکتی ہے۔ یہ عذر کہ ایک شاعری جنتا کیلئے ہے دوسری
خواص کے لئے مانا جا سکتا تھا مگر پھر غالب وغیرہ پر اعتراض اُس کے ابہام
کی وجہ سے کیوں ہے؟

خیر یہ تو ایک ضمنی سوال تھا۔ اصل بحث تو یہ ہے کہ علوم کے پیچیدہ ہو جانے
سے شاعری کے ابہام کی کوئی معقول توجیہ نہیں ہو سکتی۔ جو صحیح مذاق رکھنے
والے شاعر ہیں وہ ان الجھنوں کے باوجود اپنے لئے سیدھے راستے ڈھونڈ
لیتے ہیں۔ اس قسم کے عذر پیش کرنا اپنے عجزِ طبع کا ثبوت دیتا ہے۔

جدید شاعری کسوٹی پر!

نواب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی

نوشتہ بماند سیہ بر سپید۔ صفحۂ قرطاس پر کلک حیات بخش جو حروف لکھ دیتی ہے ان کی عمر انسانوں اور نسلوں سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ آج فردوسی سعدی نہیں شاہنامہ اور گلستاں موجود۔ میر و مرزا نہ رہے کلام رہ گیا۔ لکھنے والا ہاتھ ختم ہو جاتا ہے۔ لکھا رہ جاتا ہے اور اسی سے اُس دور اور اُس دور کے رجحانات کا پتہ چلایا جاتا ہے۔

پس نقادانِ ادب اور ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ نقوش چھوڑ جائیں جو ان کے ناموں کی صحیح آئینہ داری کر سکیں۔

دیوانے کب نہیں ہوئے اور کہاں نہیں ہوئے لیکن اگر انہیں فرزانہ تسلیم کر لیا جائے تو اس دور کے اہلِ شعور کی عقلِ سلیم پر حرف آئے گا۔ ادب میں بھی کچھ تو دیوانے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ بن جاتے ہیں اول الذکر مکلف نہیں ہاں آخر الذکر قابلِ تعزیر ضرور ہیں آج بھی آزاد شاعری کے دلدادہ انہی دو گروہوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں کچھ تو وہ ہیں جو بھلے بُرے صحیح غلط کے امتیاز سے بہرہ مند نہیں اور کچھ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کے تحت یہ عفونت پھیلا رہے ہیں۔

اس وقت بھی کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جو چند بے بہرہ شاعر نہ رکھتا ہو اور بزرگوں سے سنا ہے کہ دورِ اسلاف بھی ان عجائبات سے خالی نہ تھا فی زمانہ پنجاب میں جناب امامِ دنیا کا چرچہ ہے تو دلّی میں استاد بلالی بقول خود جانشین غالب چغتائی قبیلہ کے فرد فرید زمینِ سخن پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت فرما رہے ہیں

اور سننے میں آیا ہے کہ بدایوں میں خبر ہے ایک جوڑا پلا ہوا ہے لیکن اس امام دینی اور بلالی طبقہ میں اور ہمارے آزاد طرز غریب کے شعرا کے گروہ میں یہ فرق ہے اول الذکر بحر بے کراں میں خود غوطہ زن رہتے ہیں اور یہ دوسرے خضر راہ بن اسے آب حیات بتا دوسروں کو بھی ڈبکی دینی چاہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ آزاد شعرا اپنا لکھا چھوڑ جائیں گے اور اس ناہموار خامہ فرسائی کو شعر کا درجہ عطا فرما دیں گے تو آنے والی نسلیں سمجھینگی کہ دور زیر نظر میں اس بدلگامی قلم کو بھی شعر کہا جاتا تھا بحوالہ بالا غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے لازم آتا ہے کہ بیانگ دہل اعلان کر دیا جائے کہ اہل نظر اس خامہ کاری کو شعر نہیں مانتے تاکہ ہماری نسل اور ہمارے دور پر بات نہ آئے اور ہمارا شعور شعری اخلاف کی نظر میں قابل مضحکہ نہ بن جائے۔ بنا برایں جناب غلام احمد صاحب فرقت کی اس کوشش کو میں سعی مستحسن تصور کرتا ہوں۔

بندہ نواز زبان میں ہر لفظ ایک خاص معنی ومفہوم کا حامل ہوتا ہے اور اگر ان مقررشدہ معانی کا احترام نہ کیا جائے تو زبان زبان نہ رہے اور ہم اپنا مافی الضمیر اس کے توسل سے ایک دوسرے تک پہنچا نہ سکیں۔ مثلاً ایک خاص صنف سخن کو ہم مستزاد کہتے ہیں پس جوں ہی یہ لفظ زبان پر آتا ہے مقابل سمجھ جاتا ہے کہ ہمارا مدعا کیا ہے اب اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہم تو اس لفظ کو مسدس کے لئے استعمال کریں گے کسی کا کاپی رائٹ تو ہے نہیں نہ یہ لفظ ان معنی میں رجسٹرڈ شدہ اور فرض کیجئے یہ وبا عام ہو جائے ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق الفاظ جن معنی میں چاہے استعمال کرنے لگے تو جناب تصور فرمائیں کہ اس عالم قیل وقال کا کیا حال ہوگا اور یہ حیوان ناطق کس دہاڑے کو پہنچ جائے گا۔ بس یوں سمجھئے کہ بولنے والے تو درکنار خود زبان لب خشک لئے آپ آپ کرتی مرجائے گی اور کوئی

حلق میں پانی نہ ٹپکائے گا۔

مدعا ہمارا یہ ہے کہ لفظ "شعر" مدتوں سے ایک خاص صنف سخن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کی حدود مقررہ ہیں اب اس لفظ کو کسی اور صنف کیواسطے استعمال کرنا کسی حالت میں مناسب نہیں۔

لفظ "شعر" کا اطلاق متفقہ طور پر کلام موزوں و باقافیہ پر ہوتا ہے شاید کوئی صاحب فرمائیں کہ خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو سو عرض یہ ہے کہ کلام معنی کا مفہوم لئے ہوئے ہے اس لئے اس اعتراض پر راقم کو کلام ہے۔

بعض شعرائے طرز غریب کا یہ فرمانا ہے کہ شعر کی محولہ بالا تعریف عروضیوں کی ہے اس کے جواب میں امراء القیس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اَذُودُ القوافی عنیّ ذیاد زیاد غلامٍ غویٍّ جراد

ترجمہ: میں آتے ہوئے قوافی کو یوں ہٹاتا ہوں جیسے کوئی شریر چھوکرا ٹڈیوں کو مار مار کر ہٹاتا ہے۔ یہ شعر پہلے عروض سے تقریباً تین سو سال پہلے کہا گیا ہے۔ شاعر آمد قوافی کو آمد شعر کے مترادف قرار دے رہا ہے۔ اسی حقیقت کے مدنظر شعر کی اس واحد تعریف کو جس میں قافیہ جزو لاینفک ہے عروضیوں کی تعریف کہنا عدم علم کی دلیل ہے۔

دور کیوں جائیے آپ کی اپنی زبان کا یہ محاورہ اس امر پر استدلال کرتا ہے کہ شعر کے واسطے قافیہ لازمی ہے۔ ہم کہتے ہیں قافیہ تنگ ہے۔ مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ کام بن نہیں پڑتا۔ اس محاورہ کا پہلا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ دنیائے شعر سے پیدا ہوا ہے اور پھر عام زبان میں مقبول ہو گیا۔ عقاب تخیل پر نسکتہ ہے محاورہ میں نہیں آیا بلبل طبع منقار زیر پر ہے زبان زد خلائق نہ ہوا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس اچھوتی تانتی سے قبل نہ صرف شعراء بلکہ خواص

عوام سب قافیہ کو شعر کا جز و لاینفک سمجھتے اور مانتے تھے۔ اس لئے کہ کوئی قول اس وقت تک ضرب المثل نہیں بن سکتا جب تک کہ تمام قوم اسے قبول نہ کرے۔

قافیہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف اسے شعر کا جز و لاینفک مانا گیا ہے بلکہ آپ کے اکثر و بیشتر ضرب الامثال با قافیہ ہیں کہ کہ مکرینوں میں یہ حسن بیان موجود۔ پہیلیوں میں یہ نظر آئے نثر تک مقفیٰ اور مسجع لکھی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ ان تمام حقائق کے پیش نظر جو ہمارے جدت پسند معدودے چند احباب جو ترک قافیہ پر کمر بستہ ہیں اور کسی عنوان عقل سلیم سے کام لے کر صراط مستقیم پر آتے ہی نہیں اس کا باعث کیا ہے۔

میں عرض کروں گا کہ قافیہ تنگ ہے۔ اسپ طبع لنگ ہے۔ ذوق سلیم دست زیر سنگ ہے۔ نظم کی قیود کے تحت اپنے خیالات کے اظہار پر دسترس نہیں بحر میں رہ کر شناوری دکھا نہیں سکتے اس لئے سات سمندر پار سے بے بحر شاعری لائے ہیں اور اس کو قوم پر نازل کرنا چاہتے ہیں۔

کچھ بیجا نہ ہوگا اگر ہم ساتھ کے ساتھ اس آزاد شاعری کی بابت۔ جو اہل مغرب کے خیالات ہیں ان سے قارئین کرام کو آگاہ کرتے چلیں۔

بلینک ورس کے باب میں انسائکلو پیڈیا برٹینکا میں درج ہے۔

In the middle ages end Rhyme held the field without rival. It was not until the inention of Blank verse that Rhyme found a

modern rival. Certain forms of poetry are almost inconceiveable without Rhyme. In the very day of Elizabathian literature a serious attempt was made in England to reject Rhyme altogether and to return to the quantitative measures of the ancients. The prime mover in this heresy was a pedantic Grammarian of Cambridge, Gabriel Harvey [1545-1630] for a short time he actually persuaded no less melodious a poet than Edmund Spenser to abandon Rhyme and adopt a sys-

tem of accented hexa meters.

From 1576-1579 the genius of Spenser seems to have been obscured by this error of taste, but he shook it off completely when he composed the Shepherds Callender

Thomas Campion in a tract published in 1602 advocated the omission of Rhyme from hybrical poetry.

By dint of prodigious effort he produced some unryhmed Odes, which were not without charm, but best critics of the time such as Daniel, repudiated innovation.

یہ ہیں خیالات اس حسینہ کی بابت اُس ملک والوں کے جہاں اسنے جنم لیا
ایک طرف اس کو غیر مستحسن بدعت قرار دے رہے ہیں دوسری جانب اس کے
علم بردار کو کتاب زدہ نیم دیوانہ علاوہ برایں سپنسر اس صنف سخن کو کچھ عرصہ
کے لئے اختیار کر لینے کو صراط مستقیم سے بھٹک جانا تصور کرتے اور کہتے ہیں
کہ اس بد مذاقی کی بنا پر اس کی فن کاری اور قابلیت ماند پڑ گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس زبان میں قوافی کی کمی ہو اس میں یہ بے قافیہ شاعری
بہ اکراہ روا رکھی جا سکتی ہے لیکن جس زبان کے خزانہ اس دولت سے معمور ہوں
وہاں اس شاعری کا گذر نہیں۔ بعض حامیان طرز غریب یہ بھی فرماتے ہیں کہ
تخیلات ترقی کرتے جاتے ہیں ہم آج جن بلندیوں پر جاتے ہیں وہاں قوافی
لنگ ہو جاتے ہیں۔ موجودہ عنوانات اور خیالات ان قیود کے پابند نہیں رہ سکتے۔

صحیح کہ تخیلات بام ترقی پر پہنچ رہے ہیں تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ
حسن بیان کو بالائے طاق رکھدیا جائے۔

جناب ان کے اصول کے تحت زمانہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کر رہا
ہے۔ خیالات اوج پر ہیں تخیلات عروج پر۔ پس اس شاہین بلند پرواز کے پاؤں
میں زنجیر ڈالنا مناسب نہیں۔ نیز پر پرواز کو مقراض قوافی کی قطع و برید کی نذر
کرنا زیب نہیں۔ کیا احقر اس ضمن میں اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ
آیا صرف خیالات ترقی کر رہے ہیں زبان جہاں تھی وہیں ہے۔

بندہ پرور انسانی ترقی کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ تخیلات کیساتھ
ساتھ انسانی زبان بھی ترقی کرتی چلی گئی۔ تا کہ ذہنی امور کو منظر عام پر لائے
دل کی بات زبانوں تک آئے۔ ایک کا مدعا بہ احسن طریق دوسرے تک پہنچائے
نظام عالم کچھ اس درجہ مربوط ہے کہ یہاں محض ایک چیز ترقی نہیں کرتی ہر نئے

متوازی چلتی ہے۔ ہمارے تخیلات ابتدائے آفرینش سے اب تک ترقی کرتے رہے اور زبان اہلِ زبان کا ساتھ دیتی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ عجز طبع کے بہانے ٹٹولے جاتے ہیں۔ ناچ نہ جانیں آنگن ٹیڑھا۔ اپنا مدعا صحیح طریقہ سے ادا کرنے پر عبور نہیں۔ دستور بدلنے کی فکر میں ہیں جن کی طبائع فطرتاً لنگ ہیں وہ شاہد بیان کو بام مرصع سے اُتار کر خاک نشیں کرنا چاہتے ہیں اپنے ذاتی نقص کی بنا پر مملکت ادب کو نقصان پہونچانے کے درپے ہیں فرمایا جاتا ہے کہ تخیل ترقی کر رہا ہے ماورائے قیود کر دو۔ ہم کہتے ہیں کہ تخیل ترقی کر رہا ہے تو ذریعہ اظہار تخیل بھی ترقی کر رہا ہے۔ ابتدا میں تخیل بھی عریاں تھا ذریعۂ اظہار بھی معرّا۔ اب مشاطۂ شعور و عقل نے ایک کو جامۂ تہذیب سے آراستہ کیا دوسرے کو مرصع و مقفیٰ۔ جب تک دماغ انسانی کام کرتا رہے گا زندگی کی ہر شئے دوش بدوش منازلِ ارتقا پر پہونچتی رہے گی۔ نیز باشعور دنیا کے پلیٹ فارم پر اسی کی بات سنی اور سمجھی جائے گی جس کا دماغ اور زبان ساتھ ساتھ چلے۔ اور جو اس فطری نعمت سے محروم ہوں گے ان پر "من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید" کا لیبل لگا کر زینت دہ طاقِ جہل کر دیا جائے گا!

فرقت صاحب نے یہ نظمیں نہیں لکھی ہیں بلکہ آزاد شعراء کو آئینہ دکھایا ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ ان بزرگوں پر اس آئینہ کا کیا اثر ہوگا لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہر نظم اپنی جگہ آزاد شاعری کا خاکہ بھی ہے نمونہ بھی۔ مثلاً چٹخارے ملاحظہ کیجئے یقین جانئے اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ طنز کیا گیا ہے تو خادم اس کو کسی آزاد شاعر کے کج دماغ کا نتیجہ سمجھتا۔ اس شاعری میں ایک یہ خاص لطف ہے کہ جتنی سمجھ سے بالاتر اور مفہوم سے بے بہرہ ہو اتنی ہی

اچھی۔ اس کے جواز میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ماحول کا انتشار ہمیں ایسا لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پھر ازراہِ کرم جناب اسے شعر نہ کہیں دیوانہ کی بڑ کہیں۔ لفظ شعر کو کیوں غلط استعمال کر کے اس صنفِ سخن کی توہین کی۔

فرقت صاحب کی "برف آسا" بھی خوب گرما گرم ہے نیز "نوحہ خواں" بھی اس محروم ردیف وقافیہ "بے بحرہ" شاعری پر آنسو ٹپکا رہا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

آزاد شاعری ـــــــ کدھر؟
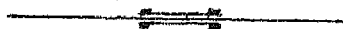
(مسٹر مبشر احمد علوی بی۔اے ناظر کاکوروی)

اُردو شاعری میں اُن لوگوں کی فہرست جنھوں نے کسی نہ کسی طریقہ سے رسمی اور عارضی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کبھی بھی زیادہ طویل نہیں رہی ہے گو بلینک ورس یا آزاد شاعری کا چرچا ہندوستان میں عرصہ تک رہ چکا ہے لیکن یہ انصاف سے دور ہے اگر اس امر کا اظہار نہ کیا جائے کہ "بلینک ورس" (قسم) کی شاعری میں شاعرانہ احساسات بدرجہ کمال موجود تھے صوری و معنوی خصوصیات میں کوئی فرق نہ آیا تھا نظم کے فطری تاثر اور لطافت میں بھی کوئی تبدیلی جائز نہ رکھی گئی تھی صرف فرق یہ تھا کہ مروجہ علم عروض کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا تھا گو متقدمین نے شعر کے لئے قافیہ ردیف اور بحر کو زیور تصور کیا تھا لیکن یورپ کی اندھی تقلید میں ہندوستان کے نوجوان طبقہ میں بھی آزادی کی لہر پیدا ہوئی اور اس ناسمجھ طبقہ نے اُردو شاعری میں بھی خود ساختہ شعری انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن آج یہ سب کو معلوم ہے کہ اس جماعت کو جو بہت ہی مختصر تھی اس کو اپنی کوششوں میں مطلق کامیابی نہ ہوئی۔

اُردو غزل گوئی کی ابتدا یہ صحیح ہے کہ فارسی اتباع سے ضرور ہوئی لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا شاعروں کی کھوئی اور سوئی ہوئی جماعت میں ذہنی انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں نے دفعتًا بھڑک کر اُردو شاعری کو ترقی کی

شاہراہ عام پر کھڑا کر دیا اور آج یہ سب کو معلوم ہے کہ نئے ماحول اور نئی فضا میں (گو حقیقتاً یہ مشکل تھا) پرورش پاکر اُردو شاعری نے اپنا میدان وسیع کرلیا اور اپنے دامن سے تقلیدی دھبہ کو جلد دور کرکے زندہ زبانوں میں شمار ہونے کے قابل ثابت کر دیا۔ گذشتہ زمانہ میں اکثر شعراء نے صنائع و بدائع کے کثرت استعمال اور تراکیب واضافات کی زیادتیوں سے اپنی غزلوں کو دقیق اور مبالغہ آمیز بناکر چیستاں کی حیثیت دیدی لیکن ایسے شاعروں کی قدر نہ ان کے زمانہ میں ہوئی اور نہ آج ہو رہی ہے اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ دور حاضرہ کے مشاہیر شعراء نے غزل کے محدود دائرہ کو بہت وسیع کر دیا ہے اور موجودہ اُردو شاعری جس نہج پر جا رہی ہے وہ ہر آئینہ صوری و معنوی حیثیات سے بہت بلند ہے۔

دور حاضر میں ہندوستان کے مردم خیز "جواہر ریز اور گوہر بیز" صوبہ پنجاب سے جس قسم کی آزاد شاعری کا انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے تیور دوسرے ہیں اور رنگ سخن کچھ اور ہی ہے اس قسم کی شاعری کی ترویج واشاعت میں پنجاب کی رعایت سے "پنج شاعر" (پروفیسر فیض احمد فیض میراجی، ن م راشد، محمود جالندھری اور ڈاکٹر تاثیر) کا بڑا ہاتھ ہے ان پانچوں سواروں نے باقاعدہ ایک جدید شاعری کا مدرسہ قائم کیا ہے جس میں نہ فن عروض کی ضرورت ہے نہ ردیف وقافیہ کی تلاش اور نہ بحروں کے لئے سرگردانی یہ پانچوں سوار مروجہ اُردو شاعری سے بیزار ہوکر (یا تھک کر) نئی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے ہیں یہ واقعہ ہے کہ اس شاعری میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی جس وقت چند ناموزوں فقرے کسی جگہ جمع کر دئے گئے

یہ "پنچ شاعری" شروع ہوگئی اس انقلابی شاعری کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند چھوٹے بڑے جملوں کو اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کانوں کو بھلا معلوم ہو اور جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے لیکن ان نقروں میں آپس میں مطلق ربط نہ ہونا چاہئے ان "پنچ شاعروں" میں (پنشاعروں میں نہیں!) ن۔م راشد اور میراجی کی شاعری میں ان کے معاصرین کے مقابلہ میں بظاہر یہ فرق ہے کہ ان کی شاعری نثر کا اچھا نمونہ ہے اور یکسر ابہام لیکن شاعرانہ لطافتوں سے شکر ہے کہ ان کی شاعری کو کوئی علاقہ نہیں مخمور جالندھری کی شاعری انکے معاصرین کے مقابلہ میں نسائی جذبات اور احساسات کے بیدار کرنے میں بڑی ممد اور معاون ثابت ہوتی ہے۔ مخمور بذاتہ بہت جری ہیں وہ موجودہ رسم و رواج کی کورانہ تقلید کو مطلق پسند نہیں کرتے بلکہ تہذیب و تمدن کے مقررہ حدود سے بھی بے نیاز ہو کر اپنی شاعری میں آرٹ کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں (خواہ کسی بڑے طبقہ کی نگاہیں ان کی اس عام آزاد خیال اور قواعد رسمیہ سے بے نیازی کو دیکھکر زمین میں گڑجائیں) وہ تو "ادب برائے زندگی" (قسم) کی شاعری "صحیح آرٹ" کے طریقہ سے پیش کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کی شاعری اپنے معاصرین کے مقابلہ میں سب سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے وہ بہکتے کم ہیں لیکن "کہنے" کے مقابلہ میں "کر گزرنے" کے زیادہ قائل ہیں اور سیاسی اصطلاحات سے کام لینا خوب جانتے ہیں اور یہی انکی شاعری کا ماحصل ہے فیض کی شاعری ایک دوسرے ہی رنگ پر جا رہی ہے انکی شعلہ نوائی انقلاب کے تیز دھارے میں بہی چلی جا رہی ہے لیکن شکر ہے کہ فیض کی شاعری میں آرٹ کے نمونے نظر نہیں آتے۔

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے اس خود ساختہ (بزعم خود ترقی پسند) انقلابی پنج شاعروں کی جماعت میں چند مخصوص الفاظ و محاورات محفوظ کرلئے گئے ہیں کہ جن کو اگر وہ استعمال نہ کریں تو انکی شاعری آرٹ کا نمونہ نہیں کہی جاسکتی ان پنج شاعروں کی کوششوں کو شاعری کہنا حقیقتًا لفظ شاعری کی توہین ہے کیونکہ اُن کی (پنج شاعروں کی) شاعری یکسر ابہام اور خالص نثر ہوتی ہے ہر شاعر سماج کا رونا روتا ہے اور ہنگامی اور اعصابی کیفیات کو پیدا کرکے آزاد نگاری اور فحاشی کا حق ادا کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتا ہے اور شاعرانہ کمالات میں ندرت اور تازگی پیدا کرنے کے لئے "تشریح الابدان" کا سبق دہرایا جاتا ہے مروجہ آداب اور شرم و لحاظ کو دور کرکے اس گمراہ کن طبقہ کی شاعری میں "تحریک" "رجائیت" "نفسیاتی محسوسات" اور "جنسی آسودگی" پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ہر وہ شخص جو چند مہمل اور بے ربط جملوں کو جمع کرسکتا ہے۔ آرٹسٹ تسلیم کرلیا جاتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اس شاعری میں بڑی "خوبیاں" ہیں اوّل تو طبیعت ہر وقت موزوں رہتی ہے دوسرے چھوٹے بڑے جملوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تیسرے جو وقت قلم اُٹھایا اور کچھ بے تکی باتیں لکھ دیں وہ آرٹ کا ایک نمونہ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

ابھی حال میں پنجاب کے مشہور ترقی پسند شاعر ن۔م راشد کا ایک مجموعۂ کلام "ماورا" کے نام سے شائع ہوا ہے (جو اس جماعت نشر و اشاعت کی وجہ سے انجیل کی حیثیت رکھتا ہے) اس مجموعہ میں ایک سے ایک "جواہر ریزے" موجود ہیں جنکی نظیر فی زمانہ مشکل سے ملے گی آپ بھی ان ادبی شہپاروں میں سے ایک پارہ سنئے جو "گناہ" کے نام سے موسوم ہے۔

آج پھر آ ہی گیا
آج پھر رُوح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آکے مجھے
آج پھر آ ہی گیا
ہوش آیا تو ہیں دہلیز پہ افتادہ تھا
خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مرے رُوح کے تار
آج پھر آ ہی گیا

روزنِ در سے لرزتے ہوئے دیکھا میں نے
خرم و شاد سرِ راہ اُسے جاتے ہوئے
سالہا سال سے مسدود تھا پیمانہ میرا
اپنے ہی بادہ سے لبریز تھا پیمانہ میرا
اس کے لوٹ آنے کا امکان نہ تھا
اس سے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی

ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ اس قسم کی شاعری کا مفہوم کیا ہے۔ اگر

اس قسم کی شاعری کو سختی سے نہ روکا گیا تو ایک دن متعدی صورت اختیار کرکے وہ ہندوستان میں ایک شرمناک اور قابل نفرت انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس خطرناک مرض کے جراثیم ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں بڑی تیزی سے نشو ونما پا رہے ہیں جن کے استیصال کی فوری ضرورت ہے۔

اس شاعری کی ابتدا ایک لفظ سے ہوتی ہے اور بقول "جلال ملیح آبادی کے ایک لفظ سے شروع ہو کر اس قدر بڑھتی ہے جیسے الف لیلیٰ کے کسی قصے کی سرخی مثلاً "جانا شہزادے کا بیچ باغ کے اس پریوش کے پاس سوتے ہوئے اس شوخ کو اور سرہانے کی چھڑی پائنتی اور پائنتی کی چھڑی سرہانے کرنا" یہ اس شاعری کے عروجی مصرعے ہوتے ہیں جو شروع ایک لفظ سے ہوتے ہیں مثلاً ایک لفظ جیسے "گل" اب دوسرا مصرع ہوگا "ایک گل" اور تیسرا ہوگا "ایک گل تھا" چوتھا "ایک گل تھا خموش" پانچواں "صحرا میں ایک گل تھا خموش" اب یونہی جب یہ شاعری عروج پر پہنچے گی تو دسواں یا چودھواں مصرع یقیناً یوں ہوگا۔

اندھیری رات کی پرچھائیوں کا زیر و بم ——— اللہ ری تاریکی

اس عروج کے بعد جب رد بہ زوال ہوگا تو یوں ہو جائے گا

وہ سایہ کہ جو تھراتا ہے صحن باغ گلشن پر
مری آواز کی تانوں کی محفل ہوگئی رسوا
نہ جانے دل گرجاتا ہے مرے پہلو میں اب کیونکر
گرج سے جس کی گونجا کوہ و صحرا
اٹھا ایسے میں مطرب ساز اپنا

بہت ہے روح لرزاں
یہ گلشن کی ہوائیں
اور سازِ زندگی
میرا

بروایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس شاعری کا آشیانہ اس قدر بلند ہے کہ عقل کا اتنی بلندی پر پہونچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے ایک نظم عرض ہے اسے سمجھنے کی کوشش کیجیے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی عجیب روزگار ترکیبوں سے بھی لطف اٹھائیے اس کی سرخی ہے ''اونٹ کا خواب'' یعنی ایک اونٹ کسی قدر بچوں والا ''معصوم خواب'' کھڑے کھڑے سوتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

خواب ایک اونٹ نے دیکھا اک روز
کہ بکرو کر نکیل
ایک چوہا لیے جاتا ہے کسی بل میں مجھے
لال انگارہ ہیں آنکھیں اس کی
خول کبوتر سے سفید
اور پھر بل کا کیا
سیکڑوں اونٹوں نے حصار
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے تلوار تفنگ
چھڑ گئی خوب ہی جنگ

وہ نہیں دور وہ کہسار پہ ہلکا سا غبار
نعرۂ جنگ سے کانپا اکبار
وہ خنک جوش و خروش
ایک چوہے نے مگر
کھینچ کر ماری جو تلوار اس کو
سر مرا کٹ کے گرا
اونٹ مغلوب ہوئے قید کیا چوہوں نے
میرے مرنے کی خبر
لیڈی اونٹنی کو ہوئی
سرسراہٹ سی ہوئی
دل میں مرے
اور پھر اشک نکل آئے کئے ٹمٹرے ادھر
اونٹنی رونے لگی
میری جب آنکھ کھلی
دیکھتا کیا ہوں
کہ میری گاڑی
ایک جنگل میں خموش
مضمحل اور رکی
دیر سے کھیت کے باہر ہے کھڑی
میں نے سوچا کہ نہ جائیگا کہیں بھی آقا
گاڑی تب سے کھڑے ہوائیں مفرور

میری منزل بھی کڑی
ابھی جنگل سے بہت دور تھا میں
کیسا مضحک تھا یہ خواب
رات کی رات وہاں لیٹ رہا
پھاک کر خاک گذرگاہوں کی
لیڈی اوٹنی کی بھی سنتے چلئے
وہ بڑھاپے ہوئے منزل پہ قدم
پاؤں تھے تند ہواؤں سے بھی تیز
شوخ اداؤں سے بھی تیز
خواب تھا خواب تھا سارا جھوٹا
اونٹ تھا کوئی نہ کوئی جوہا

وقت نہیں ہے ورنہ ان پنچ شاعروں[1] کے اور بھی اعلیٰ نمونے آپکے سامنے پیش کئے جاتے سخت ضرورت ہے کہ اس قسم کی شاعری سے ہمارے نوجوانوں کے دماغوں کو محفوظ رکھا جائے .... یہ واقعہ ہے کہ صحیح معنوں میں یہ اُردو کے ساتھ دشمنی ہے بمبئی میں جوان بخت جواں سال خان بہادر راجہ محمد امیر احمد خاں والیٔ محمود آباد کی صدارت میں اس فحش نگاری اور آزاد خیالی کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے اور لکھنؤ میں بھی مشہور خوش گو شاعر

---

[1] افسوس ہے پروفیسر فراقؔ صاحب کے یہاں ان شاعروں کا کلام نہ مل سکا، ساقیؔ، ہمایوںؔ ادب لطیف، نیا ادب وغیرہ اس جدید شاعری کی ترویج و اشاعت میں بہت مشہور ہیں لیکن افسوس ہے کہ مجھکو مطلق اور نمونے نہ مل سکے اگر کچھ نمونے شامل کر دیئے جائیں تو مضمون مفید ہو جائیگا۔" ناظرؔ"

سیّد آل رضا صاحب رضا کی صدارت میں ترقی پسند طبقہ کی طرف سے عریانت اور فحاشی کی ترویج کرنے والوں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس سے یہ امید قوی ہے کہ اس ترقی پسند "پنج شاعر" طبقہ کی ہمتیں یقیناً پست ہو جائیں گی لیکن یہ کافی نہیں ہے ایک متحدہ ادبی قومی محاذ قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس وبا کو جلد سے جلد دور کیا جا سکے۔

[illegible]

صبا اکبرآبادی

[illegible]

[illegible]

صبا اکبرآبادی

[illegible]

[illegible]

صبا

آزاد نظم

از پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی

اجنبی عورت

ایشیا کے دور اُفتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک دیوارِ ظلم
میرے اُن کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے اُن کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر، برہنہ راہ رَو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند
یہ گذرگاہوں پہ دیوآسا جواں

جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بیباک مزدوروں کا سیلابِ عظیم!
ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
اُن کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں

(ن۔م۔ راشد)

گذشتہ چند سال کے اندر اُردو ادب میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوا ہے اسے "آزاد نظم" کہتے ہیں۔ اس کا ایک اعلیٰ نمونہ اوپر درج ہے۔ یہ چیز ہماری ایجاد نہیں، یورپ کی پیداوار ہے۔ ہم نے تو حسبِ معمول صرف نقالی کی ہے۔ آزاد نظم جنگِ عظیم سے پہلے فرانس میں پیدا ہوئی، فرانس سے امریکہ گئی، امریکہ سے انگلستان پہونچی اور وہاں سے ہندوستان میں آئی۔ فرانسیسی زبان میں اسے "ورلبر" (VERS LIBRE) کہتے ہیں۔ انگریزی میں "فری ورس" (FREE VERSE) اسی کا لفظی ترجمہ ہے۔ اور "فری ورس" کا لفظی ترجمہ "آزاد نظم" ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد سے یورپ اور امریکہ میں "فری ورس" کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔ اور اس وقت تو وہاں اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اُس نے پرانی وضع کی باضابطہ نظم کو تقریباً بے دخل کر دیا ہے کسی شے کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی جامع اور مانع تعریف کی جائے لیکن "اس صنفِ شعر کی کوئی قطعی تعریف ابھی تک معیّن نہیں ہوئی ہے۔ دراصل اسکی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ سوائے استثنا کے اور کسی طریقے سے اسکی تعریف کرنا

دشوار ہے ۔ روایتی قافیہ، بحر اور وضع کو ترک کر کے اس میں صرف "آہنگ" (cadence) کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ "فری ورس" کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ شعر کا دار و مدار مضمون پر ہے نہ اس کی وضع پر نہیں [1]۔

آزاد نظم چونکہ "فری ورس" کی نقل ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کی اصل یعنی فری ورس کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کر دی جائیں تاکہ آزاد نظم کے مختلف پہلوؤں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ فری ورس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں کئی بحروں کا امتزاج ہوتا ہے۔ دوسری وہ جس میں بحر سرے سے ہوتی ہی نہیں لیکن ایک بات دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ کوئی فری ورس بھی کسی خاص نمونے کے مطابق نہیں ہوتی۔

"فری ورس کی صنف میں ایسی نظمیں کافی مقدار میں موجود ہیں جو حقیقی معنی میں نظمیں کہلانے کی مستحق اور مطالعہ کے قابل ہیں لیکن یہ حقیقی نظمیں، اگر غور سے انکا مطالعہ کیا جائے تو باضابطہ نظموں سے چنداں مختلف نہیں ہیں۔ فرق ہے تو صرف اسی قدر کہ وہ کسی بحر میں نہیں لکھی گئیں۔ فری ورس کو دراصل نظم اور نثر کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہئے فری ورس کا بیشتر حصہ ایک باآہنگ نثر ہے۔ اُسے اس طرح چھاپا جاتا ہے کہ آہنگ نمایاں رہے۔ میری ڈتھ (MERVDITH) وغیرہ کی نثر میں اس قسم کے ٹکڑے موجود ہیں جو فری ورس سے کسی طرح مختلف نہیں، چنانچہ پروفیسر لونگسٹن لوز (LIVINGSTON LOWES) نے ان ادیبوں کے کلام سے نثر کے ٹکڑے نکال کر اور فری ورس سے اُس کا مقابلہ کر کے دکھا دیا کہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فری ورس اپنی وضع کے لحاظ سے کوئی نئی چیز نہیں۔ اور جو لوگ اسے نظم

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ فری ورس۔

کہتے ہیں وہ نظم کے معنی کو اس حد تک وسیع کر دیتے ہیں جو اب تک عام طور پر نثر کے مفہوم میں شامل رہے ہیں[1]۔

فری ورس لکھنے والوں میں بعض کا قول ہے کہ فری ورس کے متعلق انکا کوئی معینہ نظریہ نہیں ہے۔ پرانی وضع کی باضابطہ نظم کے نمونے اُن کے نزدیک تشفی بخش نہیں جب وہ اپنے شدید جذبات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو محض اپنی طبیعت کی رہنمائی میں اُن کے اظہار کے لئے کوئی سی وضع اختیار کر لیتے ہیں اور جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں آہنگ کو اپنی ہنگامی تحریک کے مطابق بدلتے جاتے ہیں۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ فری ورس اپنی مخصوص صفات کیساتھ ایک وضع معین رکھتی ہے۔ اور انھوں نے وہ اصول بھی بیان کئے جن پر فری ورس کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ امریکی شاعرہ مس ایمی لوول (AMY LOWEL) اس گروہ کی خاص نمائندہ ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ اس قسم کی نظم کو فری ورس کے بجائے "نظم باآہنگ" (candenced verse) کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ فری ورس کے لکھنے والے آزادی کے جویا نہیں بلکہ وہ ایک سخت تر نظام چاہتے ہیں[2]۔

فری ورس کے لکھنے والوں میں سے بعض نے توازن اور تناسب کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے۔ اب رہی فری ورس کے بندوں کی ساخت تو اس کا سمجھنا ذرا دشوار ہے لیکن اس کے مشابہ ایک چیز (PSALMS) میں مل سکتی ہے۔

---

[1] THE NATURE OF ENGLISH POETRY BY L.S. HARRTS, P 126.

[2] Contemporary American Literature by Manly & Rickert, page 56.

جملے لمبائی میں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن سب کا اتار چڑھاؤ ایک ہی انداز پر رکھا جاتا ہے۔ فری ورس کچھ تو باضابطہ نظم کی طرف سے بے رغبتی کی بنا پر وجود میں آئی اور کچھ اس عقیدے کی بنا پر کہ ہماری دنیا بڑی سرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے لہذا نئے ذرائع اظہار کی ضرورت ہے۔ فری ورس کے حامی کہتے ہیں کہ باضابطہ نظم خلوص اظہار کے راستے میں معین ہونے کے بجائے ایک رکاوٹ ہے۔ جو شخص قافیہ تلاش کرتا ہے اور اپنے الفاظ کو ایک خاص بحر میں "فٹ" کرنا چاہتا ہے وہ اکثر اپنے مصرعوں میں غیر ضروری الفاظ بھر دیتا ہے۔ یہ لوگ ملٹن اور شیکسپیر کی بہترین نظموں میں بھی اس قسم کی کوتاہیاں ثابت کرتے ہیں۔

فری ورس لکھنے والوں میں سے ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ ہمیں بعض نئی کیفیات کا اظہار مقصود ہے اور کسی پرانی وضع کی باضابطہ نظم میں اسکی گنجائش نہیں بعض ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی کا آہنگ (Rhythm) بدل گیا ہے چنانچہ دورحاضر کی "جاز" اور "بیلے" (Jazz & Ballet) قسم کی موسیقی میں اس نئے آہنگ کی گونج پائی جاتی ہے۔ لہذا اگر نظم کو زندگی کے ساتھ کوئی قریبی علاقہ رکھنا ہے تو نظم میں بھی اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔

فری ورس میں جہاں خرابیاں ہیں وہاں خوبیاں بھی ہیں، مثلاً:

(۱) کلام میں تعقید نہیں ہونے پاتی کیونکہ جملوں کی ترکیب اکثر و بیشتر نثر کے مطابق رہتی ہے۔

(۲) قافیہ کے لزوم سے نجات مل جاتی ہے۔

(۳) مقررہ لفظوں، فقروں اور تشبیہوں کے استعمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی، جو باضابطہ نظم کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

(۴) کلام حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے۔ کہنے والے کو جو کچھ کہنا ہو وہی کہہ سکتا ہے۔ کوئی لفظ "برائے بیت" استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۵) مضمون کی طرف توجہ مرکوز رہتی ہے۔

اب فری ورس کی چند موٹی موٹی خامیاں بھی سُن لیجئے۔

(۱) بحر کی وجہ سے کلام میں جو زور اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے فری ورس اس سے محروم رہتی ہے۔ بحر کی وجہ سے سننے والے میں کلام کی پذیرائی کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر الفاظ کو ایک نیا زور اور نیا حُسن بخشتی ہے اور سننے والے پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ فری ورس میں یہ بات نہیں۔

(۲) فری ورس میں اس امر کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ مصرعوں پر کس طرح زور دیا جائے۔ مصرعوں کو ترتیب سے پڑھنے والے کو یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر ٹھہرنا اور کس مقام پر آواز کو پست کرنا چاہئے لیکن خود مصرع کے اندر اس قسم کی کوئی علامت موجود نہیں ہوتی۔

(۳) باضابطہ نظم کے مقابلے میں فری ورس کو آہنگ کے ساتھ پڑھنا بہت دشوار ہے۔ ہر شخص کو اس کے آہنگ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

(۴) فری ورس کا سب سے بڑا عیب وہ چیز ہے جو بظاہر اُس کا حُسن نظر آتی ہے فری ورس میں شاعر اور اُس کے واسطۂ اظہار کے درمیان کسی قسم کی کشمکش کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ کشمکش ہی وہ چیز ہے جسے ہمارے فارسی اور اُردو کے اساتذہ نے "جگر کاوی" سے تعبیر کیا ہے اور جس کی بدولت کلام کو چار چاند لگ جاتے ہیں جب ہم اعلیٰ درجہ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "نمونہ" شاعر کے راستے میں حائل ہونے کے بجائے عام طور پر اُسے کامل اور مکمل اظہار میں مدد دیتا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ کوئی نظم پوری کی پوری شاعر کے دماغ میں موجود ہوتی ہے

تاکہ اُسے کسی قالب میں ڈھال دیا جائے یا بزور اس میں ٹھونس دیا جائے۔ درحقیقت جب تک عمیق جذبات الفاظ سے چھوتے نہیں اور وزن سے مس نہیں کرتے اسوقت تک نظم شاعر کے دماغ میں پیدا ہونا شروع ہی نہیں ہوتی۔ بحر کوئی سانچا نہیں ہے کہ نظم کو اس میں بھر دیا جائے۔ بلکہ وہ نظم کی ساخت میں شاعر کی ایک عملی شریک کار ہے شاعر کے مزاج کی حالت اور اس کا شدید احساس یہ دونوں مل کر نظم کے لئے بحر اور وضع معیّن کرتے ہیں اور پھر ان دونوں کی مدد سے نظم وجود میں آتی ہے۔ آئیے اب ان مقدّمات کی روشنی میں اُردو کی فری ورس یعنی آزاد نظم کا جائزہ لیں۔

آزاد نظم شروع سے آخر تک کسی ایک بحر میں تو نہیں لکھی جاتی لیکن عموماً اس میں جا بجا کسی ایک ہی بحر میں متعدد مصرعے موجود ہوتے ہیں۔ عام اصول اس کا یہ ہے کہ لکھنے والا کسی بحر کا ایک سالم رکن انتخاب کر لیتا ہے اور ہر سطر یا مصرع میں اگر اُسے مصرع کہا جا سکے، اسی رکن کی تکرار ہوتی ہے۔ رکن کی تکرار ہر سطر یا مصرع میں برابر نہیں ہوتی اس لئے مصرعے لمبائی میں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ کوئی مصرع صرف ایک رکن کا ہوتا ہے کسی میں دو یا تین کسی میں چار یا پانچ، اور کسی میں پندرہ بیس رکن بھی ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر مصرعے کے خاتمہ پر ایک مزاحف رکن کا استعمال کیا جاتا ہے بعض اوقات دو مختلف بحروں کے دو رکن، سالم یا مزاحف کو باہم ملا کر ایک رکن قرار دیا جاتا ہے۔ یہ باتیں مندرجۂ ذیل مثالوں سے اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گی۔

"سنگِ آستاں" از میراجی

(۱) سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے	مفاعیلن، مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن
(۲) جوانی کو	مفاعیلن
(۳) ہے نغمہ جنھیں خوابیدہ انھیں تاروں کی حرکت سے	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔

(۴) میں نے آؤ نگاہستی کو مجسّم شکل کی صورت — مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔
(۵) انھیں تاروں کو خوابوں سے جگانے دے — ″ ″ ″
مجھے، اے رات کے ساقی — ″ ″
(۶) مجھے معلوم ہیں باتیں — ″ ″
(۷) وہ باتیں جو اچھوتی ہیں، پرانی ہیں — ″ ″ ″

آپ نے دیکھا کہ ہر سطر (یا مصرع) "مفاعیلن" کے آہنگ پر ہے۔ چھٹی سطر میں دوبار، ساتویں میں تین بار، پہلی تیسری اور چوتھی میں چار بار اور پانچویں میں پانچ بار "مفاعیلن" کی تکرار ہے۔ پہلی تیسری اور چوتھی (نیز ساتویں) سطریں باضابطہ مصرعے ہیں۔ "مفاعیلن" بحر ہزج کا رکن سالم ہے۔ سالم اس رکن کو کہتے ہیں جس میں تغیر نہ ہوا ہو۔ اور جب اس میں کوئی تغیر ہو جائے تو اسے مزاحف کہتے ہیں مثلاً مفاعیلن جب مفاعلن، فاعلن یا مفاعیل کی صورت اختیار کرے تو اسے رکنِ مزاحف کہیں گے۔

"خودکشی" از ن م راشد

آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں — فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلن۔
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس — فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن فاعلن۔
اس کے تخت خواب کے نیچے مگر — ″ ″ فاعلن۔
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو — ″ ″ ″
تازہ و رخشاں لہو — ″ فاعلن

"فاعلاتن" بحر رمل کا رکن سالم ہے اور "فاعلن" رکن مزاحف۔ مندرجِ بالا مثال میں ہر سطر کے آخر میں رکن مزاحف آیا ہے۔ شروع سے آخر تک پوری نظم میں وزن کا یہی اصول پیش نظر رکھا گیا ہے۔ پہلی چار سطریں بحر رمل میں باقاعدہ مصرعے ہیں۔

ہم ابھی بیان کر چکے کہ بعض اوقات آزاد نظم کی ایک سطر (یا "مصرع") اتنی طویل ہوتی ہے کہ اُس میں ایک رکن کی بنا دہ بیس مرتبہ تکرار ہوتی ہے۔ مثلاً میراجی کی ایک نظم "محرومی" کا انھیں کے بقول ایک "مصرع" ہے:۔

"تم آؤ تو گونج اٹھے تنہائی دالان میں آنے جانے کی آہٹ سے ہنگامہ پیدا ہو لیکن سہری کے آغوش کی لرزشوں میں تھیں اس کا احساس بھی ہونے پائے تو ذرہ ہے میرا"

اس "مصرع" میں بیس مرتبہ "فعولن" کی تکرار ہوتی ہے۔ مگر اتنے لمبے مصرعے شاذ و نادر ہی لکھے جاتے ہیں۔

آزاد نظم میں اگرچہ وزن کا صرف اسی قدر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اسکی ہر سطر میں کسی ایک رکن کی غیر معین تکرار ہوتی ہے مگر اس کے باوجود آزاد نظم لکھنے والے اس ادنیٰ سی ذمہ داری سے بھی پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوتے اور جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اصولاً سطروں (یا مصرعوں) کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے کہ وزن کے لئے جو رکن اختیار کیا گیا ہے وہ ٹوٹنے نہ پائے۔ ورنہ کلام کا سارا آہنگ کہ اُسی پر یہ ساری عمارت کھڑی ہے، یکسر فنا ہو جائے گا چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"بے بسی" از انجم رومانی

(۱) وہ مری شمع کہن	فاعلاتن فعلن
(۲) اب ہوئے تصور کے دھندلکوں میں	فعلن۔ فعلاتن
چراغاں جس سے	فعلاتن۔ فعلن۔
(۳) اور یہ قمقمۂ نو	فاعلاتن۔ فعلاتن۔

اصولاً تیسری سطر کا آخری رکن "فعلن" ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہر سطر کو اسی پر

تمام ہونا چاہیے، مگر "فعلاتن" ہوگیا۔

"ایام گذشتہ" از ضیا فتح آبادی

مجھے بیتے ہوئے ایام پھر کیوں یاد آتے ہیں — مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن
محبت کے وہ لمحے، ہاں وہی لمحے — " " "
جنھیں ترسیں سمجھتے ہیں جہاں والے — " " "
مگر جنکے تصور سے لرز جاتا ہے دل میرا — " " " مفاعیلن
محبت کے وہ ہیبتناک لمحے، — " " مفاعی،

پوری نظم کا آہنگ "مفاعیلن" ہے لیکن مندرج بالا بند کی آخری سطر میں مفاعیلن کے بجائے صرف "مفاعی" ہی رہ گیا۔

"محرومی" از میراجی

میں کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارا نہ دیکھا
تو اس پر تعجب نہیں ہے نہ ہوگا"

اس نظم کا ہر "مصرع" فعولن کی تکرار سے بنا ہے لیکن اس "مصرع" میں
مسہری کے آغوش کی لرزشوں کا مجھے خواب بھی اب نہ آئے گا۔
آخری رکن فعولن کے بجائے مفاعیلن ہو گیا۔

"ناکام" از ظہیر الدین ایم اے

پہلا بند: خاموش سی، بے ضرر سی لڑکی ــــ معصوم سی بھولی بھالی ــــ تو جانتی ہے کہ تجھ میں کتنی طاقت ہے جان کو روندنے کی۔
پوری نظم مفعول، مفاعلن فعولن۔ یا مفعولن۔ فاعلن فعولن کی تکرار پر بنی ہے لیکن چوتھے بند کا آخری مصرع۔
جس میں افلاک کی گردشوں سے، مجھ کو عافیت اور پناہ ملتی، میں آہنگ قائم نہ رہ سکا۔

اگر اس طرح ہوتا: " افلاک کی گردشوں سے جس میں، مجھ کو امن و پناہ ملتی " تو صحیح ہو سکتا تھا۔ پہلے بند کا دوسرا " مصرع " بھی محلِ نظر ہے۔

غرض آزاد نظموں میں اس قسم کی خامیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔

آزاد نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر سمجھ میں نہیں آتیں۔ انگریزی فری ورس کا تو صرف پڑھنا ہی دشوار ہے۔ اردو کی آزاد نظم کا سمجھنا بھی سہل نہیں بلکہ کم سے کم راقم الحروف جیسا متوسط درجہ کا لکھا پڑھا آدمی تو انھیں آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ آزاد نظم کے لکھنے والوں میں جو لوگ دوسرے اور تیسرے درجہ کے ہیں اُن کا کلام تو سمجھ میں آ بھی جاتا ہے لیکن جو لوگ صفِ اوّل میں کھڑے ہیں اُن کا کلام جب تک وہ خود یا انھیں کی جماعت کا کوئی دوسرا شخص اس کی تفسیر نہ کرے، سمجھا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ن۔م۔ راشد کی نظم " زنجیر " کے صرف ایک پہلے بند کی تشریح کے لئے۔ اور وہ بند یہ ہے۔ (گوشۂ زنجیر میں ---- اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی۔ سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی ---- دشمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی ---- یہ بھی تو شبنم نہیں ---- یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں)
میراجی کو پورا ایک صفحہ سیاہ کرنا پڑا اور پھر بھی مطلب واضح نہ ہو سکا تو پندرہ سطر کا ایک مکالمہ ترتیب دینا پڑا۔ بایں ہمہ بات جہاں تھی وہیں کی وہیں رہی (دیکھو "ادبی دنیا" لاہور، جنوری ۱۹۴۲ء صفحہ ۴۵)

افسوس ہے کہ جگہ کی کمی اجازت نہیں دیتی کہ مثال کے لئے متعدد پوری پوری نظمیں نقل کر کے واضح کیا جائے۔ پھر بھی نمونے کے طور پر ہم ایک نظم ضرور پیش کریں گے۔

"سنگِ آستاں" از میراجی

"سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے ---- جوانی کو ---- ہے نغمہ جس میں خوابیدہ، انھیں تاروں کی حرکت سے ---- میں لے آؤں گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت

— انھیں تاروں کو خوابوں سے جگانے دے مجھے اے رات کے ساقی! — دکھانے
دے مجھے جلوہ تاروں کے الجھنے کا — اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر اپنے نگاہوں
میں — جو ہے باقی — جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی کے آنچل میں۔
"پکڑ کر ہاتھ میں سنجھی کو اس دھرتی کے جنگل میں — اسی خلوت کے محمل میں
— ترے دل میں — جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے — اسی نغمہ کو جو
سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں"
"مجھے معلوم ہیں باتیں — وہ باتیں جو اچھوتی اور پرانی ہیں — مگر
نادان ہیں جذبے — ارادہ ہے کہ لے کر آج ان جذبوں کو میں تاریک غاروں
میں — بنوں گا ہم سفر تیرا"
"چل آ! رنگین کہانی کو — شروع عشق کی منزل سے لے بھاگیں —
اسے اس رات کے پہلے اندھیرے میں — وہاں پر لے کے پہونچا دیں — جہاں
ہے گو ہر مقصود پوشیدہ نگاہوں سے — سہانی گرم آہوں میں"
نظم کا عنوان دیکھکر قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسمیں یا تو
"سنگِ آستاں" کی تعریف (مدح نہیں) کی گئی ہوگی، یا سنگِ آستاں سے تعلق
رکھنے والی دوسری چیزوں کا ذکر ہوگا. یا شاعر نے اپنے محبوب یا مرشد کے سنگِ آستاں
سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہوگا. لیکن پوری نظم کو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی
یہ پتا نہیں چلتا کہ نظم کا سنگِ آستاں سے کیا تعلق ہے. پہلے بند میں رات کے ساقی
سے خطاب کیا گیا ہے. معلوم نہیں کہ رات کا ساقی کون شخص ہے. اور وہ کوئی شخص
ہے یا خود رات سے مراد ہے. پھر اُس رات کے ساقی کو حکم دیا گیا ہے کہ دو سکھا نغمہ محبت کا
یہ خود ایک انوکھی بات ہے. ساقی کا کام شراب پلانا ہے. نغمہ سکھانا نہیں نغمہ تو
مطرب سکھا سکتا ہے. دوسرے بند میں شاعر صاحب سنجھی یا پکھیرو کو ہاتھ میں پکڑ

خلوت سے محل میں در آتے ہیں اور مخاطب کے جسم کے محبوب تاروں میں جو نغمے سوئے ہوئے ہیں انھیں بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھید اب بھی نہ کھلا کہ آپ کا مخاطب کون ہے۔ آیا وہی رات کا ساقی، یا سنگِ آستاں یا کوئی اور تیسرے بند میں نادان جذبوں کو ساتھ لے کر شاعر صاحب تاریک غاروں میں اپنے مخاطب کے ہم سفر بننا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخاطب کوئی تاریک غاروں میں بسنے والی مخلوق ہے۔ چوتھے بند میں عشق کی رنگین کہانی کا ذکر ہے اور رات کے پہلے اندھیرے کا بھی۔ ظاہر ہے کہ عشق کی رنگین کہانی رات کے پہلے اندھیرے ہی میں مکمل ہوتی ہے۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر "سنگ آستاں" بیچارے کا پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں رہ گیا۔

جیسا کہ ہم ابتدا ہی میں بیان کر چکے ہیں آزاد نظم ہماری ایجاد نہیں۔ ہم نے تو حسب معمول صرف نقالی کی ہے۔ اس لئے اس کے موجدوں یعنی یورپ اور امریکہ والوں نے اس کی حمایت میں جو کچھ کہا ہے وہی ہم بھی اُردو کی آزاد نظم کی حمایت اور پابند نظم کی مخالفت میں دُہراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں:-

"بات یہ ہے کہ ادب کے اُس وقت کے تصوّر میں جب کہ ہماری بلند ترین شاعری ردیف وقافیہ کی قید میں تخلیق ہو سکی اور آج کے تصور میں بنیادی فرق پیدا ہو چکا ہے۔ اس وقت شاعری کا مقصد زندگی کی عکاسی یا خلوص، سوچ سمجھ اور سیدھے سادے طریقے سے اس کی مشکلات کا حل ڈھونڈنا نہیں بلکہ دماغی عیاشی اور تفریح تھا۔"

یہ خیال کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ اُس پوری جماعت کا ہے جو وزن اور قافیہ کی مشکلات سے بھاگ کر آزاد نظم کی سہولتوں کے دامن میں پناہ لینی چاہتی ہے

"سبحان اللہ" سے زیادہ اس نادر علمی تحقیق کی داد نہیں دی جا سکتی، مگر اس کی جانچ ضرور کی جا سکتی ہے۔ دعوے کے تین حصے ہیں۔

(۱) پرانی شاعری زندگی کی عکاسی نہیں کرتی۔

(۲) پرانی شاعری میں خلوص نہیں۔

(۳) پرانی شاعری زندگی کی مشکلات کا حل تلاش نہیں کرتی۔

ضمناً یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ بحر و قافیہ سے محروم نئی شاعری میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

"پرانی شاعری زندگی کی عکاسی نہیں کرتی" اس سے فاضل موصوف کا غالباً یہ مطلب ہے کہ جو مسائلِ حیات آج ہمیں درپیش ہیں اُن کا ذکر اور اُن کا حل پرانی شاعری میں موجود نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ جو مسائل اس وقت موجود ہی نہ تھے اُن کے متعلق شعرا کو کچھ سوچنے اور کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ اس وقت شروع نہیں ہوئی تھی۔ جمہوریت نے استبداد اور شہنشاہیت سے ایسی ٹکر نہیں لی تھی۔ پھر میرؔ و سوداؔ، میاں نظیرؔ اکبر آبادی، غالبؔ مومنؔ، ذوقؔ، ناسخؔ و آتشؔ، انیسؔ و دبیرؔ، اور داغؔ و امیرؔ کیونکر ان مسائل کو موضوعِ سخن بناتے۔ لیکن اگر زندگی کی عکاسی سے یہ مراد ہے کہ اُس دور میں زندگی کیونکر گذر رہی تھی۔ آدابِ معاشرت کیا تھے۔ تہذیب کے اصول و آئین کیونکر برتے جاتے تھے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگ کس طرح دلچسپی لیتے تھے کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے، کیونکر رہتے سہتے تھے۔ کیا مشاغل تھے۔ تفریحات کے کیا کیا سامان تھے۔ داد و ستد کے طریقے کیا تھے۔ شادی غمی کی رسمیں کیا کیا تھیں۔ لوگوں کے اخلاق و اطوار کیسے تھے۔ جنسی معاملات میں اُن کے خیالات کیا تھے۔ حیات بعد الممات کے عقیدے کا اُن کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑتا تھا

روحانی اور مادی ترقیوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ اگر ان امور کے اجمالی اور تفصیلی تذکرے کو زندگی کی عکاسی کہا جا سکتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پرانی شاعری (جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، قطعے، رباعیاں واسوخت اور نظم کے دوسرے تمام اقسام شامل ہیں) اُس دور کی زندگی کی اچھی طرح عکاسی کرتی ہے۔

رہا دوسرا اعتراض کہ پرانی شاعری میں خلوص نہیں، تو یہ بھی نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل کی شاعری میں نقالی زیادہ اور اصلیت کم ہے مگر بالکل مفقود نہیں۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ کسی اُستاد کا کوئی اچھا شعر سُن کر اہلِ ذوق تڑپ اٹھتے ہیں اور سر دھننے لگتے ہیں۔ خلوص کے بغیر کلام میں یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی کہ شعر تیر و نشتر کی طرح کلیجے میں اتر جائے اور سننے والا دل تھام کر رہ جائے۔ درحقیقت ہماری شاعری کے ہر دور میں خلوص کے ساتھ لکھنے والے بہت کم اور نقال زیادہ گذرے ہیں۔ خود آج بھی یہی حال ہے۔ عیش و عشرت کے گہواروں میں دن چڑھے تک خواب نوشیں کے مزے لینے والے، مزدور اور کسان کی بدحالی پر نظمیں لکھتے ہیں۔ پھر ایسے لوگ جو سرمایہ دار کے معنی فقط دولتمند اور مزدور کے معنی مٹی ڈھونے والا سمجھتے ہیں، جو معاشیات کے ابتدائی اصول سے بھی واقف نہیں، وہ بھی محض دوسروں کی تقلید میں مزدور اور سرمایہ دار کو موضوع سخن بناتے ہیں اور ان نقالوں کی تعداد حقیقی شاعروں سے کہیں زیادہ ہے۔ کیا ایسے ہی لکھنے والے ہماری زندگی کی گتھیوں کو سلجھا سکتے ہیں اور ہماری گوناگوں خصوصاً اقتصادی اور جنسی مشکلات کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں؟

میری عزیز بہن ڈاکٹر رشید جہاں نے جو ہندوستان کی ایک انتہا پسند

یونسٹ اور اُردو کی مشہور افسانہ نگار ہیں) دورِ حاضر کے ایک مشہور شاعر کے متعلق مجھے لکھا کہ "بھائی، میں نے آپ کے مزدور شاعر کی نظموں کے دونوں مجموعے پڑھ ڈالے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نظموں میں خلوص کا تو کہیں پتا بھی نہیں۔ عموماً جوش کی نقالی کی ہے۔ شاعر کا مطمح نظر اور اس کی ساری جد و جہد کا مقصد صرف اتنا ہے کہ "میں بورئے پر پیدا ہوا قالین پر مروں گا۔"

دورِ حاضر کے بیشمار شعرا جو محض دوسروں کی دیکھا دیکھی فقط اپنی نظموں میں سرمایہ دار کے دشمن اور مزدور کے دوست بن گئے ہیں، خود ہی خلوص سے بیگانہ ہیں۔ پھر اُن کی نظموں میں خلوص اور خلوص سے پیدا ہونے والی تاثیر کہاں سے آئے۔

وقت نے جیسے جیسے کروٹیں لیں اور زندگی میں گوناگوں انقلابات رونما ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر ہمارے میلانات اور رجحانات بھی بدلتے گئے۔ چنانچہ ہر دور کے رجحانات کا اثر معاصرانہ شاعری میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ یہی نئے رجحانات تھے جنھوں نے غزل کی باگ نظم کی طرف موڑ دی اور آزاد، حالی، اور اسمٰعیل کو پیدا کیا۔ ان کے بعد اکبر آئے۔ پھر اقبال سب پر چھا گئے۔ اب جوش اور اُن کے ہمنواؤں کا دور ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بحر اور قافیہ کی قید کے ساتھ ہی کہا ہے۔ مشکل سے مشکل فلسفیانہ نکات، نادر سے نادر شاعرانہ لطائف، نازک سے نازک حکیمانہ باتیں، جو ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں "پابند نظم" ہی میں انتہائے حسن کے ساتھ بیان کی ہیں۔ انھیں کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ اظہار خیال کے لئے "پابند نظم" ایک ناقص واسطہ ہے۔ نہ انھیں کبھی نظم معرّا یا نظم آزاد کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔

اقبال اگر آزاد نظم کے حامیوں کی طرح پابند نظم کی پابندیوں کو اپنی راہ میں حائل پاتے تو یقیناً وہ انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے۔ اور آزاد نظم کہنے والوں میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ نہ صرف اس لئے کہ قدرت نے انھیں شاعرانہ دل و دماغ اور شاعرانہ اہلیتیں عطا کی تھیں بلکہ انھیں دنیا کو ایک پیغام پہونچانا تھا۔ اور پیغام پہونچانے کے لئے سب سے زیادہ مؤثر طریقہ اختیار کرنا ہی دانشمندی کی بات ہے۔ اقبال نے سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہی اختیار کیا اور دنیا جانتی ہے کہ وہ طریقہ آزاد نظم نہیں۔

ہمارے شاعروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو صرف شاعر ہیں یعنی طبیعت موزوں پائی ہے۔ نظم کر سکتے ہیں لیکن خیالات اُن کے پاس نہیں۔ اس لئے وہ نقالی پر مجبور ہیں۔ دوسرے وہ جو شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں، خیالات اُن کے پاس موجود ہیں لیکن نظم میں انھیں خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ تیسرے وہ جنھیں مبدء فیاض نے اعلیٰ درجہ کے تخیل کے ساتھ ساتھ بہترین قسم کی قدرتِ اظہار بھی عطا کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خیالات کو رنگینیوں سے معمور، موسیقی میں ڈوبی ہوئی، سراپا حُسن نظموں کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو ایک حقیقی شاعر کی حیثیت سے احترام کے مستحق ہیں۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں، جو آزاد نظم میں بہترین قسم کے شاعرانہ اور حکیمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ صرف دوسرے درجہ کے لوگ ہیں۔ پہلی صف میں جگہ نہیں پا سکتے رہ گئی تشاعروں کی جماعت تو اُن سے تعرض کرنا محض بے سود ہے۔ ان کا کلام عموماً ان سے پہلے مر جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی اُن سے کچھ زیادہ عمر پا کر گوشۂ گمنامی میں جا سوتا ہے۔

اُردو میں آزاد نظم کے لکھنے والے، آزاد نظم کی برتری ثابت کرنے کے لئے
ہی دلائل پیش کرتے ہیں جو فری ورس کے مغربی حامیوں سے انھیں ملے
ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بحر اور قافیہ کی پابندیاں مضمون کا خون کر دیتی ہیں، اسکے
علاوہ نئی زندگی اور نئے حالات نے کچھ ایسے نئے خیالات اور نئے جذبات
ہمیں دیئے ہیں جن کے لئے ایک نئے واسطۂ اظہار کی ضرورت ہے پابند نظم کا
سانچا ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں باتیں
کبھی تو خود فریبی کے لئے اور کبھی عالم فریبی کے لئے کہی جاتی ہیں، درحقیقت
سے سراسر خلاف ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ لوگ پابند نظم میں حسن و خوبی
کے ساتھ اظہارِ خیال برتا در نہیں اور اپنی اس کوتاہی کو چھپانے کے لئے
خود پابند نظم ہی کو ناکارہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں۔ وہی مثل ہے کہ ناچ
نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر ہر قسم کے خیالات کو بحر اور قافیہ
کی قید کے ساتھ نہایت حسن و خوبی سے نظم میں ادا کر سکتا ہے۔ اور کسی بڑے
مشاق ناظم کا تو ذکر ہی کیا، خود راقم الحروف جسے سال میں دو چار شعر لکھنے کا
اتفاق مشکل ہی سے ہوتا ہے ایک آزاد نظم کو پابند نظم میں تبدیل کر سکتا ہے
اس شرط کے ساتھ کہ خیالات میں کوئی خاص تغیر نہ ہونے پائے اور نظم کا مجموعی
حسن نسبتاً بڑھ جائے۔ ذیل کی مثال سے قارئین کو کسی حد تک اس امر کا
اندازہ ہو سکے گا کہ یہ دعویٰ بے دلیل نہیں۔ آزاد نظم کے لکھنے والوں میں
میراجی ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی ایک نظم ہے "سنگِ آستاں"
پہلے ہم اسے وزن سے آراستہ کرتے ہیں۔

سنگِ آستاں

سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے
جوانی کو
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انھیں تاروں
کی حرکت سے
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت
انھیں تاروں کو خوابوں سے جگا لے
دے مجھے، اے رات کے ساقی!
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے الجھنے کا
اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے
نگاہوں میں
جو ہے باقی
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی
دیوی کے آنچل میں

مجھے اے رات کے ساقی، سکھا نغمہ محبت کا
(اور اسکے کیف میں) محسوس کرنے دے جوانی کو
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انھیں تاروں
کی حرکت سے
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت
انھیں سوئے ہوئے تاروں کو خوابوں
سے جگانے دے
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے الجھنے کا
اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے
نگاہوں میں
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی
دیوی کے آنچل میں

پکڑ کر ہاتھ میں تجھی کو اس دھرتی کے
جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں

پکڑ کر ہاتھ میں تجھی کو اس دھرتی کے
جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں، ترے (رمز آشنا)
دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
وہی نغمہ

جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب
تاروں میں

جو خوابیدہ ہے تیرے جسم کے محبوب
تاروں میں

مجھے معلوم ہیں باتیں
وہ باتیں جو اچھوتی اور پرانی ہیں
گر نادان ہیں جذبے
ارادہ ہے کہ لیکر آج ان جذبوں کو میں
تاریک غاروں میں
بنوں گا ہم سفر تیرا

وہ باتیں جانتا ہوں میں جو سرتاسر
اچھوتی ہیں
اچھوتی بھی، پرانی بھی، مگر نادان ہیں
جذبے
ارادہ ہے کہ لیکر ساتھ ان نادان جذبوں کو
بنوں گا آج تیرا ہم سفر تاریک غاروں میں

چل آ! رنگیں کہانی کو
شروعِ عشق کی منزل سے لے بھاگیں
اسے اس رات کے پچھلے اندھیرے میں
وہاں پر مل کے پہونچا دیں

(نہ لا اب دل میں کچھ وسواس) آ!
رنگیں کہانی کو
(چرا کر) ابتدائے عشق کی منزل سے
لے بھاگیں
اور اس شب کے اندھیرے میں وہاں پر
مل کے پہونچا دیں
جہاں ہے گوہرِ مقصود پوشیدہ نگاہوں سے

جہاں ہے گوہرِ مقصود پوشیدہ نگاہوں سے — سہانی گرم آہوں میں (محبت کی نگاہوں میں)
سہانی گرم آہوں میں

لیجئے بحر کا مرحلہ تو طے ہو گیا۔ اب صرف قافیہ کی منزل باقی ہے۔ پابند نظم کیلئے میں نے بالقصد وہی بحر اختیار کی ہے جس میں آزاد نظم کے بعض مصرعے پہلے سے موجود تھے۔ آزاد نظم میں بعض مصرعے نہایت پھیکے ہیں اور ان کی بندشیں نہایت سست ہیں۔ مفہوم بھی الجھا ہوا ہے اور کہیں کہیں "فی بطنِ شاعر" کا مصداق مگر انھیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے تاکہ الفاظ میں بھی تغیر نہ ہونے پائے۔ یہی خیالات اگر نظم ہونے سے پہلے میرے دماغ میں موجود ہوتے اور میں انھیں نظم کرتا تو موجودہ نظم کے مقابلہ میں اُس نظم کا حُسن ہزاروں درجہ زیادہ ہوتا۔ اب اس معرّا نظم کو قافیہ کا زیور بھی پہنا دیں اور دیکھیں کہ اس آرائش سے اس کے حسن میں کچھ اضافہ ہوتا ہے یا نہیں۔ نمونے کے لئے صرف دو ہی بندوں کی تبدیلِ ہیئت پر اکتفا کی۔

آزاد نظم	پابند نظم
سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے	سکھا دے نغمۂ الفت مجھے اے رات کے ساقی
جوانی کو	کہ میں بھی کر سکوں محسوس کیفیت جوانی کی
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انھیں تاروں کی حرکت سے	جو نہیں وہ تار چھیڑے میں سنے جو نغموں کی ہیں بستی
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت	مجسم ہو کے تیرے سامنے آجائیگی ہستی

انھیں تاروں کو خوابوں سے جگانے
دے مجھے اے رات کے ساقی !
دکھانے دے مجھے جلوہ تاروں کے
الجھنے کا
اسی منظر کو لے آؤں نگاہیں پھیرنے تک ہوش میں
جو ہے باقی
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی
کے آنچل میں

انھیں سوئے ہوئے تاروں کو خوابوں سے
جگانے دے
مجھے جلوہ تاروں کے الجھنے کا دکھانے دے
اسی منظر کو واپس کھینچ لاؤں گا میں
اک پل میں
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی
کے آنچل میں

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے
جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمے کو جو سویا ہے ترے جسم کے
محبوب تاروں میں

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس سنسار
کے بن میں
اسی خلوت سرائے معرفت یعنی
ترے من میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
وہی نغمہ
جو تیرے جسم کے محبوب تاروں میں
ہے خوابیدہ

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ پابند نظم ہر طرح کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہے چنانچہ دور حاضر کے بہترین نظم گو شعرا کا کلام اس کا قطعی ثبوت ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو ہمارے معاصر شعرا نے پابند نظم کے ذریعہ بیان نہیں کی۔ آزاد نظموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اُن میں کوئی ایسی نئی چیز نہیں ملتی جو اس دور کی پابند نظموں میں موجود نہ ہو۔ یا اُسے پابند نظم میں ادا نہ کیا جا سکتا ہو۔ لاہور کا رسالہ ادبی دنیا اس نئی تحریک کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ چنانچہ اس میں آزاد نظمیں بالالتزام شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا ادبی دنیا کے گذشتہ چالیس پچاس نمبروں میں جن لوگوں کی آزاد نظمیں شائع ہوئی ہیں ان سب کے کلام کی ایک مختصر فہرست (نظم کا عنوان اور اس کے چند ابتدائی، درمیانی، یا آخری ٹکڑے جن سے مضمون کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے) ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ قارئین کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ آزاد نظموں میں، جہاں تک مضمون کا تعلق ہے کوئی بھی اچھوتا پن نہیں۔

"ایام گذشتہ" ضیا فتح آبادی ایم اے

مجھے بیتے ہوئے ایام پھر کیوں یاد آتے ہیں ___ محبت کے وہ لمحے، ہاں وہی لمحے ___ جنھیں زریں سمجھتے ہیں جہاں والے ___ مگر جن کے تصور سے لرز جاتا ہے دل میرا۔

"نیا کھیل" انجم رومانی

درِ احاطۂ مسجد سنا رہا ہے پرانی کہانیاں مجھ کو ___ وہیں ہم اپنا نیا کھیل کھیلا کرتے تھے ___ وہیں جو ایک نئے دوست نے سکھایا تھا ___ دو ایک دن کے لئے شہر سے وہ آیا تھا۔

"دو رنگ" ابو الفضل صدیقی

اے فنکاری دوست تو دراصل ہے روحِ روانِ زندگی — آگاہ گلنے
والی بندوقیں تری — ہیں ترے منہ میں کبھی حیوان کبھی انساں کی کچی بوٹیاں
...... آہ یہ تیری دورنگی زندگی۔

"دائرے" جگن ناتھ آزاد

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِ نظر — اجلے اجلے، دھندلے، دھندلے
ٹوٹتے مٹتے دائرے۔

"شارعِ امید" احمد ندیم قاسمی

لیجیے ختم ہوئی محفلِ شب — پھول گلدانوں میں کملائے ہوئے — لیکن
اے روحِ حزیں — تو نے کیوں ایک پھریری سی لی — دیکھ کر دور وہ خاموش
سڑک کی شمعیں۔

"طلب" محمد راشد فضلی

یہ کیوں جاننا چاہتی ہو، یہ کیوں پوچھتی ہو؟ — بنی کیوں ہو دشمن مری
...... اور اپنی؟ — ہوسناکیاں اُف تمھارے بدن کی — مجھے چاہتا ہے،
مجھے مانگتا ہے۔

"چور" شریف کنجاہی

آپ کی بیوی سہیلی ہیں مری — اور انھیں ملنے کو آجاتی ہوں — میں
کوئی آپ کی خاطر تو نہیں آتی ہوں — ورنہ گھونگھٹ نہ نکالوں ہرگز —
یہ مگر سچ ہے کہ جب آپ کے گھر آتی ہوں — آپ اس وقت اگر گھر پہ نہ ہوں
— بلیٹر بیٹھی ہی رہتی ہوں میں باتیں کرتی۔

"اثرِ خواب" ش۔م اقبال

میں پھرا کرتا ہوں شاموں کے دھندلکوں میں اُداس اور حزیں — جب

فضاؤں میں بچھے ہوتے ہیں غمگین سارے — انھیں شاموں کے دھندلکوں میں
کہیں — منتشر ہیں مرے رومانوں کے آثار حسیں۔

"ٹھہرے رنگ، ابھری لہر" فضل حسین کیف

اسی اک سوچ میں ہو جاتے ہیں دن رات تمام — چشم پرآب لئے —
دل بیتاب لئے — عشق کے ساز کی مضراب لئے — میرے غم خانے میں بکھرائے
ہوئے دوش پہ بال —— آئے گی بھی کہ نہیں۔

"سگرٹ" سلام مچھلی شہری

نقاب نقرئی ہے تو — کسی دوشیزہ کی انگشت سحرافروز کی صورت —
ابھی نکلا ہے .... میں تجھ کو جلاتا ہوں — کبھی ایسا بھی ہوتا ہے — کہ بیڑی
بھی نہیں ملتی — ہمیشہ کیا تجھے مہمان رکھے گا — مرا ساتھی —— مرے اسکول
کا ساتھی۔

"رات سے خطاب" محمد ذوالنورین

رات میں تجھ پہ نثار — تیری خاموشی میں میرے دل کی آوازیں بلند۔

"تمنائیں" سعید احمد اعجاز

کاش میں جب ایک رات — شدتِ غم میں نکل جاتا کہیں بستی سے دور
— تو مرے خوابوں کی رنگیں کہیں آتی وہاں — چاندنی کے نور کا باریک
سا آنچل لئے۔

"خودکشی" ن۔م۔ راشد

میرا عزم آخر یہ ہے کہ میں — کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی —
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب۔

"نامعلوم سرزمین کا سفر" تابش صدیقی

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے کس نے جھانکا یہ مجھے
رات کی خاموشی میں ۔ بربط کا کشاں پر کس نے ۔ غم میں ڈوبا ہوا اک
نغمۂ الفت گایا ۔ اور غمِ عشق کو بیدار کیا ۔

"دو دن کا پیار" نسیم محمود مخمور

یہ دل وحشی مرا ۔ طائر آوارہ تھا اس کو قفس کی کیا خبر ۔ سادگی
کا، تیری معصومی کا، عفت کا گناہ ۔ آہ یہ دو دن کا پیار ۔ مجھ سے اب مت
پوچھ تو، جب میں نے کیا سمجھا تجھے ۔ اب مگر دو دن کے بعد ۔ توڑ ڈالا ہائے
کس کمبخت نے سارا فسوں ۔

"ناکام" ظہیر الدین ایم، اے

خاموش سی، بے ضرر سی لڑکی معصوم سی بھولی بھالی تو جانتی ہے
کہ مجھ میں کتنی طاقت ہے جان کو ر دندلی کی ۔ تو جانتی ہے کہ تجھ کو مجھ سے
الفت نہیں اور نہ میری پروا ۔ پھر چھوڑ تو دوں جہاں کو لیکن ۔ کس آس
پہ میں رہوں گا زندہ ۔

"ملاقات" ساقی

شاہراہِ زندگی پر یونہیں ہم تم تھے ملے ۔ جیسے دو پتے لچکتی شاخ سے
ٹوٹ کر گر جائیں سطحِ آب پر ۔ زندگی اب زندگی ...... ہاں ہاں یہ ظالم
زندگی ۔ جن کی طوفاں خیزیوں سے ایک موجِ تند و تیز ۔ لے گئی تم کو
بہا کر میری آنکھوں سے بھی دور ۔

دیکھ لیا آپ نے یہ ہیں وہ آزاد نظمیں جن میں زندگی کی مشکلات کا حل پیش
کیا گیا ہے ۔ اور یہ ہیں وہ اچھوتے اور انوکھے خیالات جو آزاد نظم لکھنے والوں
کے بقول پابند نظم کے ذریعے ادا نہیں کئے جا سکتے ۔ ہاں یہ ماننا پڑے گا کہ

خیالات میں ندرت و تازگی ہو یا نہ ہو، عنوانات میں جدت ضرور ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ بحر اور قافیہ کی پابندیاں شاعر کے لئے مشکلات پیدا کر دیتی ہیں لیکن یہ پابندیاں بے وجہ نہیں لگائی گئی ہیں۔ ان کی بدولت مضامین اور الفاظ کا حسن بدرجہا بڑھ جاتا ہے اور کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا کہ قافیہ کلام میں ترنم اور موسیقی پیدا کر دیتا ہے اپنی کور ذوقی اور نا دانی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ قافیہ کی موسیقیت کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ گیت، ٹھمری، اور دادرے وغیرہ جو صرف گانے کے لئے لکھے جاتے ہیں اور جن کا ادبی حیثیت سے کوئی پایہ نہیں، ان میں قافیہ لازمی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان چیزوں میں وزن پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا قافیہ پر دیا جاتا ہے۔ دو تین مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

دادرا:- پیا دیکھے بہت دن بیتے۔ جیا رابھاے، برہا ستائے پیا دیکھے
بہت دن بیتے۔
آ دن کہہ گئے، آ جہوں نہ آئے، سونی سیج موہے ڈرائے۔ رام
پیا سے بیگ لائے۔
پیا آؤ۔ درس دکھلاؤ۔ جیرا لبھاؤ، رجھاؤ۔ ہم ہارے موہن
تم جیتے۔ پیا دیکھے بہت دن بیتے۔

ٹھمری:- بتیاں نہ پکڑ موری مُرکی کلائی رے بتیاں نہ پکڑ موری مُرکی کلائی رے
کر کپٹ موری چولی مسکائی رے " " " " "
ادج برج موری ایک نہ مانی " " " " "
کرشن پیا کی میں ُیت دہائی رے " " " " "

ملہار:- روم جھوم بدرا وا برسے۔

اُن بن جیا را ترسے ۔ ردم جھوم بدروا برسے
چلت پُروائی سوم سنانانانا جھنگروا بولے جھوم جھنانانانا
اونچی اٹریا بچھوا بولے چلت کنگورا کرکے ۔ ردم جھوم ......

قافیہ کی وجہ سے شاعر کو غزل اور قصیدے میں جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ نظم کی دوسری اقسام میں پیش نہیں آتیں کیونکہ ایک بیت کے لئے صرف دو[2] ہم قافیہ لفظوں کا تلاش کرلینا کچھ ایسی دشوار بات نہیں ہے ۔ اور جو شاعر اتنا بھی نہ کرسکے اُسے شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے ۔ وہ دوسرے مفید کاموں میں اپنا وقت خرچ کرسکتا ہے ۔ رہ گیا وزن کا معاملہ تو یہ کچھ ضرور نہیں کہ ہم پرانی بحروں ہی میں نظمیں لکھیں ۔ ہم اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق نئی بحریں ایجاد کرسکتے ہیں ۔

بحر کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں ۔ انھیں نظر انداز کر دینا گویا اپنے ملکی اور قومی خصوصیات اور اپنے قدرتی میلانات کو بہ جبر مٹانے کی کوشش کرنا ہے ۔ عربوں نے جب ایران کو فتح کیا تو اُن کا اثر ایران کے ہر شعبۂ زندگی پر چھا گیا ۔ ایران کا مذہب بدل گیا ۔ اسکی معاشرت میں تغیر ہوگیا ۔ اس کی زبان کچھ سے کچھ ہوگئی .... اس کا رسم الخط تبدیل ہوگیا ۔ اس کی شاعری میں انقلاب آگیا ۔ خلیل ابن احمد بصری پہلا شخص ہے جس نے عربی عروض کے قواعد کو مرتب کیا ۔ اُس نے کل پندرہ[15] بحریں معیّن کی تھیں ۔ اس کے بعد ایک بحر کا اور اضافہ ہوا ۔ اسی عروض کو ایرانیوں نے اختیار کیا لیکن ان سولہ[16] بحروں میں سے چار کو اپنے ذوق اور میلان کے مطابق نہ پاکر ترک کر دیا اور اُن کے بجائے تین بحریں خود ایجاد کیں ۔ اس طرح بحروں کی مجموعی تعداد اُنیس[19] ہوگئی ۔ ہمارا فنِ عروض وہی ہے جو ایرانیوں

کا ہے لیکن اُنیس[۱۹] بحروں میں سے کل گیارہ ہی بحریں اُردو میں رواج پاسکیں وجہ اس کی ظاہر ہے کہ جو بحریں ہماری طبائع کے مناسب اور موافق تھیں وہ مقبول ہوئیں۔ باقی کو ترک کر دیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ہندی کی کئی بحریں بھی اُردو میں رواج پا گئیں۔ اور یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی۔ موجودہ دور میں بحروں کی نئی نئی شکلیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ ان میں سے جنھیں ہماری طبیعتیں قبول کر لیتی ہیں وہ مرّوج ہو جاتی ہیں۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کی طبائع اور اُن کے میلانات میں بڑا فرق ہے اور یہ فرق صرف شاعری ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے ہم انگریزی بولنے لگے ہمارا طرزِ معاشرت انگریزی ہو گیا۔ مردوں نے سوٹ پہنا ٹائی لگائی۔ غرض ہمہ جہت انگریز بن گئے لیکن اس کے باوجود ہماری عورتوں کو ساری کے بجائے میموں کا سایہ پہننا کوئی نہ سکھا سکا۔ صرف اس لئے کہ ہماری طبائع نے اس لباس کو کسی طرح قبول نہیں کیا۔ یہی حال شاعری میں بحر اور قافیہ کا ہے یہ شئے ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ ایک ہزار برس سے زیادہ ہو گئے کہ عرب، ایرانی اور ہندوستانی بحر اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ گاؤں کی ایک جاہل چھوکری بھی جب گنگناتی ہے تو اُس کے گیت میں قافیہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ چیزیں صرف اُردو ہی کے لئے مخصوص نہیں ہندوستان کی ہر زبان کی شاعری اور گیتوں میں بحر اور قافیہ موجود ہے یورپ اور امریکہ میں اگر فری ورس کو مقبولیت حاصل ہو گئی تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہندوستان میں بھی آزاد نظم ہر دل عزیز ہو جائے گی۔ تجربہ کے طور پر ٹیگور نے اس میدان میں طبع آزمائی کی تھی مگر

اُن کی سعی مشکور نہ ہوئی اور اُن کی آزاد نظموں کی طرف کسی نے ذرا بھی التفات نہیں کیا۔ اس لئے یہ توقع کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ ہماری شاعری کبھی بحر اور قافیہ کو ترک نہ کر سکے گی۔ یہ ہمارا فطری میلان ہے۔ ہمارے یہاں آزاد نظم پابند نظم کے مقابلہ میں ہرگز فروغ نہیں پا سکتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آزاد نظم محض ایک بیکار چیز ہے اور اسے ترک کر دینا چاہئے۔ نہیں۔ آزاد نظم اُردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے ہمیں بہت سے اچھے اچھے خیالات مل رہے ہیں۔ آزاد نظم کے اجراء سے پہلے یہ صورت تھی کہ شاعر طبع لوگ جو قادر الکلام ناظم نہیں تھے اور اپنے قابل قدر خیالات کو نظم میں ظاہر نہیں کر سکتے تھے وہ ان قیمتی جواہر پاروں کو اپنے ساتھ ہی دنیا سے لے جاتے تھے۔ اب یہ رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ مگر آزاد نظم لکھنے والوں کا یہ دعویٰ کہ وہ کچھ ایسی چیزیں پیش کر رہے ہیں جو پابند نظم میں کسی طرح ادا نہیں ہو سکتیں محض بے بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ ہر شاعر سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی شاعری میں مسائل حیات کا حل پیش کر سکے گا سراسر زبردستی ہے ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

مسٹر جناح پکے مسلمان ہیں مسلمانوں کے مسلم لیڈر بھی ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

عام انسانوں کی طرح شاعروں کے میلانات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اقبالؔ اور ٹیگورؔ دونوں ہی ایشیا کے بزرگ ترین شاعر ہیں۔ دونوں ہی کا کلام دنیا کی بہترین شاعری کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی دونوں کا میدان الگ الگ ہے کیونکہ اُن کے فطری میلانات یکساں

نہ تھے۔ اسی طرح کوئی شاعر صرف منظر نگاری کر سکتا ہے، کوئی عظمت رفتہ کا مرثیہ لکھ سکتا ہے۔ کوئی سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے فراقیہ اشعار کہہ سکتا ہے کوئی جنگی ترانے اور قومی رجز تیار کر سکتا ہے۔ کوئی مزدوروں کے شور و فریاد سے سرمایہ داروں کے محلوں میں زلزلہ ڈال سکتا ہے لیکن یہ سب کام کسی ایک شخص سے کرنے کے نہیں ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم ہر شخص کو آزادی کیساتھ اس کے فطری میلان کے مطابق شاعری کرنے دیں۔ کوئی خاص مطالبہ اُس سے نہ کریں۔ صرف اسی صورت میں قدر اوّل کی چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں ورنہ آرڈر دے کر نظمیں لکھوائی جائیں گی تو انکی حیثیت طرحی غزلوں سے زیادہ نہ ہوگی۔
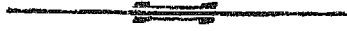
نیا شعر و ادب

از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رشید صدیقی صاحب اُستادِ اُردو، مسلم یونیورسٹی کے مرتبہ ادب و انشاء سے کون واقف نہیں، اُن کے ایک تازہ خطبہ صدارت (کانفرنس گزٹ سے منقول) کا اقتباس ذیل یقیناً بڑی قدر اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

حضرات! اب میں تھوڑی دیر کے لئے اُن دوستوں سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں جو اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ ہماری یان ہمارے ادب، اور ہماری روایات کے محافظ ہی نہیں، اس کی پرورش کرنے والے اور پروان چڑھانے والے ہیں۔ آیندہ نسلوں کی ذہنی پرداخت میں ان کا بڑا حصہ ہوگا۔ یہ کام بہت بڑا اور بڑی ذمہ داری کا ہے۔ اس لئے کہ شعر و ادب ہمارے جذبات کا ذمہ دار ہی نہیں ہوتا اُن کا محرک بھی ہوتا ہے لیکن اُردو شاعری اور اُردو ادب کا جو رنگ ڈھنگ عام طور پر آج نظر آرہا ہے وہ پُرمعنی بھی ہے اور اندیشہ ناک بھی۔ پُرمعنی اس اعتبار سے کہ اس میں زمانہ کا رنگ جھلک رہا ہے اور اندیشہ ناک یوں کہ ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

جو لوگ کبھی خیالی دنیا میں تصورات سے کھیلتے یا اُن میں گم رہتے تھے، آج واقعات کی دنیا میں "سیل بے پناہ" سے دوچار ہیں "غم روزگار" نے اب

"غم عشق" کی جگہ لے لی ہے۔ اور "غم جاناں" اب "آلام روزگار" کو آسان بنانے سے قاصر ہے۔ زندگی کے نت نئے مسائل نے نئی واماندگیاں پیدا کر دی ہیں جب زندگی کے آشوب سے دوچار ہونے کی ہمت یا صلاحیت باقی نہیں رہتی تو انسان اپنی درماندگی ہی کو حاصل حیات سمجھنے لگتا ہے۔ اسی نوعیت کے آشوب نے ایران کی شاعری میں تصوف کا عنصر داخل کر دیا تھا۔ اس وقت تک مذہب کا عمل دخل کافی تھا اس لئے مذہب اپنے مقام سے اترا تو تصوف پر آ کر تھما۔ ہندوستان میں خالص اسلام کا عمل دخل برائے نام ہی تھا، اور جو کچھ تھا وہ بھی ایک طرح کے مخلوط تصوف کے پیرایہ میں۔ اور یہ تصوف عملاً مذہبی یا جہول کی جائے پناہ یا ایک مقدس معذرت بن کر رہ گیا تھا۔ جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے سے زندگی کی ہر جہت میں مادیت و عقلیت کی بہت کچھ کارفرائی نظر آنے لگی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو نئی زندگی کا آشوب آیا تو اس نے تصوف، مادیت، اور عقلیت سب کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور اس کی جگہ فسق و فحاشی نے لے لی، فسق و فحاشی دراصل رذائل نفس کی غلبہ زائی ہوتی ہے۔

حضرات! ہمارے دوستوں کو "طعنہ نایافت" سننے کی تاب نہ رہی تو اپنے کو لکھو دنیا ہی اپنا کارنامہ قرار دینے لگے۔ بندھنوں سے آزاد ہونا اچھی بات ہے لیکن ہر چیز کو ہر بندھن سے آزاد کرنا آزادی نہیں بد اعمالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کی بیشتر شاعری اور افسانوں میں زندگی کے جن ڈراؤنے یا گھناؤنے پہلوؤں کو مزے لے لے کر اور وجد میں آ آ کر پیش کیا جا رہا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جن بیباک و شرمناک اصول اور طریقوں کی تبلیغ کی جا رہی ہے وہ کسی کے لئے باعث فخر نہیں ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہماری زندگی میں یہ ڈراؤنے اور گھناؤنے واقعات

ملتے ہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ شاعر اور ادیب ان چیزوں سے متاثر بھی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس کا بھی قائل ہوں کہ علم الامراض کے ماہر اور معمل اور شاعر و شاعری یا پیغمبر اور اُس کی کتاب میں فرق مراتب بھی ہے۔ ہمارے شعرا اور ادیب معائب و مصائب کو نہ معقول طور سے پیش کرتے ہیں نہ اُن کی صحیح چارہ سازی کرتے ہیں۔ شدید اور مزمن امراض کا علاج سستی مسکرات سے صرف عطائی ہی کرے گا اور اپنی کوڑھ اور غلاظت کو اُچھالنے والا کوڑھی اور اگھوری ہی کہلائے گا۔ تو کیا اب شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کوڑھی یا اگھوری ہی ہونے پر اکتفا کریں گے اور اسی پر فخر کریں گے یا شاعر و ادیب اور آرٹسٹ کے مقامات کچھ اور بھی ہیں۔ یہاں میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس شاعر اور آرٹسٹ کے سامنے سر خم کرنے کیلئے تیار ہوں جو کوڑھ یا غلاظت کی صحیح اور مکمل تصویر کھینچے۔ میں تو اُس شاعر اور آرٹسٹ سے پناہ مانگتا ہوں جو اپنی نہاد اور اپنے عمل کے اعتبار سے کوڑھی یا غلیظ ہو۔ یا کوڑھ اور غلاظت میں لذت محسوس کرے۔

حضرات! کمیونزم یا اشتراکیت کی تقلید یا تبلیغ اب اس درجہ عام اور مقبول ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا جہالت، قدامت پرستی اور دولت دوستی کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ میں اشتراکیت کا قائل نہیں ہوں قطع نظر اور ان باتوں کے میں نے اس کا جو کچھ مظاہرہ اُردو شعر و ادب میں دیکھا ہے اس سے مجھے زندگی سے زیادہ کمیونزم گھناؤنی معلوم ہونے لگی ہے۔ کمیونزم نے خدا، عورت، اور دولت کی طرف خاص توجہ کی ہے اور ان تینوں کے بارے میں جو کچھ تعلیم ہے اس سے عام طور پر ہم اور آپ کم و بیش واقف ہیں۔ بیشتر اسی کی کارفرمائی ہمارے جدید شعر و ادب میں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ

اگر خدا یا اس کا تصور ماننے جانے کے لائق نہیں ہے تو مذاق اڑانے کے لئے
بھی موزوں نہیں ہے۔ اور عورت کو مظلوم و مجبور نہ ہونا چاہئے تو اس کو
شاعر، آرٹسٹ یا مزدور کے شہوانی جذبات کی تسکین کا وسیلہ بھی نہ سمجھنا
چاہئے اور افلاس کا تنہا علاج قتل و غارت گری بھی نہیں ہے۔ یہ بات
میری سمجھ سے باہر ہے کہ خدا کے تصور ہی سے کوئی شخص انحراف کرے۔ اگر
ایسا ہے تو پھر زندگی کی اعلیٰ قدریں کوئی بنیادی حیثیت یا منزلت نہیں
رکھتیں۔ عورت کا مصرف اگر صرف تسکین شہوت ہے جیسا کہ میں جدید ادب
میں دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں عورت سے زیادہ لغو تصور نصف سے زیادہ
اشرف المخلوقات کا نہیں ہے۔ دولت اور افلاس دونوں کی فراوانی بری
لیکن قتل و غارت گری کی تبلیغ بھی کوئی مبارک فعل نہیں ہے۔ ان امور کو دیکھتے
ہوئے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اشتراکیت .... کھیل ور
نہیں تو ہمارے جدید شعر و ادب میں رذائل نفس کو ابھارتی ہے۔ اور اس کا
اثر سب سے زیادہ اُن لوگوں پر پڑ رہا ہے جو انسانی محاسن سے یا تو سرے سے
آشنا ہی نہیں کرائے گئے ہیں یا ان میں کسی نہ کسی سبب سے ان کا فقدان ہے۔
میں اپنے اہلِ قلم دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ یہ کہاں کا اور کیسا انقلاب ہے کہ
غریب کے پاس روزی نہ ہو تو آپ کی ہدایت کے مطابق وہ ڈاکہ ڈالے، آگ
لگائے، اور جان دیدے اور آپ کے پاس کھانے کو نہ ہو تو مصاحبت کی
روٹی کھائیے، مفت کی شراب پیجئے، انقلاب کے شعر کہئے، از کار رفتگی کا
ماتم کیجئے، اور عورت پر تان توڑیئے۔

حضرات! دراصل ابھی ہمارے شعر و ادب کو وہ اونچا درجہ نصیب
نہیں ہوا جو مغربی شعر و ادب کو صدیوں پہلے سے حاصل ہے۔ یہاں

لکھنے والوں میں مقابلہ و مسابقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آج تقریباً لکھنے لگے، کل یقیناً مشہور ہو گئے اور آج ہی جیل خانے بھیج دیئے گئے تو پھر نور علیٰ نور۔ رات گزرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ شاعر السموات۔ یا ادیب الدہر اور خدا جانے اور کیا کیا کہلائے جانے لگے۔ جہاں شہرت اتنی سستی اور سہل الحصول ہو وہاں خون پانی ایک کرنے کی ضرورت ہی کیا یہ ہماری بے توجہی اور کم نصیبی ہے کہ مختلف اصناف شعر و ادب کے اعلیٰ نمونے نہ لکھنے والوں کے سامنے ہیں نہ پڑھنے والوں کے سامنے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں لکھنے پڑھنے یا عجیب و غریب خطاب دینے یا اختیار کرنے والوں کا مذاق شعر و ادب کیا ہوگا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس نے جس سے بڑھ کر "فسق و فواحش" لکھ دیا وہی ہمارا سب سے محبوب اور مقبول شاعر اور ادیب بن گیا۔ فسق و فواحش یوں کہ یہ موضوع سستے اور سنسنی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں اور ادنیٰ استعداد یا معمولی فکر و فرزانگی کے لوگوں کے بس کے ہی نہیں بلکہ ان کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ اور قابل لحاظ ہے۔ ہماری سرزمین میں "تہلکہ انگیز" حادثات کم پیش آئے اور پیش بھی آئے ہیں تو طویل وقفوں کے بعد۔ وسیع زراعتی ملک ہے۔ لوگ پڑھے لکھے کم، تن بہ تقدیر زیادہ، حکومت میں عوام کو بہت کم دخل، اور عوام سے حکومت بے نیاز۔ جو کچھ پیدا کیا اس میں پیداوار کم اور لادزیادہ حصہ میں آئی۔ عام زندگی کا رنگ و آہنگ کچھ اس قسم کا رہا ہے ؎

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

اور اتفاق سے اکا دکا ہمارے آپ جیسے نکل آئے تو اُن کا تیور یہ ہے۔ ع

کپڑے کے عوض بدلتے تھے رنگ

یہ رزق شرعی، عشق طبعی، جیئے تو استغفراللہ مرے تو الحمدللہ۔ غرض یہاں .... مختلف ہمسایہ اقوام کو ایک دوسرے سے چوکنا اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ زندگی و معاشرت کی وہ نفسیاتی گتھیاں اور تقدیر انسانی کی وہ نازک اور آزمائشی گھڑیاں جو یورپ والوں کو ہمیشہ و ہر لحظہ پیش آتی رہتی ہیں اور مردانہ وار اُن سے عہدہ بر آ ہوتے رہتے ہیں، ہم ہندوستانیوں کو کبھی پیش نہ آئیں نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ذہن و دماغ اور ہمارا شعر و ادب نفسیاتی گہرائی اور فنی شعور دونوں سے بے بہرہ رہے۔ جب کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات یا وہ انداز ہم میں یا ہمارے شعر و ادب میں مغرب سے آیا ہے تو اس سے ..... اتنا سمجھنا چاہئے کہ یہ باتیں ہم میں مغربی کتابوں نہ اخباروں سے، یا یورپ سے آئے ہوئے لوگوں کے توسل سے پہونچی ہیں۔ ہمارے مصنفین یا شعرا کو کبھی براہ راست نہیں پیش آئیں یہی سبب ہے کہ یورپ کے شعر و ادب کا جو انداز ہمارے لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے روح نہیں۔ روح تو اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ سارے واقعات و حادثات ہمارے سر سے گذرے ہوں۔ نظر برآں انقلابیت، نازیت یا اشتراکیت وغیرہ کا رنگ ڈھنگ جو ہمارے لکھنے والوں میں بالعموم نظر آتا ہے وہ کلیتہً سطحی اور بے جان ہے۔ اس رمز کو ہمارے نوجوان دوست نہیں سمجھتے اور جو کچھ دل میں آتا ہے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ نہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور نہ شعر و ادب کا مقام سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی

مبارک فعل نہیں ہے۔ اس وقت تو وہ اس سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں لیکن وہ آئندہ نسل کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اخلاف اسلاف سے شاکی ہوں گے۔ اور شعر و ادب جو قوموں کا ضمیر ہوتا ہے اور نسلوں کا حافظہ بھی دوسری ترقی یافتہ اور گراں منزلت ادبیات کے مقابلہ میں فرومایہ نظر آتا ہے۔ اُس وقت تاریخ لکھنے اور تنقید کرنے والا یہ فیصلہ دیگا کہ اس شعر و ادب کو وجود میں لانے والے اس عہد کے وہ لوگ تھے جو اس طرح کے سرمایۂ ذہنی و دماغی کو پسند کرتے تھے اور فخر کرتے تھے، اور یہ فخر کرتے تھے۔ اور یہ فیصلہ کوئی قابلِ رشک فیصلہ نہ ہوگا۔

حضرات! اگر میں شعر و ادب کے ضمیر میں نہیں اتر سکا ہوں تو اپنے ضمیر میں اُسے جگہ دے سکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شعر و ادب کی وادی میں کہاں کہاں دوزخ جنت سے ڈھکی ہوئی ہے اور کہاں بہشت دوزخ کے آغوش میں ہے۔ میں ہی نہیں، آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آج کل شعر و ادب ہی نہیں، مذہب و اخلاق کی مٹھی آرٹ یا کرافٹ کر یا اس کے سایہ میں ہمارے نوجوان اور بوڑھے شعرا اور ادیب کس کس طرح "لذت کام و دہن" میں مصروف و مگن ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ لکھنے کا فن بھی خاص خاص اسرار و رموز رکھتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عریاں نگاری اس بنا پر ضروری ہے کہ بغیر اس کے بات ذہن نشین نہ ہوگی۔ وہ یا تو فن میں ناقص ہیں یا پھر اُن کی ذہنیت ہی مریض و ماؤف ہے۔ عریاں طرازی یا فحش سرائی شاعر و ادیب یا آرٹسٹ کا کمال نہیں کمزوری ہے۔ اگر آپ میری طوالت بیانی سے گھبرا نہ گئے ہوں اور گھبرا بھی گئے ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں اگر آپ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ نہ گیا ہو تو میں اس

سلسلے میں اشارۃً ایک نکتہ اور بیان کر دوں۔ جدید شعر و ادب کے دلدادہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کو اپنی غلاظتوں کا علم یا احساس نہ ہوگا اُس وقت تک ہمارے دل میں غلاظت سے نفرت نہ پیدا ہوگی۔ اور صفائی کی طرف ہمارا ذہن مائل نہ ہوگا۔ اس لئے طرح طرح کی غلاظتوں کو طرح طرح سے پیش کرنا چاہئے اور قوم کے پکے پھوڑے میں اسی طور سے نشتر لگانا چاہئے۔" اوّل تو غلاظت کا پیش کرنا، اور غلاظت کا اچھالنا۔ دو قطعاً مختلف باتیں ہیں دوسرے یہ کہ ماہرِ فن اور مخلص ڈاکٹر جب کبھی آپریشن کرتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مریض کی عام جسمانی حالت کیا ہے۔ پھر مریض کو مقررہ مکمل طور پر اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ آپریشن تھیٹر میں کامل صفائی ہوتی ہے آلاتِ جرّاحی دواؤں سے دُھلے منجھے ہوتے ہیں۔ روئی اور پٹیاں ہر طرح کی کثافت اور جراثیم سے پاک صاف ہوتی ہیں۔ سرجن خود دیر تک اپنے ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کرتا ہے۔ اور کا سب پر مستزاد یہ کہ وہ اور اُن کے رفقاء کار اپنے نتھنے اور منہ اور بالوں پر پٹیاں باندھ لیتے ہیں کہ کہیں ان کے مضر جراثیم مریض کے زخموں میں گر کر سرایت نہ کر جائیں۔ اس کے بعد جو ڈاکٹر دوائے بیہوشی سنگھاتا ہے اس کی انگلیاں برابر مریض کی نبض پر رہتی ہیں اور وہ آنکھوں اور تنفس پر نظر رکھتا ہے۔ دوران آپریشن میں اگر بیہوشی سنگھانے والے ڈاکٹر کو یہ معلوم ہو کہ مریض کی حالت دگرگوں ہے تو وہ فوراً آپریشن رکوا دیگا۔

ان تمام امور اور ان کے جزئیات کو مدِ نظر رکھئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ زیرِ نظر شعراء مصنفین مریض قوم پر کس طرح عمل جراحی کرتے ہیں۔ تفصیل بہت طویل ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ حالات کا موازنہ کرکے صحیح نتیجہ پر آسانی سے پہونچ سکتے ہیں۔ اور باتوں کے علاوہ آپ یہی دیکھ لیجئے کہ

ڈاکٹر اس امر کا بھی کیا خیال رکھتا ہے کہ اُس کی انگلیاں آلودگی سے صاف ہوں اور اس کے بال، ناک اور منہ بھی اس طور پر بند رہیں کہ خود اُن کی آلودگیاں مریض کی ہلاکت کا موجب نہ بنیں، پیغمبر بھی جب کسی قوم کے سامنے آتا ہے تو ریاضت اور تزکیۂ نفس کی اعلیٰ منزلیں طے کر چکا ہوتا ہے تاکہ کہیں خود اُس کی کمزوریاں اس کے مشن میں راہ نہ پا جائیں پیغمبر کے پاس پیغمبری کا فرمان خدا کا دیا ہوا موجود ہوتا ہے ڈاکٹر کے پاس یونیورسٹی یعنی ماہرین فن کے صداقت نامے ہوتے ہیں۔ تب کہیں جا کر یہ اخلاقی یا جسمانی امراض کی اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں یا کرنے پاتے ہیں (اس کے برخلاف ان شعراء و مصنفین یا بیشتر لیڈروں کو دیکھیے۔ یہ جو سمجھ سکتے ہیں اور جس طرح سکتے ہیں اُس میں ان کی آلودگیاں کس درجہ سرایت کئے ہوتی ہیں۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی اس منصب کا اہل ہوگا جس پر اُس نے اپنے آپ کو فائز کر رکھا ہے!

حضرات! میرے نزدیک عریانی اور فحاشی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ادب کی تکمیل میں لازم آتی ہوں لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ ان کا عمل دخل بھی ایک حد تک ضروری ہے اور بعض شعراء بعض لکھنے یا پڑھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کے بغیر زندگی کی مکمل لذت نہیں محسوس کر سکتے تو پھر میں یہ بھی کہوں گا کہ اس قسم کے لٹریچر کو اس کا مناسب مقام دیا جائے۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ جہاد یا انقلاب کا اعلان مراسی مراستوں کے گالی گانے سے کیا جائے!

اس سلسلہ میں ایک معمولی سی بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اور باتوں کے علاوہ عریانی و فحاشی سے بچنے کے لئے یا اس کو اعتدال پر

رکھنے یا اس کو مناسب اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے لئے ماہرین شعر و ادب نے صدیوں کے مطالعہ و تجربہ کے بعد صنائع و بدائع اختراع مدون کئے، محسنات کلام کی طرح ڈالی اور اس کے بلیغ و دلنشیں نمونے پیش کئے فحاشی اور عریاں نویسی نہ کوئی فن ہے اور نہ کمال فن، فن کا مقصد اور اُس کا کمال یہ ہے کہ وہ خود بھی مستحسن ہو اور نتائج کے اعتبار سے بھی مستحسن ہو۔ ایسا فن جو انسان میں ایسا رجحان پیدا کرے جس سے بحیثیت مجموعی اخلاق و انسانیت کا مقصد نہ پورا ہو یا خطرہ میں پڑ جائے، فن یقیناً نہیں کچھ اور ہو تو ہو، فن برائے فن میرے نزدیک بداعمالی نہیں تو فعل عیث ضرور ہے۔ اور میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا پہلو ایسا نہیں ہے جو اپنی تکمیل کے لئے کسی ایسے فن کا محتاج ہو جس پر صرف فن برائے فن کا اطلاق ہوتا ہو۔ فن برائے فن میں وہی گمراہی پوشیدہ ہوتی ہے جو تصوف کے اکثر پیرووں میں نظر آتی ہے یعنی عشق ہوتا ہے تعزیرات ہند کی زد کا، اور رشتہ جوڑیں گے پیمانِ الست کا!

اگر میرے دوستوں سے کوئی یہ کہے کہ عریاں اور فحش باتیں بھی عریاں اور فحش الفاظ و عبارت ہی میں ادا کی جاسکتی ہیں تو میں اس کا قائل نہیں۔ باکمال لکھنے والا فحش سے فحش باتیں اس طور پر کہہ سکتا ہے کہ حسن و شرافت کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ یہی نہیں بلکہ انشاپردازی کا یہ بھی کمال ہے کہ جو بات بظاہر غیر ثقہ یا معمولی اور سپاٹ نظر آتی ہو اس کو انشاپرداز چند الفاظ اور فقروں کے پیرایہ میں نہایت درجہ دلنشیں بلکہ لازوال بنا دے۔ اس لئے اگر میرے دوستوں کو فحاشی و عریاں نگاری

سے شغف ہے اور وہ اس عادت کو ترک نہیں کر سکتے تو پھر میں ان کو مشورہ دوں گا کہ وہ لکھنے کی مشق اور سلیقہ پیدا کریں لیکن بطور تنبیہ میں یہ جتا دینا چاہتا ہوں کہ جس شئے کا نام سلیقہ ہے وہ صرف مشق سے ہاتھ نہ آئے گا اس کے لئے خلوص از بس ضروری ہے۔ عدم خلوص زندگی اور معاشرت میں ہی خلل انداز نہیں ہوتا۔ انشا پردازی کو بھی خاک میں ملا دیتا ہے!

حضرات! یہ باتیں میں نے سچائی اور صفائی سے عرض کی ہیں اور یہ بیان واحد نہ بھی ہو تو کم سے کم یہ ضرور ہے کہ یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں جو میں نے بغیر کسی "دغل فصل" کے پیش کر دئے لیکن تصویر کا یہ ایک ہی رُخ تھا۔ دوسرا ابھی عرض کر دینے کی اجازت ہی نہیں چاہتا بلکہ اس پر اصرار بھی کروں گا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ نوجوان لکھنے والوں میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے وہ امید افزا ہے۔ شعور کا بیدار ہونا مبارک ہوتا ہے۔ ابتدا میں جو ناہمواری اور بے راہ روی پیدا ہوتی ہے وہ آگے چل کر درست ہو جاتی ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس بات کا پتہ آسانی سے چل جائے کہ اب تک ہمارے شعر و ادب میں مخصوص سانچوں میں ڈھلی ہوئی مخصوص ہی چیزیں راہ پاتی رہی ہیں۔ جن سے ہم اکتانے لگے تھے اسلوب بیان اور موضوع دونوں میں اس درجہ یکسانیت اور "باسی پن" آگیا تھا کہ جس سے بعض یہ سمجھنے لگے تھے کہ "یہی لکھنا اور یوں ہی لکھنا" مقصود بالذات ہے لیکن نالہ کی طرح زندگی بھی "پابند نے نہیں" نئے ادب نے ہم کو بعض بڑی اچھی چیزیں بھی سجائی ہیں جن کو اب ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کچھ اور نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ ہمارے ادب میں جو ایک کمی نہایت درجہ نمایاں تھی اُس کو یہ پورا کر رہا ہے۔ مثلاً اُردو میں پریم چند سے پہلے

غریبوں کا ادب مفقود تھا حسن ہو، محبت ہو، بہادری ہو، عصمت ہو، سچائی ہو، قابلیت ہو، غرض ہنسنا بولنا رونا دھونا، مرنا جینا، آداب تسلیمات، تو تو میں میں سب کے سب طبقۂ اولیٰ یا طبقۂ امرا سے متعین ہوتے تھے۔ سب کچھ "تجمل حسین خاں" کے لئے تھا۔ غریبوں یا عوام کو اتنا بھی میسر نہ تھا کہ خانصاحب کی نظر بد سے محفوظ رہیں۔ پریم چند نے سب سے پہلے اُردو ادب میں غریبوں کو جگہ دی۔ اور وہ بھی اس طور پر کہ ہم کو غریبوں پر ترس ہی نہیں آیا بلکہ اُن کے ایسے فضائل ہم پر روشن ہوئے کہ ہم نے اپنے دل میں اُنکے لئے محبت اور رفاقت کی معزز جگہ نکالی۔ ہمارے شعرا اور ادیب بھی غریبوں کی طرف مائل ہوئے اور انھیں محسوس ہوا کہ شعر و ادب میں حسن اور جان امیروں ہی سے نہیں ناکسوں سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ پریم چند کے بعد ہی نئے ادب والوں کا دور آیا۔ انھوں نے غریبوں کو اپنایا۔ لیکن یہ اس درجہ شدت اور عجلت کے ساتھ پیش آیا کہ اس کی "جھونک" خود نئے ادب والے بھی نہ سنبھال سکے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جب تک نئے ادب میں کوئی پریم چند یا حالی یا دونوں نہ پیدا ہوں گے، نئے ادب میں وہ سنجیدگی، وقار اور وزن نہ آئے گا جس کا وہ یقیناً مستحق ہے اور جس کی اُسے بڑی ضرورت ہے۔

ترقی پسند ادب کی نفسیاتی تحلیل

از خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر

مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" مصنف کہتے ہیں، ادب اور اس کی حقیقت سے کس قدر بیگانہ ہیں!

جب تک ادب کا شمار فنون لطیفہ میں ہے۔ اس سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ شامل ہے تو شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو، ہماری بحث شاعری تک محدود رہے گی، اس کا مقصد اولیں نشاط دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ادب کا افادی یا غیر افادی، اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونا ضمنی اور اضافی اوصاف ہیں۔ اسی طرح تمدن، سیاست، پالسی اور تحریک سے ادب کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں۔ اور نہ ہونا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ موجودات عالم میں کوئی شے اور واقعہ ایسا نہیں۔ جو شاعری کے دائرہ عمل سے خارج ہو، مگر نقطۂ نظر صناعانہ ہو اور پروپگنڈا کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ورنہ شاعری یا ادب کا غلط اور ناجائز استعمال ہوا۔ موضوع جو کچھ ہو طرز ادا میں فن کارانہ بانکپن قائم رہے۔ ادب کو جہاں کسی غرض یا مفاد کا آلۂ کار بنایا اس کی تاثیر اور دلکشی فنا ہوئی، پھر شاعری شاعری نہیں، گویا اس ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ بچے "سیو ما نگتے ہیں" وہ فروش بانہیاں سناتے چوکیدار پہرا دیتے یا انگھوری جھٹا بجاتے ہوں۔

فنون لطیفہ میں مصوری، موسیقی اور بت تراشی بھی شامل ہیں، ان سے پروپگنڈا کا کام نہیں لیا جاتا۔ مگر غریب شاعری سے توقع رکھی جاتی ہے

کرمزدوروں اور کسانوں کی دلالی کرے!

شاعری کا یہ غلط مصرف بدترین ادبی اور اخلاقی جرم ہے۔ اور ایسے لوگوں کی مخالفت ہر ذی ہوش کا فرض ہے۔

اگر شاعری کا مقصود زندگی کی مستقل قدروں کا دریافت کرنا اور دوسروں تک پہونچانا ہے۔ تو ایسی نام نہاد شاعری کا انجام کیا ہوگا۔ جو ایک خاص غرض کے حصول کے لئے گتھیوں کو سلجھانے اور مسائل کا واقعات کی روشنی میں حل سوچے بغیر ہندوستان میں سوویٹ ذہنیت پھیلانا چاہتی ہے، اگر اسی کے ساتھ ساتھ جذبۂ نفرت و انتقام بھی کارفرما ہے۔ تو ایسی شاعری کی زبوں حالی کا کیا پوچھنا۔

ادب کا مطالعہ ہی وہ معصوم اور دلچسپ مشغلہ ہے جس سے سائنسداں، فلسفی، مفکر، بلکہ ہر طبقے اور حیثیت کا شخص دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کر سکتا، اور ایسے ماحول میں پہنچ سکتا ہے۔ جہاں دنیا کے تفکرات سے تھوڑی دیر کو نجات پا جائے اور وہ سکون و راحت میسر ہو اس کے دل و دماغ کو جس کی ضرورت تھی۔ اور جس کے نصیب ہونے پر دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنے روزانہ مشاغل زندگی میں زیادہ مستعدی، سرگرمی اور خوش دلی سے منہمک ہو۔ ادب پر اپنی زندگی یہ نعمت بخشنے سے قطعًا قاصر ہے کیونکہ اپنی بہترین صورت میں بھی اسی کشاکش کا آئینہ ہے جس کا عملًا سامنا ہوتا ہے، ادب میں بھی وہی جرھانا، ترسنا مسرت کے بجائے طبیعت کو اور زیادہ مضمحل اور رنجیدہ ہمیں بنا دیتا ہے اور اس طرح ادب کا حقیقی منشا فوت ہو جاتا ہے۔ ایسا ادب اپنی نوعیت کی بنا پر کسی طبقے میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ نفرت انگیز ہونے کے علاوہ

اُن خوبیوں اور لطافتوں سے بھی معرا ہے جن کی وجہ سے موضوع سے قطع نظر خود شاعرانہ صناعت دلکشی بن جاتی ہے۔

"ادب برائے زندگی" دراصل روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے ایسی شاعری کیا خاک کامیاب ہو سکتی ہے جس میں خلاقانہ تخلیق معدوم ہے اور جس میں حقائق کی ترجمانی کے بجائے بدیسی واقعات کو ہندوستان میں منتقل کر کے اُن کی مبالغہ آمیز اور سفیہانہ نقالی کی گئی ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جو کسی خاص مقصد کی تکمیل کو وجود میں آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے اور کسی طرح دیرپا نہیں ہو سکتی۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ

ادب کی دو تعریفیں ممکن ہیں، ایک جس میں مصنف کی داخلی یا موضوعی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری جس میں خارجی یا معروضی عنصر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ادب کا پہلا تصور ہمیں رومانیت کی طرف لے جاتا ہے جس میں مصنف کے جذبات اور محسوسات نمایاں ہوتے ہیں۔ اور دوسرا تصور حقیقت نگاری کی طرف جس میں اُس "خارجی" چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کی تصویر کھینچنی مقصود ہو، پہلی صورت میں بیان یا طرزِ ادا پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری میں اُس چیز پر جو بیان کی جائے

پہلی حالت میں ادب مقصود بالذات ہو جاتا ہے
اور دوسری حالت میں ایک ذریعہ قرار پاتا ہے
"ادب برائے زندگی" پہلے نظریہ کی حمایت ہے
اور دوسرے نظریہ کو "ادب برائے زندگی" کہہ سکتے ہیں۔

کس قدر گمراہ کن تحریر ہے! دنیا جانتی ہے کہ ادب کے داخلی اور خارجی پہلو سے مراد تخییل کا طریق کار ہے۔ شاعر کبھی اپنے جذبات و محسوسات و واردات قلب کی مصوری کرتا ہے۔ یہ شاعری کا داخلی پہلو ہوا کبھی مناظر قدرت یا کسی واقعہ یا مرئی شئے کا نقشہ کھینچتا ہے، اس کو شاعری کا خارجی پہلو کہتے ہیں، کوئی شاعر ایسا نہیں قدیم یا جدید جس کے کلام میں دونوں عناصر کم یا بیش موجود نہ ہوں۔ اگر ہمارا قول صحیح ہے۔ تو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں کوئی حد فاصل نہ رہی۔ اور یہ حضرت خود نہیں جانتے کہ "ادب برائے زندگی" کیا بلا ہے تاہم دوسروں کو سمجھانے کی جسارت کرتے ہیں!

"ادب برائے زندگی" کے ایک دوسرے حامی فرماتے ہیں۔ کہ ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جانی چاہئیں۔ اول یہ کہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے "اجتماعی" زندگی سے اُن لوگوں کی زندگی مراد ہے جن کے درمیان ادیب یا شاعر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے سماجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ شاعری چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم ہو کر عجیب و غریب متضاد کیفیتوں کا مجموعہ بن جائے گی۔ دنیا بھر کو جانے دیجئے۔ ایک شہر یا قریہ لے لیجئے سماج کے افراد جس قدر مختلف عقائد، خیالات اور رجحانات

رکھتے ہوں گے۔ بچارا شاعر اس مجبوری کے ماتحت کہ "با ہمیں مرداں بباید ساخت"
اُن کی تمام بیہودگیاں، توہمات اور منافقات کی اپنی شاعری میں تفسیر
تنقید یا ترجمانی کرنے کی سعی لاحاصل کرے گا، تفرقوں کی خلیج بڑھتی چلی جائے گی
اور چونکہ آج کچھ کہے گا۔ اور کل کچھ، اجتماعی زندگی سے گہرا اور براہِ راست
تعلق پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعر زندگی کی (مجموعی ہو یا انفرادی)، ترجمانی
جبھی کر سکتا ہے کہ بنیادی اُصول و حقائق کی جو ذات پات فرقہ دارانہ کوتاہ
نظری و پست خیالی سے بالا ہیں۔ ایسے دلکش انداز اور الفاظ میں ترجمانی
یا تنقید کرے۔ کہ لوگوں کے دل اُس طرف خود بخود کھنچیں اور شاعر کے
منقولات کو قبول کریں۔ ایسا شاعر ذاتی وقتی یا مقامی تنازعات سے کوئی
واسطہ نہیں رکھتا۔

یہی بزرگ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ۔

> ایک مہذب انسان کا فرض ہے کہ وہ
> ذاتی فائدے کے بجائے جماعتی فائدے کو
> اپنا مطمحِ نظر بنائے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس سوال
> پر غور کریں۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے
> تو اس کے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ کہ انسان
> کی خدمت ہی انسان کی زندگی کا واحد اور
> حقیقی مقصد ہے۔ دنیا میں انھیں لوگوں نے
> کامیاب، مطمئن اور حقیقی مسرت سے لبریز زندگیاں
> بسر کی ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی فائدوں
> اور ذاتی خواہشوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنائے

جنس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا، دوسروں کے
آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھا، دوسروں کی
خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو
اپنا غم خیال کیا۔ جن شاعروں اور ادیبوں
نے اپنی زندگی میں عالمگیر مقبولیت حاصل کی
اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا
وہ وہی ایثار پسند اور اخلاص پیشہ اربابِ فکر و نظر
تھے۔ جو سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے
تھے، انسان کی فلاح و بہبود جن کا نصب العین
تھا۔ جنھوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کے
بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے اور اپنی خودی
کو عالمِ انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ شاعر کی شہرت اور بقا کا دار و مدار اُس کے کلام کی
خوبی اور حسنِ قبول پر ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جب تک شاعر ولی نہ ہو اُس کا کلام
بجائے خود کسی عزت کا مستحق نہیں۔ کاش فاضل نقاد ایک ہی ایسے فرشتہ صفت
محسنِ انسانیت شاعر کا نام لے دیتے۔ جو ابراہیم بن ادہم کی طرح بنی آدم کا
خادم بن کر خدا کا برگزیدہ بندہ بن گیا۔ اور اُس کی شاعری کی شہرت اس وجہ
سے ہوئی کہ زیورِ اخلاق سے آراستہ تھا۔ چاہے شاعر کی حیثیت سے قابلِ مذمت
ہو۔ کیا فردوسی ایسا خادمِ خلق تھا، سعدی تھا، حافظ تھا، خیام تھا، شکسپیر تھا،
ملٹن تھا، ڈانٹے تھا، اگر کوئی شاعر یا ادیب ہوا بھی ہو تو سوال پیدا ہوگا۔ کہ
شاعری نے اُس کو ایسا انسان بنا دیا یا شاعر ہونے کے علاوہ اُس کی افتادِ طبع

ایسی بھی بعض شاعر سیاہی یا مصلح بھی ہوئے ہیں ۔ اور ایسے بھی ہوئے ہیں کہ شاعر کی حیثیت سے مشہور مگر اطوار کے لحاظ سے مردود ۔ یہ ضرور نہیں ۔ کہ اچھا شاعر کردار کے اعتبار سے بھی اچھا ہو ۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاعر ہر قسم کی اخلاقی خوبیوں سے معرا ہوتا ہے بلکہ یہ کہ شاعر کی شہرت کا مدار اُس کے کلام پر ہوتا ہے ۔ نہ کہ اُس کے افعال و کردار پر علاوہ بریں اگر شاعر یا ادیب کی یہی تعریف ہے تو مصلح قوم، محب وطن اور خادم خلق کی کیا تعریف ہوئی ؟

اگر مضمون نگار کی تحریر کے آخری حصّہ کو لیا جائے ۔ اور تمام عبارت آرائی کا یہ لب لباب سمجھا جائے کہ شاعری یا ادب میں شاعر یا ادیب اپنے انفرادی تاثرات کو پس پردہ رکھے ۔ اور خارجی واقعات یا مسائل پر اپنی شاعری یا ادب کا زور صرف کرے ۔ تو عام ادب کی بابت جو چاہے کہے شاعری کا تو خون ہو گیا ۔ کیونکہ واقعات و مسائل عام اور پیش نظر ہیں جب تک شاعر کی انفرادیت اُن کی تنقید یا ترجمانی اپنے والہانہ انداز میں نہ کرے گی تو شاعری کہاں سے ہوئی ۔

ان صاحب نے ادب کا مقصد بھی بالکل انوکھا قرار دیا ہے ۔ تمہید میں فرماتے ہیں ۔ کہ

> اس سوال کا صحیح جواب دینے کے لئے ہم کو غور کرنا ہوگا ۔ کہ وہ کون سی چیز ہے جو ادیب کی تخلیق ادب پر مجبور کرتی ہے ۔ اور وہ کون سا اندرونی جذبہ ہے ۔ جو شاعر سے شعر کہلواتا اور فسانہ نگار سے کہانی لکھواتا ہے ۔ ہر شخص مخصوص خیالات و جذبات کا مالک ہوتا ہے ۔ اس کے

ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے (اور یہ عین فطرتِ
انسانی ہے) کہ میرے خیالات وجذبات ایک خاص
اہمیت رکھتے ہیں، پھر قدرتی طور پر یہ خواہش
اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کہ میں ان خیالات
وجذبات کا اظہار کروں۔ اور اُن کو دوسروں
تک پہنچاؤں .... ادیب اس لئے
شعر کہتا یا افسانہ لکھتا ہے۔ کہ وہ اپنے تاثرات کو
ایک مستقل شکل دے، اپنے خیالات وتجربات کو
دوسروں تک پہنچائے۔ اور اپنے جذبات و
احساسات میں وسیع انسانیت کو بھی شریک
کرے، وہ چاہتا ہے۔ کہ جو کچھ میں نے سمجھا اور
محسوس کیا ہے۔ دوسرے بھی سمجھیں اور محسوس کریں
دوسرے بھی حزن وملال، نشاط ومسرت اور
تفکر وتصور کا وہی لطف حاصل کریں جو خود میں نے
حاصل کیا ہے۔

اس تحریر کا استدلال ہی غلط ہے۔ وہ شاعر یا ادیب جو فطانت یا
(Genius) کے مالک ہیں، شاعری یا ادب کے شاہکار اُس عمر میں پیش
کر دیتے ہیں جب سن شعور کی ابتدائی منزلوں میں ہوتے ہیں اور تجربات کی پختگی
سے کوسوں دور۔ یہ ادعا بھی قطعاً غلط ہے۔ کہ پہلے انھیں اپنے خیالات وجذبات
کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان خیالات وجذبات کو شعر میں منتقل
کرتے ہیں (صرف شاعری سے بحث ہے) آدمی شعر اس لئے کہتا ہے کہ اُس کی

فطرت شعر کہنے کی محرک ہوتی ہے۔ جب تخیل شعر کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اُس کے بعد شاعر دوسروں کو اپنے اُس انفعالی تاثر میں شامل کرنا چاہتا ہے جو خود اس پر طاری ہوا تھا۔ اور جس نے شعر کی شکل اختیار کی۔ ورنہ خیالات و جذبات ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ اور اس گمان میں اہمیت بھی رکھتے ہیں؛ پھر وہ سب شعر یا افسانہ کیوں نہیں بن جاتے؟ نیز اس کی کیا وجہ کہ خیالات و جذباتِ شعرا در افسانے کے علاوہ کہیں خطابت، کہیں مذہبیات اور کہیں عمل یا سازش کی صورت اختیار کرتے ہیں؟ آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔ کہ ادب کا مقصد سماجی زندگی کو متاثر کرنا ہوا۔ شاعری کا مقصد جیسا پہلے بیان ہو چکا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حیات و کائنات کی تفسیر و تنقید کرے۔ اور ایسی زبان میں اور اس اسلوب سے کہ یہ تفسیر یا تنقید اپنے حسن و صداقت سے دل و دماغ کے لئے تسکین یا راحت کا موجب ہو۔ اسی سے ہم کہتے ہیں۔ کہ ادب کا مقصود بالذات دماغی اور روحانی مسرت یا تسکین مہیا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور "ادب برائے زندگی" جو اس مقصد سے ہٹ کر شاعری کو اُس کی بلندیوں اور لطافتوں سے محروم کر کے کثافت اور گندگی میں آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ نہ تو حیات کی تفسیر ہے نہ ترجمانی۔

اسی کے ساتھ پھر اس امر کے اعادہ کی ضرورت ہے۔ کہ شاعری کے دائرہ عمل سے کوئی واقعہ خارج نہیں۔ شاعر اگر دراصل شاعر ہے تو اُس کا موضوعِ سخن جو کچھ بھی ہو۔ زندگی کی تنقید یا ترجمانی ضرور ہو گی۔ کیونکہ موجودات میں کوئی شے ایسی نہیں۔ جو زندگی سے وابستہ نہ ہو اور یہ تنقید ایسے الفاظ میں اور اس انداز سے ہو گی۔ کہ اُس میں شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت جھلکیں گے اور یہی وصف شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور شاعری تو اظہار جذبات و خیالات کے دوسرے طریقوں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔

مگر جو لوگ "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" یا "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" یا حیا سوز فحاشی اور خواہشات جنسی میں ہیجان پیدا کرنے والی باتوں کو شاعری سمجھتے ہوں۔ اُن کو سمجھانے کی کوشش ہی پاگل پن ہے۔ خیر ع

تھا جذبِ عشق کا یہ بھی تقاضا، ہو گیا

ادب برائے زندگی کے علمبردار، ادب برائے ادب کا یہ مفہوم متعین کرتے ہیں کہ اس کا مقصد واحد سامان تفریح مہیا کرنا ہے۔ اگر تفریح سے مراد ادب کی دل آویزی ہے، وہ رنگینیاں ہیں جن میں ہم گم ہو جاتے ہیں۔ تو بے شک ایسا ادب سامانِ تفریح ہے۔ اور ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے، مگر حقیقی ادب کی دسترس گاہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اچھا ادب صرف حیات کا ترجمان ہوتا ہے۔ بلکہ دائرہ حیات کو وسیع کرتے کرتے، پھول پتی، ذرہ قطرہ اور دیگر بظاہر "بے جان" اشیا میں بھی حیات کا مشاہدہ کرتا ہوا انسان کو نامحدودیت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خود موت بھی زندگی کی ایک شکل بن جاتی ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر (میر)

ادب برائے ادب نے انسانی کردار کے اُن خصوصیات کو جن کا مظاہرہ جہد حیات میں ہوتا ہے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور محض خیالی اور مصنوعی دنیا نہیں بسائی۔ نیکی و نکوکاری، راستی، تواضع، خلق، حیا، نیز دیگر اخلاق حمیدہ کی تعریف کر کے اُن کی طرف رغبت دلائی، بدی، جھوٹ، ریاکاری دغا، فریب، ظلم، دل آزاری وغیرہ کی مذمت کی۔ مگر جو کچھ کہا۔ صناعت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ (گفتگو اچھے کلام سے ہے ورنہ رطب و یابس ہر جگہ ہے)

لہذا یہ کہنا کہ ہمارے ادب میں رومانیت اور قنوطیت کے سوا کچھ نہیں۔ ایک بے بنیاد اتہام ہے۔ تخیّل کے علاوہ طرز ادا اور بیان کی خوبی منجملہ اُن زیوروں کے ہیں جن سے عروس سخن سنواری جاتی ہے، اُن کو ادب کا مقصود بالذات کہنا غلط ہے، البتہ یہ مدعیان ادب برائے زندگی ادھوری محاکات اور مبہم معانی کا ایک کاواک ڈھانچہ بنا کے اُس کو زرق برق لباس میں لپیٹ کر "بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را" کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر یہ ناظورۂ ہزار شیوہ دراصل عفونت میں بسا ہوا اور غلاظت میں لتھڑا ہوا جھلنگا ثابت ہوتی ہے جس کی کراہت لیپ پوت نے دوبالا کر دی۔

ادب برائے زندگی کے مدعیوں کا بیان ہے کہ اُن کے مخالفین زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں سے بھاگ کر ایک فرضی اور مصنوعی دنیا میں پناہ لیتے ہیں، الفاظ میں موسیقیت اور خیالات میں رومانیت کی تلاش میں رہتے ہیں درانحالیکہ "ادب برائے زندگی" کا وجود ہی کالعدم ہو جاتا ہے۔ اگر زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں نے انھیں شاعری پر نہیں اُبھارا۔ یہ احساس بیچارگی و محرومی ہی ہے۔ جو قوت عمل نہ ہونے کے باعث نثر میں کوسنے اور گالیاں اور نظم میں "ماری جو رہیا" بن گیا، ٹکے ہاتھوں پیٹ پالنے کا دھندا بھی نکالا۔ دراصل وہ الزام جو دوسروں کے سر تھوپا جاتا ہے انھیں پر عائد ہوتا ہے یہی تلخی اور ناکامی ہے جس نے ان کی شاعری کو مسخ کا نمونہ بنا دیا ہے، اسمیں سوائے دانت پیسنے چیخنے چلانے، بوٹیاں نوچنے، خون بہانے اور ڈکارنے کے کچھ نہیں۔ جوش اور غالباً احسان دانش کو نکال دو تو کسی کی شاعری میں توپ و تفنگ، لاشوں کے ڈھیر اور خون کی ندیوں کے باوجود مردانگی اور دلیری کی ڈپٹ بھی نہیں۔ بڑبڑانا، رونا بیٹنا خواب میں بڑانا ہے سمندر کا

رزرو مد اور اُس کا طوفانی اضطراب مفقود ہے۔

شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو۔ جب تک اُس کی امتیازی شان موجود نہ ہوگی تاثیر اور کیفیت سے خالی رہے گی۔ راستی حسن اور شدتِ احساس اس کے ابعادِ ثلاثہ ہیں، اختراع و انتخاب و ترتیب اس کے آلۂ کار اور موسیقی و مصوری و تنوع اس کے رفیق ہیں۔ راستی سے یہ مراد نہیں کہ درخت کو درخت کہہ دیا۔ بلکہ جو نقش اُبھرے وہ کامل اور بے عیب ہو حسن سے یہ مدعا نہیں کہ کسی "مہ جبیں" کو دیکھ لیا اور ریجھ گئے۔ بلکہ وہ توازن و تناسب خیال و معنی ہے جس سے ایسا روحانی اہتزاز حاصل ہوتا ہے جو انسان کو "پوتر" بنا دے۔

یہ لوگ مدعی تو ہیں ادب برائے زندگی کے مگر ادب اور زندگی دونوں کے دائرے سے ہر شے کو سوائے چند "مفید" عنوانات کے خارج کر دیتے ہیں ان کی شاعری انسان کو حقیقت کا رازدار اور فطرت کا ترجمان بنانے کے بجائے انقلاب کے سامنے ناچنے تھرکنے اور سجا ست میں لوٹنے کی دعوت دیتی ہے شاعری کوئی بھی ہو عشقیہ یا غیر عشقیہ، جسد بے روح ہے، اگر حقیقت سے دور، جوش و خروش سے خالی اور تصنع سے پُر ہے یہ بھی یاد رہے کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا، نہ معلوم کتنے تک بند ہیں جنھوں نے یہ خطاب اپنے آپ کو دے رکھا ہے۔ ورنہ ممکن نہیں کہ سچا شاعر منظر کشی یا جذبات نگاری کرے اور سننے والا متاثر نہ ہو۔ مگر یہ "ادب برائے زندگی" کے موید جنھیں لم دستی ادب جدید سے زیادہ غالباً میتھو آرنلڈ کے اس مقولے نے کہ "شاعری تنقید حیات ہے" گمراہ کر دیا ہے۔ صرف اسی شاعری کے گرویدہ ہیں جو اشتراکیت و انقلاب کی تلقین کرے، چاہے شاعرانہ خوبیوں سے خالی ہو۔ ضرورت ہے کہ میتھو آرنلڈ

کا نظریہ دا سخ کر دیا جائے۔ تاکہ لوگ غلط بیانیوں کا شکار نہ ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ "شاعری کا مستقبل نہتم بالشان ہے کیونکہ شاعری میں، بشرطیکہ اپنے اعلیٰ مقصد کے شایاں ہو، بنی نوع انسان کو قابل رہنما ملے گا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جسکی بنیادیں متزلزل نہ ہوں۔ کوئی عقیدہ ایسا نہیں۔ جس پر شبہ نہ کیا گیا ہو، کوئی روایت ایسی نہیں۔ جو معرض خطر میں نہ ہو۔ اولاً مذہب واقعہ کی شکل میں پیش کیا گیا۔ مفروضہ واقعہ کی شکل میں، اُس کے بعد واقعہ پر جذبہ کا اضافہ کیا گیا، انجام جو ہونا تھا ہوا یعنی واقعہ نے مذہب کا ساتھ دینا چھوڑ دیا اب شاعری کو لیجئے، اس میں تخیل سب کچھ ہے، باقی اوہام کی دنیا ہے یعنی الہیانہ اوہام کی دنیا۔ مذہب کے علی الرغم شاعری تخیل سے جذبے کو منسلک کرتی ہے لہذا خیال واقعہ بنجاتا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہو۔ کہ مذہب کا راسخ ترین جزو اُس کی نامحسوس شعریت ہے!

ہمارا فرض ہے کہ شاعری کو زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اور زیادہ بلند رتبہ دیں، اب تک ہمارا رویہ اس کے خلاف رہا ہے، ہمیں چاہئے کہ شاعری کو قبول کردہ مقاصد سے رفیع تر مقاصد میں صرف کریں۔ اسطرح آدمی کا یہ خیال روز بروز قوی ہوتا جائے گا۔ کہ زندگی کی ترجمانی کیلئے شاعری کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ اور شاعری ہی سے تسکین اور تقویت حاصل کرنا ہو گی، شاعری کے بغیر سائنس نامکمل نظر آئے گا اور ایک بڑا حصہ ہمارے علم کا جس کو مذہب یا فلسفہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُس کی جگہ شاعری لے لیگی۔ جو دراصل تمام علوم کا نچوڑ ہے بلکہ روح رواں ہے۔

لیکن شاعری کا مقصد جب اتنا بلند رکھا جائے گا۔ تو لازم ہے۔ کہ اُس کا پایہ بھی اتنا ہی بلند ہو۔ تاکہ دونوں کا توازن منزل تک رسائی کا ضامن ہو۔

ہیں عادت ڈالنا چاہیئے۔ کہ شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کریں اور سختی سے جانچیں۔
نپولین کے سامنے کسی شخص کی بابت کہا گیا کہ "خود فریب ہے۔ نپولین
نے کہا کہ سچ ہے۔ مگر کیا کوئی ایسی جگہ ہے۔ جو خود فریبی سے ناآشنا ہو سینٹ
بیو کہتا ہے کہ سیاست اور حکمرانی کی سلطنت میں نپولین کا قول درست ہے مگر
جہاں تک دنیائے تخیل وصناعت کا دخل ہے۔ خود فریبی ٹکسال باہر ہے
اور انسانیت کا یہ قابل ادب جزو دخل فضل سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ خود فریبی
کی سعی ہوتی ہے۔ کہ عمدہ اور حقیر کا امتیاز مٹا دے یا باہم ملا دے، کیا قوی
ہے اور کیا ضعیف یا نیم قوی جو ایسے امتیازات کا مٹانا یا باہم ملانا شاعری
میں سخت ممنوع ہے کیونکہ جب تک شاعری کے مقاصد بلند ہیں۔ ایسے امتیازات
اہم اور ضروری ہیں۔ شاعری بحیثیت تنقید کے اُن شرائط کے تابع ہے جو
اس قسم کی تنقید کے لئے شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین نے
وضع کئے ہیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ امداد اور تسکین بخشے گی جس کی
بہم رسانی میں دوسری قوتیں عاجز ہوں گی۔ اور یہ تسکین وطمانیت اتنی ہی
قوی ہوگی جتنی شاعری میں تنقید حیات کی صلاحیت قوی ہوگی، نیز تنقید حیات
اتنی ہی موثر ہوگی جتنی شاعری حقیر ہونے کے عوض بلند پایہ ہوگی۔ کمزور
یا نیم توانا ہونے کے بجائے توانا ہوگی، کذب یا نیم راستی کے بخلاف راستی
پر مبنی ہوگی۔ ہمیں بہترین شاعری کی ضرورت ہے جس میں ہمارے کردار
کی تعمیر، ہمیں برقرار رکھنے اور خوش کرنے کی استعداد ہو۔"
آپ نے ملاحظہ کیا۔ کہ تنقید حیات قوانین حسن وصداقت کے ماتحت ہونا
چاہیئے۔ مگر یہ گم کردہ راہ "ترقی پسند" ادیب شاعری کو زندگی کی گھناؤنی
خواہشوں اور ہوس کاریوں میں آلودہ کرنا اور سیاسی پروپیگنڈا کا آلہ

بنانا چاہتے ہیں!

میتھو آرنلڈ نے بہترین شاعری کی جو معیاری مثالیں پیش کی ہیں اور
زور دیا ہے۔ کہ شاعری کو بالعموم ان سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اور جن کو سرچشمہ
مسرت قرار دیا ہے یہ ہیں۔

۱۔ مدت ہوئی۔ کہ وہ دھرتی ماتا کے نرم کنارے میں مصروف راحت ہیں،
اپنے ہی پیارے وطن اور اپنے اجداد کے وطن لیکیڈیمن میں (ہیلن اپنے
بھائیوں کا ذکر کرتی ہے۔ ہومر)

۲۔ اے نامراد گھوڑو تمھیں ایک فانی بادشاہ پیلوس کے سپرد کیوں کیا؟
لیکن تمھیں بڑھاپا چھو نہیں سکتا اور تم غیر فانی ہو، کیا یہ منشا تھا کہ انسان جو
مصیبت سہنے کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے شریک غم ہو؟ (زیوس بادشاہ
پیلوس کے گھوڑوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ہومر)

۳۔ ناں اے بوڑھے شخص ہم نے سنا ہے۔ کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب تو
بھی شاد کام تھا۔ (اکیلیز پرائم سے کہتا ہے جس وقت وہ اکیلیز کے سامنے
گڑگڑاتا ہے۔ ہومر)

۴۔ میں نہیں رویا اور اندر ہی اندر پتھر کا ہو گیا..... وہ روئے (ڈانٹے)

۵۔ اپنی رحمت سے خدا نے مجھ کو ایسا بنایا ہے۔ کہ مجھ پر مصیبت کا اثر
نہیں ہوتا اور اس آگ (دوزخ) کے شعلے مجھے گزند نہیں پہنچا سکتے۔ (ڈانٹے)

۶۔ خدا کی مرضی میں ہمارا امن ہے۔ (ڈانٹے)

۷۔ کیا تو اس بلند اور گھمنی پیدا کرنے والے بادبان پر جہاز راں لڑکے
کی آنکھوں پر مہر لگا دے گی۔ اور اس کے دماغ کو وحشی اور جابر موجوں کے
گہوارے میں لوریاں دے گی؟ (ہنری چہارم نیند کی خوشامد کر رہا ہے (شیکسپیر)

۸۔ اگر کبھی تیرے دل میں میری جگہ تھی۔ تو تھوڑی دیر کو آرام کی بیعت
چھوڑ دے۔ اور اس بے رحم دنیا میں اوپر کی سانسیں لے کر میری کہانی سُنا۔
(ہیملٹ۔ شیکسپیر)

۹۔ اس تاریکی میں بھی معلم الملکوت (شیطان) اُن سب سے بلند اور تابناک
تھا لیکن اُس کے چہرے پر بجلیوں نے گہرے نشان نالیوں (جھریوں) کی شکل
میں چھوڑے تھے اور اندوہ اُس کے رخسار پر متمکن تھا (ملٹن)

۱۰۔ ہمت جو فرمانبرداری یا مغلوب ہونے کو ٹھکرا دے اور باقی جو کچھ ہے
اُس پہ فتح نہ حاصل کرے۔ (ملٹن)

۱۱۔ وہ نقصان جس نے کیسر بز کو دنیا بھر کی خاک چھاننے کی زحمت گوارا
کرنے پر مجبور کیا۔

اس کے بعد میتھو آرنلڈ ارسطو کا قول نقل کرتا ہے۔ کہ شاعری میں اعلیٰ
درجہ کی صداقت اور متانت ہونا چاہئے۔

ان مثالوں اور اقوال کی روشنی میں "ترقی پسند" ادیبوں کی نظمیں پڑھی
جائیں۔ تو ان باتوں کا شائبہ بھی نہ ملے گا۔ ان میں انقلاب اور خونریزی کی
تعلیم اور ترغیب کے سوا کچھ نہیں، وہ بھی بھونڈے الفاظ میں، اور یہ باتیں
ایسی ہیں جن کو شاعری کے بلند اور مقدس مقاصد سے دور کا بھی لگاؤ نہیں
اُن میں اُس اعلیٰ صداقت کا نام نہیں جو سطحی نگاہوں سے مخفی ہو اور جس کا
انکشاف شاعری کا فرض اولیں ہے۔ متانت کا ذکر ہی بیکار ہے۔ اُس کی
ہوا بھی نہیں لگی۔ تاہم یہ لوگ میتھو آرنلڈ کے قول کو اپنا دستور العمل بنانے
کے مدعی ہیں اور کتابیں کی کتابیں اور مضمون پر مضمون اپنی بیباک گمراہی
کی تائید میں لکھ مارے ہیں۔ اتان اسپر ٹوٹتی ہے۔ کہ ہماری شاعری حیات کی

بھی تنقید اور ترجمانی ہے جس نے شاعری کو خیالی پلاؤ پکانے کے بجائے حقائق حیات سے قریب تر کر دیا ہے۔ اگر حیات کا مفہوم میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں حقیقی حسن و صداقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ تو ان لوگوں نے "اس شاہد معنی" کا ایک جلوہ بھی آشکار نہیں کیا۔ اگر شاعری کا فرض وہ عظیم الشان اصول منضبط کرنا ہے جو انسان کو ایسا سکون و اطمینان و انبساط بخشیں جس کی تکمیل کو مذہب اور سائنس ناکافی ہیں۔ جو مذہب کی آنکھوں کا نور اور سائنس کے رخسار کا غازہ ہیں تو اس سلسلے میں "نیا ادب" اور اس کی شاعری کا نام لینا بھی ادب اور شاعری کی توہین ہے۔

ایک جگہ میتھو آرنلڈ نے اصلی اور مصنوعی شاعری کا فرق بیان کیا ہے وہ کہتا ہے۔ کہ ایک کی نشو و نما ذہن اور دماغ میں رہتی ہے۔ اور دوسری روح کی گہرائیوں میں تربیت پاتی ہے مصنوعی شاعری میں فکر کا کوئی مستقر نہیں ہوتا اور شعر کے الفاظ محض چند نقوش پیش کر دیتے ہیں۔ جو نثر کی عام زبان بھی کرتی ہے۔ عریانی تخیل کے پردہ پوش چند خوش آیند فقرے ہوتے ہیں جن میں کچھ لمحوں کے لئے آدمی ایک قسم کی دلکشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسی شاعری ہمیں واقعات کی سطح سے بہت نیچے لئے جاتی ہے۔ اس سے ہمارا وہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اشیا اپنے حقیقی حسن میں جلوہ گر ہوں۔ اصلی شاعری کا ارتقا ایسا ہے۔ گویا کوئی شئے شاعر کی روح میں ڈوب کر ہیجان برپا کرتی ہے۔ اور آخر کار سیراب و سرشار ہو کر اپنی فطری اور درخور قبول رعنائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آتی ہے۔ یہ ارتقا مصنوعی صنعت گری سے زیادہ روشن اور زیادہ تسکین دہ ہوتا ہے، اسی طرح اس کی زبان بھی سادہ و سلیس ہوتی ہے لیکن یہ سعادت صرف اُن لوگوں کا حصہ ہے۔ جو زندگی کے سرچشمے سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور سطحی موجوں سے نہیں کھیلتے۔

اس اصول کی روشنی میں بھی ترقی پسند ادب اور اس کی شاعری پرچھائیں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے تخیل کا افلاس اپنا آپ سوگوار ہے۔ ان کی شاعری "مزدور" اور "انقلاب" کے کھلونوں پر پڑکر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اور بس! اس کے ماسوا ان کی شاعری میں نہ تو جدّت ہے نہ ترقی کے آثار۔

ایک دوسری جگہ میتھو آرنلڈ کہتا ہے

شرافت پر مبنی کھرے خیالات کو زندگی سے مطابق کرنا شاعرانہ عظمت کا ضروری جزو ہے۔ بڑے شاعر کی برتری اسی میں ہے۔ کہ اُن شرائط کے ماتحت جو شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت کے قوانین اُس پر عائد کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کو زندگی سے ہمنوا کر دے۔ موضوع شاعری خواہ انسان ہو خواہ فطرت، خواہ حیات انسانی، شاعر اپنے وضع کردہ خیالات سے اُن کی ترجمانی کرے۔ ان خیالات میں شرافت و متانت ہونا لازمی ہے۔

ہمیں یہ امر کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کہ شاعری فی نفسہٖ تنقید حیات ہے۔ اور ایک شاعر کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ قوت اور حسن کے ساتھ حیات پر اپنے خیالات کی روشنی ڈالتا ہے۔ اور اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہے۔ کہ ہمیں کس طرح جینا چاہیئے۔ ہم اخلاقیات کا مفہوم اکثر غلط سمجھتے اور اُس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں۔ اور اخلاقیات کو کسی نظام خیال یا عقیدہ سے جن کا عہد حکمرانی گزر چکا۔ مگر جو چند پیشہ ور نقالوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ وابستہ کر دیتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ ہم اُن کو سنتے سنتے اکتا جاتے ہیں بعض مرتبہ ہمیں ایسی شاعری سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جس میں اخلاقیات سے کھلی بغاوت ہے یا ایسی شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جو اخلاقیات سے بے پرواہ ہے۔ اور جس کا موضوع گو غیر متعین ہے۔ مگر طرز ادا میں ندرت پیدا کی گئی ہے

دونوں صورتوں میں ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ
اُس عظیم و نامحدود معنی رکھنے والے لفظ "حیات" پر برابر غور کرتے رہیں یہاں تک
کہ اُس کے مفہوم پر کامل عبور حاصل ہو جائے۔ جو شاعری اخلاقیات سے بغاوت
کرتی ہے۔ وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے۔ جو شاعری اخلاقیات کو نظر انداز
کر دیتی ہے۔ وہ حیات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

اپکٹٹس نے کہا عمدہ تخیل ان چیزوں کی پیش کی ہے جن کا تعلق محض حیات
سے ہے۔ یا جن میں لفظی یا ظاہری خوش اسلوبی و صناعت ہے، یا جن کو مدلل
بنانے میں ذہانت سے کام لیا گیا ہے۔ بعد ازاں اُن کا موازنہ اُس بہترین
اور فائق تر چیز سے کیا ہے۔ جس سے ہمارا گہرا تعلق ہے یعنی کس طرح زندگی بسر
کرنا چاہئے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ بعض لوگ ایسی چیزوں سے جن کا رشتہ حیات سے
وابستہ ہے۔ ڈرتے ہیں۔ یا ناپسند کرتے ہیں۔ یا قدر و قیمت گھٹا دیتے ہیں یہ
لوگ صرف غلطی پر نہیں۔ بلکہ ناشکر گزار یا بزدل ہیں لیکن یہ بھی امکان ہے۔ کہ
ایسی چیزوں کی قیمت بے جا طور پر بڑھا دی جائے۔ اور انھیں کو حاصل حیات
سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ وہ حاصل حیات نہیں۔ بلکہ حیات سے اُن کا وہی تعلق
ہے۔ جو گھر اور سرائے میں ہوتا ہے، گویا ایک شخص جو سفر سے گھر کا عازم ہے
راستے میں ایک عمدہ سرائے دیکھتا اور اُس کو پسند کرتا ہے۔ اور وہیں مستقل قیام
کی ٹھان لیتا ہے اے انسان تو اپنا مقصود بھول گیا۔ یہ تیری منزل نہ تھی۔
بلکہ اس سے ہو کر گزرنی تھی" "لیکن یہ سرائے دلکش ہے؟" اسی طرح اور سرائیں اور مرغزار
بھی دلکش ہیں، لیکن صرف رہگذر کی حیثیت سے۔ تمھارا ایک خاص مقصد ہے
اور وہ یہ ہے۔ کہ گھر پہنچ جاؤ اور اپنے خاندان، اپنے دوستوں اور ہم وطنوں
کے ساتھ جو تمھارے فرائض ہیں ادا کرو۔ اندرونی آزادی، سکون، خوشدلی

اور قناعت حاصل کرو انداز بیان تمھیں اپنی طرف کھینچتا ہے، دلائل اپنی طرف
مائل کرتے ہیں۔ اور تم اپنے گھر کو بھول جاتے ہو اور ظاہری رعنائیوں میں الجھ کر
وہیں اپنا مسکن بنانا اور وہیں رہ جانا چاہتے ہو۔ تمھارا عذر صرف اس قدر
ہے۔ کہ وہ دلکش ہیں۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ دلکش ہیں؟ لیکن محض رہگذر
یا سرائے کی طرح! جب میں ایسا کہتا ہوں تو الزام دیتے ہیں۔ کہ میں اسلوب بیان
اور استدلال کا دشمن ہوں۔ اور اُن سے بے پروائی برتنے کی تعلیم دیتا ہوں
میں ایسا نہیں کرتا۔ میں تو اُن میں کھو جانے، انھیں کا ہو رہنے کے خلاف تنبیہہ
کرتا ہوں۔ کہ حاصل سے بے خبر ہو گئے، جس کی سرحد اور آگے ہے۔

چند بلند مرتبت شاعروں کو مستثنیٰ کرکے جن کی شاعری میں تنقید حیات
شاعرانہ صداقت اور حسن سے شیر و شکر ہو گئی ہے۔ باقی شاعروں کے کلام
میں محاسن و معائب کا موازنہ اور یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ کہ محاسن کا پلہ بھاری
ہے یا معائب کا۔ میتھو آرنلڈ مزید وضاحت کرتا اور کہتا ہے۔ کہ یہ قول مجھ سے
منسوب کیا جاتا ہے۔ کہ میں شاعری کو تنقید حیات کہہ کر شاعری کو نثر سے ممیز
کرتا ہوں گویا نثر میں تنقید حیات نہیں ہو سکتی۔ میتھو آرنلڈ کا جواب ہے کہ
میں نے یہ جملہ یعنی تنقید حیات بہت برس ادھر استعمال کیا تھا۔ اور عام ادب
کے متعلق استعمال کیا تھا، شاعری کی تخصیص نہیں کی تھی، میرے یہ الفاظ تھے
"ہر ادب کا منشائے آخر اگر غور کیا جائے تو تنقید حیات کے سوا کچھ نہیں" لیکن
شاعری میں تنقید حیات، شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے اصول کے
مطابق ہونا چاہئے، یعنی اصل مضمون اور طرز ادا میں سچائی اور متانت ہو۔ اظہار
خیال مناسب الفاظ اور مکمل خوش اسلوبی کے ساتھ ہو۔ یہی خوبیاں ہیں۔ جو بہترین
شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور انھیں سے میرا مدعا ایسی تنقید حیات

ہے۔ جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کے پہلو بہ پہلو ہوں لیکن
گنتی کے ایسے شاعروں سے قطع نظر جو "کلاسک" ہیں اُن سے کم پایہ شاعروں
میں ہم دیکھتے ہیں کہ مکمل راستی و متانت، اور مکمل صدق شگفتہ انداز بیان
کے شمول میں ہر جگہ نظر نہیں آتے، لہٰذا اس کی ضرورت ہے کہ اُن کے کلام
سے عمدہ نمونے منتخب کر لئے جائیں، اور اُن کے کلام کا بعض حصہ قبول اور
بعض حصہ رد کر دیا جائے۔ اور اس عملِ رد و قبول کے بعد اُن کے کلام پر رائے
زنی کریں اور ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے موازنہ کیا جائے۔

میتھو آرنلڈ کے معقولات ختم ہوئے۔ اُس کے برعکس ہمارا یہ حال ہے کہ
ہر شاعر کو جو کنجشک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شاہین یا عقاب سمجھ کر بشرطیکہ
مزدور اور انقلاب کا راگ الاپے "ادب برائے زندگی" کا نمائندہ اور ناقدِ
حیات قرار دیتے ہیں۔ اور اُن فتوے سے قطعاً چشم پوشی کرتے ہیں کہ شاعری
میں تنقیدِ حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کی پابند ہے۔
نظر حیات اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہونا چاہئے سیاسی معتقدات
کو نظم کر دینا اور اُن امور کو جو سطحی اور پیش پا افتادہ ہیں۔ اور نظم کی بہ نسبت
نثر میں ہزار درجہ بہتر اور قوی تر الفاظ میں بیان ہو چکے ہیں۔ بحور اوزان
میں لے آنا نہ تو شاعری ہے۔ اور نہ تنقیدِ حیات ہے میتھو آرنلڈ نے اپنی
تصانیف میں متعدد جگہ شاعری کو تنقیدِ حیات کہا ہے۔ مگر ہر جگہ یہ شرط لگا دی
ہے کہ تنقیدِ حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کے
مطابق ہو۔ مگر ہمارے مفتخر ادیبوں اور نقادوں نے صرف تنقیدِ حیات کو
لے لیا۔ باقی اجزا کو جو نہایت اہم تھے، چھوڑ دیا اور وہ غالباً اس لئے کہ
"ادب برائے زندگی" کا ہیولیٰ طیار کرنے میں مخل اور سخت مخل تھے۔ میں

امید کرتا ہوں کہ میتھو آرنلڈ کے معقولات سے ثابت ہو گیا۔ کہ تنقید حیات کا وہ مفہوم ہی نہیں۔ جو "ترقی پسند" ادیب اُس کے سر تھوپتے ہیں "ادب برائے زندگی" کا پشت پناہ بھی فقرہ تنقید حیات تھا۔ جب اس کا مفہوم ان لوگوں کے مفروضہ مفہوم سے الگ ہو گیا تو "ادب برائے زندگی" کی پوری عمارت ڈھے گئی اور اب کوئی نئی تعریف گڑھنا ہو گی۔

ایک دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ پر غور کیجئے۔ روس میں شاعروں اور ادیبوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ خیالی دنیا میں بسر نہ کرو۔ بلکہ میدان عمل میں کود کر حق و انصاف کی حمایت اور جور و استبداد کی مخالفت پر کمربستہ رہو ہندوستان میں "ادب برائے زندگی" کے علمبردار صرف قلم سے ہنگامہ کا رزار گرم کرتے اور مارتے مرتے ہیں تاہم ادب برائے ادب کو نام رکھتے ہیں۔ مجھے تو چنداں فرق نظر نہیں آتا کیونکہ اگر ایک میں معشوق کی پلکیں صف آرا ہو کر بیچارے عاشق پر تیر باراں کرتی تھیں۔ تو "ادب برائے زندگی" میں یہ خیالی جانباز مفروضی آلاتِ حرب کا نشانہ ہیں۔ جیسے دونوں میں صرف معبادِ ہوائی ہیں"

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ادب کا فرض اولیں یہ ہے۔ کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ، نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق مٹا دے۔ اور اس جماعت کا ترجمان ہو۔ جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو۔ ایسی جماعت کو شاعر کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ بہیمانہ زندگی کی طرف بازگشت ہے جس میں فنون لطیفہ کا خیال بھی ستم ظریفی ہے۔ کیا اچھا طریقہ آزادی کی نشو و نما اور استبداد کو کچلنے کا نکالا ہے! پھر فرماتے ہیں۔ کہ ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔ اب اسے اس جذبہ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہئے۔ کہ زندگی ابدالآباد تک ہے اور انسان اس کا

کارسازِ حقیقی ہے۔ قیامت کے یہ معنی ہیں۔ کہ روح الاجتماع داورِ محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کر دے۔ اور پھر اسی زمین پر ایک ایسی بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی، جسمانی اور روحانی ترقیوں کی بلندیوں تک پہنچے۔

ان لوگوں کی غلامانہ ذہنیت اور ہرزہ سرائی کا یہ عالم ہے۔ کہ ایک طرف تو دہریت اور الحاد کی تعلیم دیتے ہیں، مذہب، امتیازِ نسل وغیرہ کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ازل و ابد، قیامت، دوزخ، رُوح، بہشت اور مماثل تصورات پر جو مذہب اور تہذیب سے مستعار ہیں صورت بگاڑ کر عقیدہ رکھتے ہیں پھر اس عظیم الشان تکمیل کو شاعر کے فرمودات کا محتاج قرار دیتے ہیں جس کا نعرۂ جنگ "ادب برائے زندگی" ہے! شاعر نے اور اس کے ہمنوا انسانوں نے کہدیا کہ "ہم زندگی کے کارسازِ حقیقی ہیں" اور لوگ! ایک چیخ اٹھا کہ ہیں نے استبداد کو کچل دیا۔ اور وہ کچل گیا! "اے بہشت صفحۂ ارض پر اُتر آ" اور وہ اتر آئی! یہ تو بہت سہل نسخہ اور وہ بھی صرف "ادب برائے زندگی" کے زور پر یا کسان کے بل بوتے پر کہ وہ آپ کا آلۂ کار بنے قتل و غارت کرے، اور عنان حکومت آپ کے دست مبارک میں دیدے۔ کہ لو بھائی اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ غرضکہ ادب برائے زندگی ہر مرض کی دوا۔ وار خالی بھی گیا تو کوئی مضائقہ نہیں، ساری بلا کسان کے سر گئی، اور آپ نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ "ادب برائے زندگی" کا "فارمولا" بیکار ثابت ہوا تو "ادب برائے بیکاری" یا اسی قسم کی اور کوئی ہانک لگانا شروع کر دی۔

جذبی کا جب یہ شعر پڑھتا ہوں تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کو

نئے ادب کا پورا دھواں دھار اور شعلہ بار سانپ کی پھنکاریں لینے والا تبلیغی لٹریچر اس ایک شعر پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے زندگی کی صحیح تنقید اور ترجمانی اور اگر اسی کا نام ترقی پسند ادب ہے تو سر آنکھوں پر۔

اشتراکی شاعری کے ریگستان میں سجاد ظہیر کا مشورہ بھولے بھٹکوں کیلئے خضر راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر سنتا کون ہے۔ منزل دشوار گزار ہے جس پر گامزن ہونے کو عزم و ہمت و استقلال کی ضرورت ہے۔ اور یہی اوصاف عنقا ہیں (دیکھو صفحہ ۵۴ نیا ادب، خاص نمبر)

اچھے شاعر ہر عہد میں اکا دکا ہوتے ہیں معمولی شاعر (خصوصاً پر آشوب زمانے میں)، اس طرح نکل پڑتے ہیں۔ گویا روح بربادی، معہ اپنی ذریت اور لاؤ لشکر کے مجسم ہو گئی۔ ان کی سعی ہوتی ہے۔ کہ صدیوں کی اندوختہ حکمت کو ملیا میٹ کر دیں۔ اور اس کی جگہ دقتی توہمات کا علم بلند کر کے جس طرح ہوا بادلوں کو تتر بتر کرتی یا اُن کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ بادشاہوں کے تخت اور سلطنتوں کا تختہ الٹ دیں بعض اچھے شاعر اور مفکر بھی اس لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اور کچھ دیر کے لئے انھیں کی سی گانے لگتے ہیں۔ انگلستان کا ایک شاعر جو بعد کو شہرۂ آفاق ہوا عنفوان شباب میں جب انقلاب فرانس سے متاثر تھا۔ تو یوں ڈینگیں مارتا تھا۔

"قدیم چیزیں بوسیدہ ہو گئیں
اچھی چیزوں میں کوئی شے کافی اچھی نہیں
ہم ثابت کر دیں گے کہ دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔
اس دنیا میں بھی بادشاہ ہوں گے، لیکن وہ زندگی اور موت کی نشانیاں ہمارے ہاتھ سے لیں گے۔

سلطنتیں بادلوں کی طرح چولا بدلتی رہیں گی، گویا میری سانس کی تابع حکم ہیں۔"

یہی "ادب برائے زندگی" کا نعرہ ہے۔ سو برس سے زیادہ کے گڑے ہوئے مردے آج اکھیڑے جا رہے ہیں۔ اور یہ گورکنی مائۂ ناز سمجھی جاتی ہے!"

اِن تو کہنا یہ تھا کہ معمولی اور وقتی شاعروں میں جو مستقل "قدروں" سے ناواقف ہیں، چڑچڑے پن کا سبب تلاش کرنے کو دور جانے کی ضرورت نہیں ایسے شاعر اُن خواہشوں کے غلام ہوتے ہیں۔ جو اُن کی دسترس سے باہر ہیں اور جن کے حصول میں ناکام رہنے پر اپنے دل کا بخار یا بھڑاس شاعری میں نکالتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ کہ عامۃ الناس بغیر جائزہ لئے ہوئے ایسی دل خوش کن شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں، حیرت تو یہ ہے کہ بعض وہ اشخاص بھی جن کی لیاقت مسلم ہے۔ اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی اتفاقی حادثہ یا بحث اُن کو چونکا کر ایسی شاعری کی خامیوں اور خامکاری سے آگاہ کر دیتی ہے۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو نہ صرف وہبی شاعری بلکہ اکتسابی علوم سے بھی بے بہرہ ہیں، وہ بر خود غلط افراد جو معمولی صنعت اور پیشہ وری میں بھی نکمے ثابت ہوئے اتنے ہی مدمغ بھی ہیں۔ جتنے جاہل اور بے حس ہیں جو کبھی کاہلی اور سفاہت کی بنا پر شاید کر لیتے تھے، بغض و حسد و کینہ کے زیر اثر شاعر بن بیٹھے۔ اور اچھے اچھے شاعروں کے منہ آنے لگے اور بعض اوقات کتب فروشوں کی سازش سے تجارتی فائدہ بھی اٹھانے لگے، عوام میں عارضی شہرت بھی پیدا کر لی کیونکہ خوشامد کا وہ زبردست طریقہ اختیار کیا جس کا جادو کبھی پھٹ نہیں پڑتا یعنی انسان کے جذبات بدی و فتنہ و شر کو مشتعل کرنا۔

ان سے کوئی پوچھے۔ کہ صرف دولت ہی کیا وہ جنس ہے۔ جو ذہنِ انسانی کی جولانگاہ بن سکتی ہے؟ کیا حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے اور واقعات دزفرد وارا چپقلش ہیں جہاں قومیت کا خواب محتاج تعبیر ہے۔ اشتراکی اصول کی ترویج، خیالی پلاؤ پکانے یا بھنگ گھوٹنے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے؟

ان کے ہفوات کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے۔ تو کیا شاعر کی دولت اُس کے شاعرانہ کارنامے نہیں ہیں۔ اور مزدور کا انعام جو وہ محنت نہیں ہے جس کی وجہ سے اُس کو سراہا جاتا ہے؟ یا اسی کے علی الرغم سرمایہ دار، انھیں برائیوں کی بدولت جو اُس سے منسوب کی جاتی ہیں مفلس اور قابل رحم نہیں؟ تاہم ایک تو حکومت کا مستحق اور دوسرا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل۔ کیا زندگی کا مفہوم اس قدر تنگ ہے؟ اگر "ادب برائے زندگی" کی یہی بساط اور اس کے تخئیل کی پرواز یہیں تک ہے۔ تو ایسے ادب اور اُس کے حامیوں پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ اگر شاعری نفس انسانی کی گہرائیوں اور حیات کائنات کا مستقل اور دلکش مرقع ہے۔ تو یہ "ترقی پسند" ادیب یا شاعر ایسے ہیں جو پہاڑ کی بلندیوں پر شعر و ادب کا درخشاں معبد تعمیر کرنے کے بجائے دامن کوہ کے دھندلے کھر پر نقش و نگار بنا رہے ہیں۔ جسے ہوا کا ایک جھونکا اڑا کر لیجائیگا۔

میرے محترم دوست پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کے الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ایک ذی اثر طبقۂ مفکرین ہے جس کا خیال ہے
کہ ایسی چیز کا بھی وجود ہے جس کو کہ "ترقی پسند ادب"
کہتے ہیں۔ "ادب جدید" کا ہمیں علم ہے، ہر زمانے میں
طرزِ نو سے اُس کی تخلیق ہوتی ہے اور ہر دور اپنے

سے ماسبق دور کو "رجعت پسند" کہتا ہے مگر "ترقی پسند" ادب کا تو یہ مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ کہ ادب کو سیاسیات ومعاشیات کے ایک خاص مارکہ کے پروپیگنڈہ کا آلہ بنایا جائے۔ اگر ادب میں ترقی کا منشا انداز بیان میں جدت آفرینی ہے نئے سروں یا سنگیتوں کی تلاش یا ایجاد ہے، نئے شاعرانہ تناسبات لوازم کا دریافت کرنا ہے تو البتہ اس فقرے کے کچھ معنی اور اس میں کچھ معقولیت ہو سکتی ہے۔ ورنہ محض ہے موضوعاتِ ادب نئے نہیں ہو سکتے، زیادہ سے زیادہ اہمیت کا مرکز ثقل بدل جائے گا یا احساس قدر رد قیمت میں تغیر رونما ہوگا یا نقطہ نظر مختلف ہو جائے گا ترقی پر بھروسہ، استعداد عمل وحرکت کا اعتبار، بھوک، گندگی، اور چیتھڑوں کی قصیدہ خوانی یہ باتیں بھی نئی نہیں ہیں۔ مگر وہیت کی پوجا بھی نئی نہیں تعطل اور ناکامی کا احساس جن سے برتے پر عہد حاضر فلسفے میں جدید ابواب اضافہ کرنے کا مدعی ہے۔ وہ بھی نئے نہیں، بتیاب تمنائیں جد وجہد، دعوتِ عمل، ہمت دجرأت، ناقابل اطمینان دارزاں عمومی نظام اشیاء سے دل برداشتگی کوئی عہد ایسا نہیں گزرا ہے۔ جہاں انفرادیت کو کچلا نہیں جاتا اور جہاں رائے، نظریہ، اور

طبائع کو حکومت ایک خاص ڈھرّے پر نہیں لگاتی،
وہ خود صناع یا ادیب کا نقطہ نظر ہے، خود اس کا
فلسفہ ہے، "باقی رسمی پیترے ہیں"

"ادب لطیف لاہور"
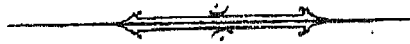
نظمِ معریٰ اور آزاد شاعری

از مولانا نیاز فتحپوری

فرقت صاحب نے اپنی کتاب آوا کیلئے مجھ سے ایک تنقیدی مضمون
کی فرمائش کی تھی چنانچہ یہ مضمون اس کتاب کیلئے لکھا گیا تھا
مگر اسی زمانہ میں ایک دوسرے صاحب نے آزاد شاعری کے
بارے میں میری رائے دریافت کی چنانچہ میں نے فرقت صاحب سے
اجازت لیکر اسکو نگار میں شائع کر دیا۔ "نیاز"

آج کل یہ مسئلہ اکثر اہلِ ادب و انشا کا موضوعِ فکر بنا ہوا ہے اور خصوصیت
کے ساتھ ہمارے نوجوان طبقۂ شعر و سخن میں اس پر بہت گفتگو ہوتی رہتی ہے
چنانچہ اس مرتبہ میرے قیام حیدر آباد کے زمانہ میں، جامعہ عثمانیہ کے متعدد طلبہ
نے مجھ سے اس باب میں استفسار کیا۔

اس میں شک نہیں کہ زبان کا مقصود صرف اظہار خیال و جذبات ہے
اور جو زبان جتنے زیادہ الفاظ و اسالیب بیان اس مقصد کی تکمیل کے لئے رکھتی
ہے، وہ اتنی ہی زیادہ وسیع و کامیاب ہے لیکن جس طرح ہر لفظ کا ایک خاص
مفہوم ہوتا ہے اسی طرح ہر اسلوب بیان کا ایک خاص محل استعمال ہوتا ہے
اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ملک کے لٹریچر یا ادبیات کا نشو و ارتقا یکسر
قومی تہذیب و معاشرت کا ممنون ہے اور سماج کے نظام سے علیحدہ ہو کر
کوئی زبان ترقی نہیں کر سکتی۔

ظاہر ہے کہ شعر یا نظم زبان کے ابتدائی دور کی چیز نہیں، بلکہ جب ترقی

تمدن ایک خاص منزل پر پہونچ گئی تو لٹریچر میں شعر پیدا ہوا۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت نثر و نظم کے درمیان تفریق کے کیا اُصول تھے اور شعر کے لئے کیا خصوصیات ضروری سمجھی جاتی تھیں، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شعر آہنگ یا موسیقی سے ضرور تعلق رکھتا ہوگا اور ایک خاص قسم کا ایقاع (Rhythm) اس کی جان رہا ہوگا۔

شعر نے اس کے بعد آہستہ آہستہ کیا صورتیں اختیار کیں، ان سے بحث کرنے کا موقع نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ شاعری نے زمانہ کے ساتھ ساتھ ضرور ترقی کی، اور اس ترقی کا تعلق بالکل آہنگ یا تال سے تھا اور یہیں سے بحروں کی بنیاد پڑی جنھیں ہم گانے کے ماتروں یا درمیان کے متعین وقفوں سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن سم یا تال کا سوال اس سے حل نہ ہوتا تھا اس لئے بحروں کے وزن کے ساتھ ردیف و قافیہ بھی ضروری قرار دیا گیا۔ کہ اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی تھا کہ سننے والے کا احساس توازن پہلے ہی سے شعر کا ہم آہنگ ہو کر تال یا ایقاع سے کافی لطف اٹھا سکتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی قوم کا تمدن زیادہ مہذب و شائستہ ہو جاتا ہے تو اسمیں تکلفات و تصنعات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں اس لئے تمدن اور زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ شعر میں وزن و ردیف کی پابندیاں بھی بڑھیں اور کمالِ فن یہی قرار پایا کہ ایک شاعر انھیں قیود کے ساتھ شعر کہے۔ پھر نہ صرف شعر و شاعری بلکہ تمام فنون میں ترقی کا معیار یہی قرار پایا کہ اس میں زیادہ نزاکتیں، زیادہ مشکلات پیدا کی جائیں اور اربابِ فن انھیں پیچیدہ راہوں سے گزریں نقاشی و سنگتراشی کو دیکھئے کہ قدیم تمدن میں ان کی کیا صورت تھی اور پھر ترقی یافتہ زمانہ میں وہ کتنی نازک و پیچیدہ ہو گئی۔

وحشی قوموں کے رقص و سرود کو دیکھئے اور اسی کے ساتھ زمانۂ حال کے رقص و سرود کو، بین فرق آپ کو نظر آئے گا۔ یہیں ہندوستان میں گونڈوں اور بھیلوں کے ناچ کو دیکھئے کہ زمین پر بھی قدم صاف نہیں پڑتے اور اسی کیساتھ کالکا بندادین کے رقص کو، کہ تلواروں کی دھار پر ان کے قدم کو لغزش ہوتی۔ قدیم عہد کے بھاٹوں کی موسیقی کو دیکھئے اور پھر اس وقت کی موسیقی کو جب خیال کی ایجاد ہوئی۔ الغرض ترقی تہذیب کے ساتھ نہ صرف شاعری بلکہ تمام فنون میں مشکلات اور نزاکتیں پیدا ہوئیں اور انھیں کا رکھ رکھاؤ معیار کمال قرار پایا۔

اب اگر ہم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ شاعری کی ان قیود کو توڑ دیا جائے تو اس کی کوئی وجہ ہونا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ردیف و قافیہ، وزن و بحر کی پابندی کی وجہ سے جذبات و خیالات کو کماحقہٗ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کیا یہ بات خود اُن لوگوں کے شاعرانہ اہلیت کی کمزوری نہیں، کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نظم معرّا یا آزاد نظم کا مطالبہ وہی لوگ کرتے ہیں، جن میں شاعری کے قیود کے ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت نہیں ہے جنکے پاس الفاظ اور اسالیب بیان کا ذخیرہ کم ہے۔

اس وقت تک ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ جتنا کچھ کہا جا چکا ہے، اگر ہم اسے سامنے رکھیں، تو "آزاد نظم نگاری" کا کون سا خیال یا جذبہ ایسا ہے، جو ہم کو اس میں نہ ملے گا۔ بات صرف یہ ہے کہ اس وقت کے نوجوانوں کا مطالعہ بہت تنگ ہے اور انھیں بالکل اس کی خبر نہیں کہ ان کا کوئی خیال نیا نہیں ہے اور ہر وہ بات جسے وہ ردیف و قافیہ کی پابندی سے علیحدہ ہونے کے بعد ہی کہہ سکتے ہیں، بارہا شاعری کے تمام قیود کیساتھ کہی جا چکی ہے۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا امتحان یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کوئی بہتر سے بہتر نظم معرا کسی مشاق شاعر کو دیجئے، وہ ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ انھیں خیالات کو نہایت خوبی سے ادا کر دے گا۔

"نظم معرّیٰ" کہنے والوں کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ ردیف و قافیہ کی پابندی ہٹا لینے سے شعر کا ترنم و آہنگ مفقود ہو جاتا ہے اس لئے اس ترنم و آہنگ کا لطف دُور کر کے اگر کوئی اور چیز اس سے بہتر پیدا ہو سکے، تو کوئی حرج نہیں، ہم اسے گوارا کر سکتے ہیں، لیکن جب یہ مقصود بھی حاصل نہ ہو، تو پھر کیوں ؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض خیالات اس قدر بلند و دقیق ہوتے ہیں کہ ہماری عام بول چال میں اُن کے ظاہر کرنے کے لئے مناسب الفاظ میسر نہیں آتے خاص کر ایسی حالت میں جبکہ شاعرانہ قیود بھی اس کے ساتھ لگی ہوں لیکن غیر معمولی ذہین آدمیوں کے یہ خیالات اپنی زبان بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم الہام کہتے ہیں پھر چونکہ ذہانت کے بھی مدارج و مراتب ہیں، اس لئے معمولی ذہن کا انسان تو ان خیالات کیلئے الفاظ ہی نہیں پاتا اور کہہ دیتا ہے کہ "انسانی زبان ابھی بہت پیچھے ہے" دوسرا اس سے زیادہ ذہین شخص الفاظ تو پالیتا ہے لیکن اُن میں آہنگ و ترنم نہیں پیدا کر سکتا، اس لئے وہ انھیں ظاہر تو کر دیتا ہے لیکن اس کی یہ کوشش نظم معرا سے آگے نہیں بڑھتی، ایک تیسرا شخص جو واقعی (Genius) ہے وہ الفاظ بھی پالیتا ہے اور اسلوب بیان میں بھی ترنم و آہنگ قائم رکھ سکتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال میں، میں عہد حاضرہ کے کسی شاعر کو پیش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہو سکتا ہے، بلکہ اُس عہد کے شاعر کو

پیش کرنا چاہتا ہوں، جس کی نزاکت تخیل کو ساری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ اور وہ بیدل ہے۔

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تمام وہ شعراء جو نظم معرّیٰ کے حامی ہیں بلکہ وہ بھی جو غزل کے مخالف ہیں قطعاً بیدل سے بے خبر ہیں اور ان میں سے کسی ایک نے اس کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ وہ دیکھتے کہ ان کی نازک سی نازک تخیل سے بھی بیدل کی معمولی تخیل بہت بلند ہے اور ذہن انسانی کا کوئی امکانی لطیف ترین خیال ایسا نہیں ہے، جسے بیدل نے شاعری کی تمام رسمی قیود کے ساتھ نہ ادا کیا ہو اور ایسے حسن کے ساتھ کہ آورد و تصنع کی جھلک تک کہیں پیدا نہیں ہوتی۔

بہر حال اس وقت تک "نظم معرّیٰ" کی کوئی مثال میرے سامنے ایسی نہیں آئی جس کے خیالات کو قیود شعری کی پابندی کے ساتھ ظاہر نہ کیا جا سکے، اس لئے میں ایسی خارج از آہنگ شاعری کی ضرورت تسلیم کرنے سے معذور رہا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے "نظم معرّیٰ" کے ساتھ ساتھ "آزاد شاعری" کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اول اول تو میں سمجھا کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہوں گی لیکن اب معلوم ہوا کہ "آزاد شاعری" "نظم معرّیٰ" کے مقابلہ میں اتنی ہی آزاد ہے جتنی ردیف و قافیہ والی شاعری "نظم معرّیٰ" کے مقابلہ میں یعنی "نظم معرّیٰ" میں گو ردیف و قافیہ نہیں ہوتا لیکن وزن تو ہوتا ہے، اس کی کوئی مخصوص بحر تو ہوتی ہے لیکن "آزاد شاعری" ردیف قافیہ کے ساتھ وزن سے بھی بے نیاز ہوتی ہے یعنی دراصل وہ ہے تو نثر لیکن اس کے لکھنے والے ہم کو اس کے شعر سمجھنے پر بہ منت اس لئے مجبور کرتے

ہیں کہ اس کے فقرے مسلسل نہیں لکھے گئے بلکہ انھیں توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ سطر میں لکھا گیا ہے۔

"نظم معریٰ" کو "نظم مقفیٰ" پر ترجیح دینا، یقیناً عجز کی دلیل ہے اور "آزاد شاعری" تو خیر ایسی طفلانہ حرکت ہے، جس کا ذکر ہی فضول ہے وہ حضرات جو قدرت کی طرف سے ذہین و خوش فکر واقع ہوئے ہیں، اُن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے ہر خیال کو نظم ہی میں ظاہر کریں، کیا نثر میں وہ موثر طریقہ سے ادا نہیں کر سکتے اور کیا وہ اپنی نثر کو نظم کہنے سے کسی خاص نتیجہ کی توقع رکھ سکتے ہیں؟

"نظم معریٰ" ہمارے لئے اُس وقت بیشک ایک حد تک گوارا ہو سکتی ہے، جب ہم دیکھیں کہ اس کے خیالات واقعی حد درجہ لطیف و بلند ہیں کیونکہ اس صورت میں، اُن خیالات کی لذت ایسے آہنگ و ترنم کی طرف سے ہمارے خیال کو ہٹا دے گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم اسٹیج کے اُس دور کو کیوں بُرا کہیں جب ہر ہر بات شاعرانہ وزن و موسیقی میں ہوتی تھی۔ وہ اگر حقیقی شاعری نہ تھی تو اس میں کم از کم آہنگ و ترنم تو تھا، آزاد شاعری تو خیر سے کوئی ایک بات بھی نہیں رکھتی۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ تحریک "ترقی پسند ادیبوں" کی ہے، یا ان لوگوں کی جو "ترقی پسند ادب" کے پردہ میں اپنی نااہلیت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ بہر حال اس کا بانی کوئی بھی ہو، ہمارے لٹریچر کا دشمن ہے اور ملک کے نوجوانوں کو بہت سوچ سمجھ کر یہ رنگ اختیار کرنا چاہئے۔

یقیناً نئی دنیا اپنے ساتھ نیا ادب بھی لائے گی، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر اس میں کلاسکل شاعری کی گنجایش نہیں، تو اس لولی لنگڑی چیز

کی بھی اُسے ضرورت نہ ہوگی۔

اگر اب دنیا کی آرایش از سرِ نو صرف اُصولِ صنعت و اقتصاد پر ہونا ہے اگر روایاتِ اخلاق و تہذیب سے گزر کر صرف "روایاتِ مادی" ہی پر انسانی مستقبل کو سنورنا ہے، تو یقیناً ہماری کلاسکل شاعری کو بدل جانا ہے لیکن ان مشینوں کی حرکت میں جو خود بھی آہنگ و ترنم اور میکانکی وزن و بحر کی محتاج ہیں! نہ کہ آزاد شاعری کی صورت میں، جس کا ہر پیچ ٹیڑھا اور جسکی ہر چول ڈھیلی ہے!
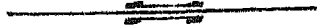
جدید شاعری پر ایک نظر

جناب صمد رضوی

شاعری کے جدید رجحانات پر اظہار خیال کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوعِ شاعری پر ایک مختصر سی بحث اور تبصرہ کر لیا جائے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور یہ اعتراض ادب کے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قدیم شاعری کی بنیادیں حسب ذیل عناصر پر قائم ہیں۔

(۱) گل و بلبل

(۲) ساقی و میخانہ

(۳) کعبہ و بتخانہ

(۴) شیخ، زاہد، واعظ اور ناصح

(۵) قاتل و مقتل

(۶) حسن و محبت

(۷) تصوف و مذہب

اب نئی قسم کی شاعری کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چند مخصوص عنوانات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے اہم ترین عنوانات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مزدور

(۲) کسان

(۳) مذہب و اخلاقیات کا مذاق اڑانا

(۴) روٹی، پیسہ، فقیر، کفن، بھوک

(۵) طوائف
(۶) شراب پرستی
(۷) حسن و محبت

جس طرح قدیم شاعری پر مخصوص عنوانات میں مقید ہو جانے کا الزام لگایا جاتا ہے، اسی طرح موجودہ شاعری پر بھی یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے جس طرح قدیم شاعری میں اکثر بنیادی عناصر "روایاتی درجے" پر آ گئے تھے بالکل اسی طرح نئی شاعری کے اکثر عنوانات "روایاتی" بن گئے ہیں جن کو اصلیت اور حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شاعری معاشی اور سیاسی آزادی اور مساوات کو قائم کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ انسانی آزادی کے راگ الاپتی ہے۔ اس کی آزادی کا تصور ہندوستان کے موجودہ مسلمہ اخلاقی تصورات کی روشنی میں، بیحیائی نفس پرستی اور بدتمیزی کا مفہوم رکھتا ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ میں قدیم شاعری کی تعریف اور نئی شاعری کی مذمت کر رہا ہوں؟ میرے مضمون کا مقصد یہ ہے کہ میں نفس شاعری سے بحث کروں۔ اور اس لحاظ سے جو کلام بھی "شاعری" کے معیار پر پورا اترتا ہو صرف اس کو شاعری کے نام سے منسوب کر دوں۔ خواہ وہ جدید کلام ہو یا قدیم خواہ وہ کسی کہنہ مشق استاد کا ہو یا کسی نو مشق شاعر کا۔ میں بہ حیثیت ایک ترقی پسند شہری کے، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، اخلاقیات، مذہب اور سائنس پر فنی اعتبار سے بحث کرنے اور ان میں باہمی ربط و ضبط پیدا کر کے ملک کی عام خوشحالی اور معیار زندگی کو بڑھانے کے جملہ اختیارات و امکانات کو محفوظ رکھ کر صرف ایک شاعر کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کے صرف تین ہی موضوع ہو سکتے ہیں۔

(۱) حیات
(۲) کائنات
(۳) اختراعی اور حسن کارانہ تخیل

تیسرے عنوان کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محض حسن کارانہ تخیل بجائے خود شاعری کا کوئی موضوع نہیں ہے وہ ہر شاعری کا حسن ہے۔ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی لیکن اختراعی تخیل شاعری کا ایک موضوع ہے۔ میں نے یہاں تینوں عنوانات بہ حیثیت ایک "کل" کے استعمال کئے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی اور کائنات کے ہر مظہر اور ہر نظر پر شاعری کی جا سکتی ہے مثلاً کیا حسب ذیل عنوانات شاعری کا موضوع قرار دئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں بدھ مذہب کے تنزل کے اسباب۔
۲۔ گیہوں کی پیداوار اور اس کے لئے فائدہ بخش کھاد اور زمین کا انتخاب
۳۔ ٹراونکور کے شمال و مغربی حصہ میں، انگور، اناس اور سنترے کی پیداوار کے امکانات۔
۴۔ نیوٹن کے کلیات۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت۔ کانٹ کا نظریۂ تنقید عمل۔
۵۔ جاپان کی تجارتِ خارجہ۔ چلی کے ساحل کی مدافعت۔ حیدرآباد کا ڈرینج سسٹم۔
۶۔ دردِ گردہ کا علاج۔ کاغذسازی۔ وائٹکس کے فوائد۔ گلبہار ہیر آئل کمپنی کا تیل۔

تو میرا جواب یہ ہوگا کہ مذکورۂ بالا جملہ عنوانات پر شاعری کی جا سکتی ہے غزل گو شعرا کو ان عنوانات کو سن کر تعجب ہوگا اگر یہ کہیں کہ یہ سب عنوانات غیر شاعرا

ہیں۔ ان کو قطعاً شاعری کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اور تمام علم دوست حضرات جو مذکورہ بالا عنوانات پر معلومات اور عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ میری اس بحث پر خندہ زن ہوں گے کہ کیوں کر ان عنوانات پر شعر کہے جا سکتے ہیں مگر نیا شاعر مختلف دلائل سے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ ان میں سے ہر موضوع پر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ اس کی بحث کی بنیاد "زندگی کی نئی قدروں"، "ماحول کے تقاضوں"، اور "وقت کی ضرورت" پر مبنی ہوگی۔ جس طرح اکثر قدیم مکتب خیال کے شاعروں نے بغیر جانے بوجھے خودی، بے خودی، من تو شدم تو من شدی اور دریا بہ حباب اندر، کے مضامین کا ناس مارا ہے اس طرح نئے شاعر نے بھی ابتدا میں بطور فیشن کے اور بعد میں ایک پیشہ کی حیثیت سے زندگی کی نئی قدروں ماحول کے تقاضوں، اور وقت کی ضرورت جیسے الفاظ کا استعمال اپنے لئے لازمی اور ضروری کر لیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک وہ ان الفاظ کا استعمال نہ کرے گا اس وقت تک یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اس نے ماضی سے قطع تعلق کر کے دور جدید میں داخل ہونے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ "زندگی کی نئی قدروں"، اور "ماحول کے تقاضوں" کی مٹی پلید ہو رہی ہے اور ہر نیا شاعر جس کو "ترقی پسند" کہلانا مقصود ہے، "زندگی کی نئی قدروں" کو اس طرح استعمال کر رہا ہے جس طرح کہ قدیم شعراء خودی و بیخودی کے مضامین باندھتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ نیا شاعر جو سیاسی اور معاشی آزادی اور مساوات قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ جو مزدوروں، کسانوں، مفلسوں، اور بھوکوں کو، انتہائی معاشی ترقی دینے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اور جو قدیم شاعروں پر عورت پرستی کا الزام لگا کر، اپنے آپ کو ان سے ممتاز اور بلند بتلانا چاہتا ہے۔ جو دور مشنری میں اور زندگی

کے بدلتے ہوئے تقاضوں میں تہذیب و تمدن کی قدیم اور فرسودہ عمارت کو مسمار کر دینے کا عزم بالجزم کر چکا ہے، جب خود شعر کہنے کے لئے بیٹھتا ہے تو قدیم شاعروں کی طرح "زلف گرہ گیر" کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ "ان شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو بجز چند مستثنیات کے اور وہ بھی خاص خاص صورتوں میں، اکثر و بیشتر شاعر "نجمہ" کے ساتھ چاندنی رات کا لطف اٹھاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا پھر "سلمیٰ" کو یہ سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ زندگی اور جوانی دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔

میں اس سے متفق ہوں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اور شاعر کی نظر اور تخیل کو صرف قدیم شاعری کے عناصر میں محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ زندگی کے دوسرے ہزاروں اور لاکھوں مسائل پر بھی اس کو نظر ڈالنی چاہئے۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ زندگی کے دیگر مسائل میں صرف ترقی پسندی کے اجزا ہی کیوں شریک سمجھے جائیں؟ کیا زندگی کے تمام فلسفیانہ، معاشی، سیاسی، اور سماجی مسائل کی وسعت سمٹ کر اور سکڑ کر، صرف انھیں اجزا میں آگئی ہے جو ترقی پسندی کے لئے لازمی ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ مسائل تو اور بھی ہیں لیکن ترقی پسند ادب نے جن مسائل کو اٹھایا ہے، انھیں کے حل میں انسانیت کی فلاح و بہبود مضمر ہے گویا کہ تاریخ انسانی کی ہزاروں معلوم اور نامعلوم صدیاں گذر جانے کے بعد اب ایک ایسی جماعت کا انکشاف ہوا ہے جو انسانی فلاح و بہبود کے مقدس فریضہ کو انجام دینے کے لئے زندگی کے ارتقائی دور میں نمودار ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس دعویٰ کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے علاوہ دنیا کے تمام سیاسی ادارہ جات، اور انجمنیں، انسانیت کو پستی اور تنزل کی طرف

بے جا رہی ہیں۔ ترقی پسند شاعری سے مراد، اشتراکی تصورِ حیات کا پرچار ہے اس سے ہٹ کر اگر کوئی شاعر کچھ لکھتا ہے تو وہ نہ ترقی پسند کہلا یا جا سکتا ہے اور نہ اس کے خیال و فکر سے دنیا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ گویا ترقی پسندی کے جذبے کا لب لباب یہ ہوا کہ اگر تم اشتراکی زندگی کے حامی ہو اور اس کا پرچار کرنا تم نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے تو تم ترقی پسند ہو ورنہ تم کو ترقی پسندی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترقی پسندی کا معیار کیا ہے؟ جو ہم نے مقرر کر دیا ہے وہی معیار ہے۔ اس شاعری کا مقصد اور منتہا کیا ہے؟ عوام کو اشتراکیت کی تعلیم دینا۔ ان کے سامنے اپنے مکتبِ سیاست کو پیش کرنا، سیاسی جدوجہد کر کے قوت واقتدار حاصل کرنا۔ اور بالاصرار اشتراکی ریاست قائم کرنا۔

ترقی پسند شاعر چاہے اپنی زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کی شاعری کا مقصد نہ زبان و ادب کی خدمت کرنا ہے اور نہ ہندوستانی زندگی کی ترجمانی کرنا۔ بلکہ وہ اپنی دانست میں اشتراکیت کو بہترین سیاسی مسلک سمجھتے ہوئے اس کی اشاعت میں اپنا وقت اور سر کھپا رہا ہے۔ اور ایک ایسا نظامِ حیات ہندوستانیوں کے سر منڈھنا چاہتا ہے جو نہ ہندوستان کے پیچیدہ مفادات کی حفاظت و ترقی میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہندوستان کے تاریخی، معاشی، اور تمدنی حالات میں اس نظام کے قائم کرنے کے کوئی امکانات موجود ہیں میرے خیال میں یہ ایک ایسی ہی کوشش ہوگی جس طرح کہ اسپین کے باشندے اپنی تاریخ، قومی روایات، اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو فراموش کر کے چینی زندگی کے تصورات کو اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کریں، نتیجہ ظاہر ہے۔ اس طرح ترقی پسند شعراء کا مسئلہ دراصل ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے

جو معاشی آزادی اور سیاسی مساوات کا ڈھونگ رچا کر، نئے سانچوں اور نئے تقاضوں کا نقاب ڈال کر، ماحول اور وقت کی پکار کے عنوان سے، اپنی سیاسی تنظیم کو آگے بڑھانے کی خاطر شاعری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر دوسری سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے اس کے "اندازِ قد" کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ اس جماعت کے اثر، نفوذ، اور وسائل سے بھی بخوبی واقف ہیں لیکن وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نہ تو شاعری کی مٹی پلید کرتے ہیں اور نہ زبان میں اونٹ پٹانگ جدت طرازیاں کر کے اس کو برباد کرنا چاہتے ہیں یہ بالکل ہی جداگانہ سوال ہے کہ آیا ان کو اس جماعت کی تقلید کرنی چاہئے یا نہیں۔ اس طرح یہ نام نہاد ترقی پسند شعراء کی مٹھی بھر جماعت جو بیک وقت اپنے آپ کو شاعر، فلسفی، سائنسداں اور دنیا کے تمام دیگر علوم و فنون کا ماہر سمجھتی ہے اُردو زبان کو بطور ایک "زینۂ اولیں" کے استعمال کر رہی ہے، زبان کی ترقی اور سدھار سے نہ اسے کوئی دلچسپی ہے اور نہ یہ اس کے سیاسی پروگرام میں شامل ہے۔ اس کے ادب کا بیشتر حصہ صرف "پروپیگنڈہ لٹریچر" ہے اور اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس جماعت کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کے حق میں یہ جماعت "نادان دوست" کا کام کر رہی ہے۔

سیاسیات و معاشیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر سیاسی جماعت معاشی تنظیم کو اپنے پروگرام کا اہم جزو قرار دیتی ہے۔ اور اپنی افادیت اور ترقی پسندی کی صلاحیت کو منوانے کے لئے ہزارہا دلائل پیش کرتی ہے۔ ان سیاسی مکاتیبِ خیال کا تو ذکر ہی کیا جو بین الاقوامی حیثیت سے ہر ملک کی سیاست کو متاثر کر رہے ہیں، ہندوستان ہی کی سیاسی گتھی کو لے لیجئے، مسلم لیگ

کے نقطۂ نظر سے بجز پاکستان کے ہندوستانی سیاست کا کوئی دوسرا بہترین سیاسی حل نہیں ہے۔ کانگریس پریس اور پلیٹ فارم نے اپنی پوری قوت سے اس دعویٰ کی تردید کی ہے۔ ہندو مہا سبھا نے کانگریس کے مطالبۂ آزادی اور قومیت کے تصور پر ہزاروں اعتراضات کئے ہیں اور کر رہی ہے۔ غرض کہ سیاسی اداروں میں اغراض و مقاصد کے تحت نوک جھونک ہونا ایک فطری اور ناگزیر امر ہے۔ جمہوریت نے اشتراکیت پر اور نازیت نے جمہوریت پر کیا مختلف علمی، عملی اور فنی اعتراضات نہیں کئے۔ اور کیا یہ تمام گتھیاں سلجھا دی گئی ہیں کیا دنیا کی پوری آبادی اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ صرف کسی ایک مکتبِ خیال پر سب متفق ہو جائیں؟ اگر ترقی پسند شاعر جو مسلمہ طور پر اشتراکیت کا ایجنٹ ہے اپنے مسلک اور پالیسی کو واضح کر کے اپنے ہی حدود میں رہ کر کام کرے تو اس سے صرف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہی تعارض کریں گے۔ ادب اور زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر ہیں۔ مگر وہ اپنے چہرہ پر ادب اور زبان کا نقاب ڈال کر آتا ہے اس لئے اس سے بہ حیثیت ایک شاعر کے نہیں بلکہ سیاست کے طالب علم کی حیثیت سے یہ درخواست ہے کہ وہ دنیا کے جملہ سیاسی لیڈروں کی ایک گول میز کانفرنس طلب کرے اور ہمیشہ کے لئے اس کا تصفیہ کرائے کہ سوائے اشتراکیت کے اور کوئی سیاسی مسلک عموماً دنیا کی اور خصوصاً ہندوستان کی خوش حالی اور نجات کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اور اس کے بعد اپنے اغراض و مقاصد کی ایک فہرست مرتب کر کے شاعروں میں تقسیم کر دے۔ کہ آئندہ سے سوائے عنوانات مندرجۂ فہرست کے کسی اور موضوع اور عنوان پر شاعری نہ کی جائے۔ ہندوستانی عوام نہ تو

بیوقوفوں کی جنت میں رہتے ہیں اور نہ شیخ چلّی کی طرح ایک رنگین مگر ناممکن الحصول مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت اچھی طرح جانتی ہے کہ جب اشتراکی خیالات کا پرچار کرنے والا شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ زبان کی خدمت اور اس میں اضافہ کر رہا ہے یا نئے رجحانات اور خیالات کی وسعت پذیری کے مدنظر نئے سانچے ڈھال رہا ہے، تو سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اور کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔

بہرحال ان تمام سیاسی مباحث کو چھوڑتے ہوئے جو اشتراکی شاعری کے ضمن میں لازماً پیدا ہوتے ہیں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ شاعری کے لئے کسی خاص موضوع کا متعین کر دینا ناممکن ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ ایک مہمل اور ناقابلِ عمل حد بندی ہوگی۔ میتھو آرنلڈ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "اس قسم کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جسے شاعرانہ موضوع کہا جا سکے۔" ایف۔ ڈبلیو فیلکین نے "شاعر کا فن" میں موضوع شاعری پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ارسطو کے نزدیک شاعری کا موضوع انسان کی زندگی ہے اسکے قلبی واردات، نفسیاتی محرکات اور اس کے افعال۔

شاعری کا موضوع حیات ہے۔ اور ہر شاعر اپنے ذوق، وجدان، اور ذہنی کیفیات کے لحاظ سے "حیات" میں سے چند عنوانات کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیتا ہے۔ "حیات" میں سے کن اجزاء کو شاعری کیلئے منتخب کرنا چاہئے۔ اس پر نوویل سی اسمتھ نے اپنی کتاب ورڈسورتھ کی ادبی تنقید میں بہت ہی معقول رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "شاعری کی ایک شاندار خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مواد ہر اس موضوع سے فراہم ہو جاتا ہے جس سے انسان کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔" اسی طرح آرنلڈ نے "۱۸۵۳ء کی نظموں کے

دیباچے، میں بیان کیا ہے کہ "شاعری کے ابدی موضوعات افعال ہیں۔ اور
وہ خارجی افعال جو انسان کے بنیادی جذبات کو شدت سے متحرک کرتے ہیں"
مذکورہ بالا آراء پیش کرنے سے یہ واضح کرنا تھا کہ شاعری کا کوئی خاص
موضوع نہیں ہے۔ شاعر زندگی کے ہر مظہر اور کائنات کے ہر منظر پر شعر
کہہ سکتا ہے۔ لیکن شاعری خواہ کسی موضوع پر کی جائے اس میں انسان کی
دلچسپی کے بنیادی اجزاء کا پایا جانا ضروری اور لازمی ہے۔ عبدالقیوم صاحب
باقی کا یہ خیال بہت ہی معنی خیز ہے کہ شاعری "غربال حیات" ہے۔ اس میں
اس کی گنجائش نہیں ہے کہ کچرا کورا۔ غلاظت اور گندگی تعفن اور سڑاہند
کو شامل کر دیا جائے۔ اور اگر بفرض محال شاعر اپنے مشاہدات اور تجربات
کے سلسلہ میں ان چیزوں کو بھی نظم کا جامہ پہنانا چاہے تو اس کا خیال رکھنا
ضروری ہے کہ اس کی نظم "مس میو" کی کتاب یعنی ڈرینج آفیسر کی رپورٹ
نہ ہو جائے۔ شاعری میں جو چیز آ سکتی ہے وہ صرف زندگی، کائنات اور
تخیل کا نچوڑ اسپرٹ اور ست ہے۔ ٹینی سن کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ
"شاعری کو اگر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے تو شاعری کو انسانی زندگی کا
"پھل اور پھول" ہونا چاہیے۔" مثلاً امونیا گیس کی تیاری ایک صنعتی مسئلہ ہے
اس کو شاعری کا موضوع بنانا نری حماقت ہے اور یہ ظاہر کرنے کی ضرورت
نہیں کہ جو شاعر صاحب "امونیا گیس کی تیاری" پر فکر فرمائیں گے وہ کس حد
تک اس میں شعریت پیدا کر سکیں گے۔ اور کس حد تک علم کیمیا کے واقف کار ان
کو مطمئن کر سکیں گے۔ لیکن امونیا گیس سے شعلے کی دلفریبی، اور دلکشی شاعری
کا موضوع ہو سکتی ہے۔ گلاب کے پودوں کا لگانا اور ان میں مناسب اور
مفید کھاد کے ذریعے خوش رنگ اور خوشنما پھولوں کا پیدا کرنا، فن زراعت

سے متعلق ہے لیکن گلاب کا جمالیاتی مطالعہ شاعری کا موضوع ہو سکتا ہے۔
ہندوستانی کسان اور مزدور کے اعداد و شمار فراہم کرنا، ان کی اوسط آمدنی
اور اخراجات میں تطابق پیدا کرنا، محنت اور سرمایہ میں باہمی توازن پیدا
کرکے ان کو منظم طریقہ پر ترتیب دینا، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام
کرنا، یہ سب معاشی مسائل ہیں لیکن ان کے نفسیاتی حالات، ذہنی زندگی
اور جذباتی کش مکش کا مطالعہ شاعری کا موضوع بن سکتا ہے۔ اسی طرح محبت
کی کیفیات کے اظہار میں (خواہ وہ محبت افلاطونی نظریہ پر مبنی ہو یا فرائڈ کے
نظریہ پر خواہ وہ کوئی خالص حیوانی اور کاروباری حیثیت رکھتی ہو یا روحانی
و وجدانی) سماجی رکاوٹوں کا دکھڑا، اپنے یا محبوب کے معاشی حالات کا رونا،
خاندانی خصوصیتوں کا تذکرہ، محبوب کے اور اپنے معاشرتی درجات کے تفاوت
کا اظہار، محبوب کو حاصل کرنے کے لیے اپنی اور اپنے دوست و احباب و عزیز
و اقارب کی کوششوں اور اس کے مختلف مراحل و مدارج کا بیان نہ صرف
غیر ضروری، غیر دلچسپ اور تضیع اوقات کا باعث ہے بلکہ اجتماعی مسائل
حیات میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ البتہ محبت میں قلب و ذہن پر
گذرنے والے جذبات و خیالات کی کش مکش اور اس کے نچوڑ کو شعری گرفت
میں لے لیا جائے تو اس سے متاثر ہونے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے مثلاً یہ شعر
مذکورہ بالا دعوی کی ایک کامیاب مثال ہے ؎

یہ میری شوخیٔ قسمت کہ تم کو پا نہ سکا
غرورِ عشق امارت کے بت کو ڈھا نہ سکا
(جمیل فاروقی)

جگر کے یہ دو اشعار جنسی زندگی کی خاص کیفیات اور واردات پر
مبنی ہیں۔

کچھ نہ کہا اور بس۔ یونہی چل دئے　　کچھ نہ سُنا اور خفا ہو گئے

یا

جیسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

یا غالب کا یہ شعر ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

میں ان رنگین فسانوں کی جو ان اشعار کی اسپرٹ میں پائے جاتے ہیں تشریح و توضیح کر کے ان کی لطافت اور نزاکت کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ ان اشعار کو سمجھنے کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔ ان کے معنی سمجھنے سے زیادہ محسوس کئے جاتے ہیں۔ یہ خاص ذہنی کیفیتوں اور قلبی واردات کا نچوڑ ہیں۔ یہ جذبات انسانی ہیں۔ خواہ کوئی شخص مزدور ہو یا کسان، سرمایہ دار ہو یا غریب، جو بھی ان حالات سے گذرا ہو، وہ ان جذبات کو ضرور محسوس کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ اتنی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ نہ کرتا ہو اور نہ کر سکتا ہو ان کے اظہار پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اب اگر جگر سے یا غالب سے ان اشعار کے "محرکات" کو دریافت کیا جائے تو وہ ایک طویل فہرست ایسے واقعات کی پیش کر دیں گے جو ایک کامیاب ڈرامے، دلچسپ افسانے، اور دلکش ناول کے لئے مفید مواد کا کام دے سکتی ہے لیکن شاعری میں اس فہرست کا کوئی قیام نہیں۔ اس لئے کہ شاعری خواہ کسی موضوع پر کی جائے اس موضوع کا نچوڑ ہونا چاہئے نہ کہ خود موضوع۔ اس کی کامیاب مثالیں "جوش" کے "کسان" "ناسزا جوانی" اور "انگیٹھی" میں پائی جاتی ہیں شوق قدوائی کا "آئینہ خیال" بھی ہندوستانی ازدواجی زندگی کی ایک بہترین مثال ہے

مخدوم کا "پرسہ" اور نظر کی "وداع" بھی زندگی کا نچوڑ ہیں۔ ہیں جس چیز کو شالیں
دے کر زندگی کے نچوڑ اور اسپرٹ سے تعبیر کر رہا ہوں اس کو شاعری کا موضوع
بنانا، قابلیت، محنت، عملی تجربے، اور دماغ و قلب کی ایک خاص متوازن
کیفیت کا کام ہے۔ قدیم شعراء نے اس کو شاعرانہ انداز میں "حاصلِ زیست"
کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

نیا شاعر خواہ دانستہ یا نادانستہ ان تمام نزاکتوں اور باریکیوں میں
نہیں جاتا اس لیے کہ زندگی کے گوناگوں مسائل کی کثرت اور وقت کی قلت
کے باعث وہ ان کو ترک کر دینے پر مجبور ہے۔ وہ عوامی خیالات کا پرچار
کرنے والا شاعر ہے۔ عوامی خیالات اور زندگی کی ترجمانی سے کیا مراد ہے
اشتراکیت کی اشاعت کس قدر دلچسپ منطقی استدلال ہے۔ اسکے استدلال
کی صداقت کا تجزیہ کرنے کے لئے کسی شاعر یا آرٹسٹ کی ضرورت نہیں بلکہ
ہر سنجیدہ اور متمدن شہری کر سکتا ہے۔ میں عوامی خیالات اور زندگی کی ترجمانی
کے متعلق اب تک اجمالی طور پر کچھ بیان کر چکا ہوں، کسی قدر وضاحت اور
تفصیل کے ساتھ پھر اسی موضوع پر بحث کروں گا۔ یہاں اس قدر ذہن نشین
کر لینا ضروری ہے کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے اشتراکی شاعری ہندوستان میں
نام کو نہ تھی اور اگر تھی بھی تو برائے نام جس کا نہ کوئی اثر تھا اور نہ وزن
لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جیسے ہی روس اور برطانیہ متحد ہو گئے، اشتراکی
بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔ اور برطانیہ نے اپنے اغراض و مقاصد کی پیش
رفت میں ان کی باگیں کسی قدر ڈھیلی کر دیں جنگ کیا صورت اختیار کرے گی
انگریز اور روس کی دوستی ایک دوسرے کے ساتھ خلوص و ہمدردی پر مبنی ہے
یا مجبوری اور جنگی حکمتِ عملی پر۔ دیرپا ہے یا جنگ کے زمانہ میں قائم رہے گی۔

برطانوی شہنشاہیت کا روس کی امداد کرنا خود اس کے اپنے سیاسی مفاد کیلئے ضروری ہے یا اشتراکیت کے قیام کے لئے کمیونسٹ کیوں اتحادیوں کو عملی امداد دینے اور تعاون کرنے پر آمادہ ہیں اور سوشلسٹ صرف ہمدردی کیوں رکھتے ہیں۔ جنگ کے بعد برطانوی شہنشاہیت، امریکن سرمایہ داری اور اشتراکیت میں سے کون، کہاں غالب رہے گا۔ اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہوں گے یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات ہیں جو سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان پر میں بہ حیثیت ایک شاعر کے سوچنے کی نہ ضرورت سمجھتا ہوں اور نہ یہ میرے مضمون سے براہ راست متعلق ہیں۔

نئی شاعری کا مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے سے پہلے چند اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اولاً پڑھنے والے کے ذہن میں وہ تمام بلند بانگ دعوے ہونے چاہئیں جو اس شاعری کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں مثلاً معاشی اور سیاسی مساوات کی اشاعت، سرمایہ داری کو نیست و نابود کردینے کی خواہش۔ مزدوروں اور کسانوں کو نظام سرمایہ داری کے مظالم سے رہائی دلانے کی کوشش، انقلاب آفرینی، ایک بہتر، مستحکم اور پر مسرت معاشرہ کی تخلیق وغیرہ۔ اور نئی شاعری میں ان کو تلاش کرنا چاہئے تم کہ کیا واقعی یہ تمام چیزیں اس میں موجود ہیں یا محض باتیں بنانے کی حد تک ہی ان اصولوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ شاعری کی بنیادی خصوصیات بھی اس شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ یا یہ محض ایک "تک بندی" اور "دماغی بحران" ہے۔

مخمور جالندھری اپنی ایک نظم "اشتباہ" میں فرماتے ہیں کہ ؎

ہاتھ میں اُجلا تولیہ لے کر جب میں نہانے جاتا ہوں
صابن، کنگھا بھی، تیل، وہاں پہلے ہی سے رکھے ہوتے ہیں۔

سب سے اچھا لباس بھی اک کھونٹی پہ ٹنگا ملتا ہے مجھے
بوٹ کے فیتے کسنے نہیں پاتا ہوں ابھی میں اچھی طرح
مکھن، توس، پیالی چائے کی میز پہ رکھ دی جاتی ہے
میرے کپ میں اوروں کی نسبت دودھ زیادہ ہوتا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ان اشعار میں کس قدر بے ساختہ پن اور سادگی پائی جاتی ہے۔ شاعر نے خلوص اظہار کا حق پورا ادا کر دیا ہے۔ یہ روزمرہ زندگی کی باتیں ہیں، جن پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ واقعی دنیائے ادب کو مخمور صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ صاحب موصوف نے بڑی تحقیق و تلاش کے بعد اُردو ادب کو ایسے خیالات سے روشناس کر دیا ہے جس کو اُردو کے شاعروں نے اب تک نظر انداز کر دیا تھا لیکن کیا یہی انقلابی شاعری ہے؟ کیا اسی شاعری سے زندگی کی نئی قدروں اور ماحول کے تقاضوں کی ترجمانی ہوتی ہے؟ کیا "دندان تو جملہ در دہاں اند" زندگی کی شاعرانہ ترجمانی کرنے کے لئے کافی ہے۔

ن۔م راشد اپنی ایک نظم "خودکشی" میں فرماتے ہیں کہ ؎

کر چکا ہوں آج عزم آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

دو تین مصرعوں کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں!
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج

آج میں نے زندگی کو پالیا ہے بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تخت خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ درخشاں لہو

پھر چند مصرعوں کے بعد بیان فرماتے ہیں کہ ؎

جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئی بام کو

نظم میں عام طور پہ ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور جیسے جیسے نظم بڑھتی جاتی ہے اس کا مرکزی خیال بھی زیادہ واضح اور روشن ہوتا جاتا ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ابتدائی اشعار سے ذہن میں ایک خاکہ مرتب ہوتا ہے اور پھر ہر آگے کا شعر نظم کے تدریجی ارتقاء کو نمایاں کرتا جاتا ہے۔ لیکن اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اگر واقعی اس کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو آخری اشعار سے ابتدا کی جائے اور ابتدائی اشعار پہ نظم کو ختم کیا جائے اس طریقہ سے مشکل سے تھوڑے بہت معنی سمجھ میں آسکتے ہیں ورنہ لاکھ کوشش کر لیجیے کیا ممکن جو کچھ بھی مطلب نکل سکے۔ میری سمجھ میں جہاں کہیں اس نظم کا مطلب سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر ایک ہرزہ کار و عشوہ ساز محبوبہ کے پاس ایک زمانۂ دراز سے آتا جاتا ہے جو ایک عمارت کی ساتویں منزل پر رہتی ہے۔ اور اس کے کمرے کی کھڑکی ایک کوٹھے بام کی طرف کھلتی ہے۔ شاعر نے اس کے تخت خوا

کے نیچے تازہ درخشاں لہو دیکھ پایا ہے جس کو دیکھ کر وہ اس محبوبہ سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے مواقع حاصل نہیں یا اتنی جرأت نہیں کہ وہ اس محبوبہ کو ہلاک کر دے۔ اس لئے قہر درویش بر جانِ درویش ناچار غریب خود ہی اس کھڑکی میں سے جست لگا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لینا چاہتا ہے اور اس کا وہ عزم کر چکا ہے۔" گرد دیوار کو نوکِ زباں سے چاٹنا اور اس کا صبح تک دوبارہ بلند ہو جانا، لہو کا پایا جانا، یہ سب ایسے معمے ہیں، جو انسانی عقل و ادراک سے بالاتر ہیں۔ یا پھر زندگی کے وہ تقاضے ہیں، جو انقلاب کے طوفان کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ن۔ م راشد صاحب کھلم کھلا ان کا اظہار اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ برطانوی سیاست اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی وہ مایۂ ناز شاعری ہے جو ترقی پسندی کے کیمپ سے روزانہ نکلتی رہتی ہے۔ جو مزدور اور کسان، انسان اور مشتری، محنت و سرمایہ کے مسائل کا حل تلاش کر رہی ہے۔

ایک دوسری نظم "انتقام" میں راشد صاحب فرماتے ہیں کہ؎

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اس نظم کے ابتدائی حصہ میں شاعر نے ایک مغربی طرز پر سجے ہوئے کمرہ کا ذکر کیا ہے، جس میں جا بجا دھات اور پتھر کے بت رکھے ہوئے تھے اور آتشدان کے قریب ایک برہنہ جسم ان کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

دوسرا حصہ وہ ہے جس کو میں اوپر درج کر چکا ہوں۔ اور جو "حکایتِ آغوش" بیان کر رہا ہے۔ نظم کی ترتیب اور "اربابِ وطن کی بے بسی" کا انتقام لینے سے صاف واضح ہے کہ وہ اجنبی عورت کس قومیت سے تعلق رکھتی تھی۔ راشد صاحب کے ہونٹوں نے اجنبی عورت کے جسم سے رات بھر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیا ہے، اور وہ اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ برطانوی سامراج سے ایسا انتقام لیا گیا ہے کہ پوری ہندوستانی قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کس قدر معصوم خیال ہے اور کس درجہ طفلانہ جذبہ ہے۔ یہ شاید زندگی کی نئی اقدار میں سے کوئی ایک قدر ہے۔ راشد صاحب کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی یہ رائے بہت خوب ہے کہ "ان کی بعض نظمیں سپاٹ ہو کر رہ گئی ہیں" کاش ان کی نظمیں اتنی سلجھی ہوئی اور بامعنی ہوتیں جتنا کہ "نقش فریادی" پر ان کا مقدمہ۔ فیض احمد اس گروہ میں.................. ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کا خیال آزاد اور فکر اوروں کے مقابلہ میں سلجھی ہوئی ہے۔ اُن کا ایک خاص اسٹائل ہے اور یہ اپنے رنگ میں خوب کہتے ہیں انکے کلام میں وہ سب کچھ نہیں جو ترقی پسندی کے لئے لازمی اور ضروری ہے "خدا وہ وقت نہ لائے" اور "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" ان کی اندازِ فکر کے بہترین نمونے ہیں۔

آزاد نظم اور نئی شاعری کے شہ پارے میراجی کے پاس بکثرت دستیاب ہوتے ہیں "سنگِ آستاں" اور "محرومی" ان کی بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ مگر جس قدر زیادہ ان کے معنی و مطالب پر غور کیا جاتا ہے اسی قدر مبہم اور ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ فانی نے تو زندگی کو "دیوانے کا خواب" سے تعبیر کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میراجی کی شاعری پر اس کا

اطلاق بڑی خوبی کے ساتھ ہوتا ہے۔

"سنگِ آستاں" میں میراجی فرماتے ہیں کہ ؎

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محمل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

غور کا مقام ہے کہ "سنگِ آستاں" کو اس پنچھی سے کیا نسبت جس کو میراجی دھرتی کے جنگل میں پکڑنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تاثیر، جوش، سوز، صداقت اور دیگر خصوصیات شعری کا تو ذکر ہی کیا میں دریافت کرتا ہوں کہ اس کے کوئی معنی بھی ہیں۔ کیا یہی زندگی کی ترجمانی ہے۔ کیا یہی وہ شاعری ہے جو زندگی سے بہت قریب آگئی ہے کیا یہی وہ نئے خیالات، میلانات اور جذبات ہیں جن پر اُردو کے دوسرے شاعروں نے اب تک کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اُردو ادب میں یہ بہکی ہوئی فکر کا طرز یقیناً نیا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک احمقانہ ریکارڈ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیا ایسی ہی نظموں سے سامراج کو تباہ کیا جائے گا۔ کیا یہی وہ اشعار ہیں جو ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں بھوکوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کیا ایسے ہی اونٹ پٹانگ الفاظ کی بھرمار سے ہندوستان کے معاشی اور سیاسی مسائل کا حل دریافت کیا جاسکتا ہے۔ قدیم شعراء نے تو ساقی و میخانہ، اور گل و بلبل وغیرہ کو اشارۃً استعمال کیا تھا۔ اور اکثر و بیشتر ان الفاظ کے استعمال سے ان کا مقصد کچھ اور

ہوتا تھا۔ لیکن جدید شاعری کے کیمپ سے ایسا کوئی اعلانیہ جاری نہیں کیا گیا
جس میں یہ بتلایا گیا ہو کہ فلاں فلاں الفاظ کے یہ یا وہ معنی لئے جائیں نتیجہ یہ ہے
کہ جس طرح میراجی دھرتی کے جنگل میں پریشان حال پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں
اسی طرح جدید شاعری کا مطالعہ کرنے والے بھی الفاظ کے گورکھ دھندے میں
کھو جاتے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کی ایک آزاد نظم "اجنبی عورت" بھی پڑھنے سے
تعلق رکھتی ہے۔ سمجھنے سے نہیں۔ نئی شاعری کا وہ حصہ جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا
ایسے دقیق فلسفیانہ مسائل۔ یا گہرے نفسیاتی اور علمی نظریات پر مبنی ہے جس کو
سمجھنے کے لئے ایک خاص حد تک تعلیم یافتہ ذہن کی ضرورت لاحق ہو۔ بلکہ
وہ سرے سے مہمل اور بے معنی ہے۔ ترقی پسند شعراء اگر "پارٹی سیاست" کے
تحت کھینچ تان کر اس کے کوئی معنی نکال بھی لیں تو وہ ایسی ہی کوشش ہوگی
جیسے کہ "شمازِ عاشقاں بر شاخِ آہو" کے معنی نکالنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔

وہ شاعر جو اپنے دماغ پر کوئی بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ الفاظ اور عنوان
کے انتخاب میں وقت خراب کرنا نہیں چاہتا، شاعری کی بنیادی خصوصیات
کو شعر میں نمایاں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے لئے نئی شاعری
اپنے اندر بڑی کشش اور ترغیب رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی شاعری
چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے لیٹتے، ہنستے بولتے، غرض کہ ہر وقت کی جا سکتی
ہے۔ رہا یہ اندیشہ کہ اس خرافات کو کون شائع کرے گا۔ اس کا ایسا کوئی
وجود نہیں اس لئے کہ اردو زبان کے رسالے ہاتھوں ہاتھ ایسی شاعری
کو لے لیتے ہیں۔ اور شائع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی
کا ہر تیسرا آدمی انقلابی شاعر بن گیا ہے۔ اور اگر اس کی رفتار کا یہی عالم
رہا تو وہ دن دور نہیں جبکہ پوری ہندوستانی قوم انقلابی شاعروں کی

قوم میں تبدیل ہو جائے گی اور پھر سامراج کی تباہی اور ہندوستان کی آزادی
منٹوں میں حاصل کی جا سکے گی!

میں نے اوپر کہیں بیان کیا ہے کہ نئی شاعری کو زیادہ سے زیادہ اشتراکی
شاعری کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ روسی ادب میں ایسی شاعری
کا کوئی وجود نہیں ہے۔ چونکہ ترقی پسند شعرا سیاسی حیثیت سے اشتراکیت
کے حامی ہیں اور اسی مسلک کے پرچار کو انھوں نے اپنی شاعری کا مقصد
قرار دے لیا ہے اسی لئے میں نے ان کی شاعری کو اشتراکی شاعری سے
موسوم کیا ہے۔ بلکہ صحیح طریقہ پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "یہ خود ساختہ اشتراکی
شاعری" ہے۔ نہ اس میں شعریت ہے اور نہ ہندوستانیت۔ نہ یہ شاعری
زندگی کی ترجمانی کرتی ہے اور نہ زندگی سے قریب ہے۔ بلکہ یہ فکری انتشار
کا لازمی اور ضروری نتیجہ ہے۔ جس طرح مجذوب کی بڑ اور دیوانے کی
بکواس میں کچھ کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی طرح اس شاعری میں
بھی کہیں کہیں حقیقت اور شعریت کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ شاعری خواہ
انفرادی ہو یا اجتماعی۔ داخلی ہو یا خارجی اس میں شعریت ضرور ہونی چاہئے
لیکن مذکورہ بالا قسم کی شاعری میں، ایک معتد بہ حصہ ایسے خیالات و جذبات
پر مشتمل نظر آتا ہے جس میں شعریت تو کجا، معنی و مفہوم بھی نہیں پائے جاتے
اس شاعری کے متعلق خود میراجی کی رائے بہت صحیح ہے جو انھوں نے
۷ر جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کی "آواز" میں اپنے ایک مضمون "نئی شاعری کی بنیادیں"
میں ظاہر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"نیا شاعر ایک ایسے چوک میں کھڑا ہے جس کے دائیں بائیں آگے
پیچھے کئی راستے نکلتے ہیں لیکن اسے پوری طرح نہیں معلوم ہے کہ کونسا راستہ

اس نے طے کیا ہے۔ ماضی کی تجربے کیا اہمیت رکھتے ہیں کب تک۔ اسے یونہی کھڑے رہنا ہے۔ حال کی اضطراری کیفیات کب تک اس کا ساتھ دیں گی۔ اور کون سے راستہ پر اس کو چلنا ہے۔ مستقبل کے خطرات اس کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نیا شاعر ماحول میں اپنی گہری دلچسپی کا بہانہ کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ صرف اپنی ذات کے ایک دھندلے سے عکس ہی میں محو ہے۔" (جامعہ دہلی)

کچھ نئے ادب کے متعلق

(جناب کلب مصطفٰے صاحب ایڈوکیٹ)

ایک مخصوص اشتراکی حلقے کی طرف سے نئے ادب کے نام سے جن عریاں تصوّرات و مبہم تخیلات کی پیشکش اور لفظوں نیز محاوروں کی جو تراش خراش کی جارہی ہے اس کا مقصد خواہ جو بھی ہو لیکن اس کا موجب غالبًا وہ اقتصادی اور سیاسی نظام ہے جس نے ہندوستان کو مخصوص طور پر سرمایہ داری کے شکنجہ میں کس رکھا ہے اور جس کے نتیجہ میں آج نہیں صدیوں سے ہندوستان کی ایک وسیع آبادی ایسی ہو گئی ہے کہ نہ تو اُسے پیٹ بھر کھانے کو ملتا ہے اور نہ تن ڈھاکنے کو پورا کپڑا۔ چنانچہ روس میں اشتراکی نظام کی فی الجملہ کامیابی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں ویسی ہی اشتراکی جماعت کے قیام میں مدد دی بلکہ دبی ہوئی آگ کو ہوا دیکر پوشیدہ جذبات بغاوت کو اُبھارا بھی لیکن چونکہ ہندی سامراجی نظام کو کلیتًا بدل کر اشتراکی نظام کی طرح ڈالنا خود ہندوستانیوں میں نظم و شعور کی کمی کی وجہ سے پڑھے لکھے اشتراکیوں کی تمام کوششوں کے باوجود جلد ممکن نہ تھا اس لئے ہمارے پڑھے لکھے نوجوانوں نے موجودہ صورت حال کو بدلنے، مزدوروں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے اور اشتراکی نقطۂ نظر کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کا ایک نوکھا انداز اختیار کر لیا یعنی انھوں نے ہر اُس چیز سے عمدًا انھیں قطعًا تحت الشعوری انداز میں خوامخواہ کی نفرت پیدا کرا لی جسے سرمایہ داری سے ذرا سا بھی لگاؤ ہوا!! اور چونکہ اردو زبان عہد سرمایہ داری ہی کی زبان ہے اس لئے باوجود اس کے کہ اب اُسے زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے اور اس کے قواعد اور لغت مرتب ہو چکے ہیں ہمارے نوجوان اُردو زبان کی علی الرغم ایک نئی بولی اور اردو شاعری کے مقابلہ میں ایک عجوبہ شاعری کی داغ بیل ڈال کر گویا سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بغاوت

کر رہے ہیں۔ نہ معلوم روسیوں کی زبان پر بھی روس میں اشتراکی نظام قائم ہونے سے قبل کسی قسم کا کوئی ایسا ہی اثر مرتب ہوا یا نہیں کہ سرمایہ داری شکنجے میں کسے ہونے کے اعتبار سے موجودہ ہندوستان اور سابقہ روس میں کافی ؟ مماثلت ہے یا ہم ہندوستانیوں نے ہی جذبات پرستی کی بنا پر ہندر کی بلا طویلے کے سر ڈال کر اُردو زبان اور اردو شاعری کی کانٹ چھانٹ کی بیخ کنی کا مترادف سمجھ لیا ہے ——————— اور چونکہ یہاں کی معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے جنسیات کے سلسلہ میں ہمارے نوجوانوں کو روٹی کی مانگ سے اس قدر ہم آہنگ کر دیا کہ روٹی کی آڑ لے کر جنسیات کی بھوک بھی بہ آسانی کم کی جائے چنانچہ ہمارے نئے ادب میں جنسیات کا عنصر بھی غالب رہنے لگا وہ بھی اپنی انتہائی برہنگی کے ساتھ جسے ہمارے کرم فرما "اظہار حقیقت" کہتے اور اسی بنا پر اُسے حق بجانب ٹھہراتے ہیں اور یہ یقین کر کے کہ زندگی میں روٹی اور جنسیات کے علاوہ اور رکھا ہی کیا ہے اس نظریہ کا پرچار ان کے نزدیک ایک مذہبی فریضہ بن گیا ہے معلوم نہیں نئے ادب کے حامیوں کو اس نظریہ کی بنا پر ہندوستانی دہقان سے قریب تر ہونے میں بھی کچھ مدد ملی یا نہیں اس لئے کہ آج اپنی جگہوں سے ہمارا دیہاتی کاشتکار بھی اسی نظریہ کی اہمیت کو "کیھو تیق" اور دوسرے ہم وزن لفظ کا استعمال کر کے پیش کرتا رہا ہے جس کے زبان پر جاری کرنے کی اجازت ساری قدامت پسندی کے لئے یا تہذیب ہم کو نہیں دیتی۔

ہاں تو سوال یا اعتراض یہ نہیں ہے کہ ادب میں ——————— روٹی اور جنسیات کی مانگ کو جگہ کیوں دی گئی یا اس کے ذریعہ سے مارکسی تعلیم کیوں دی جاتی ہے یا "ادب برائے زندگی" کے دقیع لیکن پرانے نظریہ کو ایک نیا نظریہ قرار دے کر کیوں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ پوچھنا یہ ہے کہ سرمایہ داری کی دشمنی میں ہمارے نوجوانوں نے اُردو زبان خصوصاً اُردو شاعری کو کیوں تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ کیا موجودہ انقلابی دور میں رنگ و نوا زن و مناسبت

اور حسن و دلفریبی وغیرہ کے متعلق انسان کے خیالات بدل گئے ہیں یعنی کیا اب ہم نے ان چیزوں کو دلکش سمجھنا چھوڑ دیا ہے جو کل تک ہمیں اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ کیا گلاب خوشنما نہیں معلوم ہوتا یا حسین چہروں میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ کیا مصرعوں کا توازن کانوں کو برا معلوم ہونے لگا ہے اور کیا نظم و نثر میں فرق کرنے کی اہلیت ہم سے سلب کر لی گئی ہے جو ہمارے نوجوان "محرم مدعا" "نظم نشور" کو "موزوں" فرمانے پر تلے ہوئے ہیں اور اس طرح گویا خود اپنے توازن ذہنی کے کھو دینے کا مظاہرہ فرماتے ہیں؟

آخر موجودہ طرز شاعری میں جو نئے ادب کے نام سے ہم پر عائد کی جا رہی ہے وہ کون سی خصوصیت ہے جس کو اوزان کی پابندی کے بعد قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اگر نئے شعراء واقعتاً قدرت شاعری رکھتے ہیں تو پھر وہ تنقید حیات کے لئے شاعرانہ محاسن سے معرا ہو جانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔

نئے محاوروں، الفاظوں، اور ترکیبوں کے وضع کرنے کے سلسلے میں بھی نئے ادب کے محرکین اپنی ایسی ہی ذہنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں جیسی کہ وہ اردو نظم کے مقابلہ میں کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام مقررہ اصول و قواعد کو روند کر وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر مصر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نئے الفاظ، ترکیبوں اور محاوروں کے اضافہ سے زبان کی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن کیا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ دوسری زبانوں کے محاوروں کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنا خود اپنی زبان کے حق میں دوستی نہیں کھلی دشمنی ہے؟

رہا اردو لکھنے پڑھنے میں زیادہ وقت لگ جانے کی بنا پر اس کے حروف تہجی میں ترمیم کرنے کے سلسلہ میں ہمارے کرم فرماؤں کا زبانی انہماک تو ظاہر ہے کہ اس منزل کی طرف ہر وہ قدم جو سوچا اور سمجھا ہوا پڑنے لگا ہم ہنسوں کی مبارکباد کا مستحق ہوگا۔ البتہ یہ

یاد رہے کہ اُردو رسم الخط سے واقف ہو جانے کے بعد "زودخوانی" اور "نثر نگاری" کی بنا پر جو وقت آخر کار بچتا ہے وہ اس تضیع اوقات سے کہیں زیادہ ہے جو اُردو زبان کی ابتدائی تعلیم میں پیش آتی ہے۔

بہر حال اردو زبان میں ایسے محاوروں کا وضع کرنا جو نامانوس اور غیر ضروری ہونے کے علاوہ دوسری زبانوں کے محاوروں کے حرف بحرف ترجمے ہوں یا ایسی تراکیب کو استعمال کرنا جو دوسری زبانوں سے اخذ کی گئی ہوں اُردو رسم الخط کو بدلنے کا خیال کرنا اور اُردو نظم کو نظم منثور بنانے کی تدبیریں نکالنا اردو زبان کی ہمہ گیری کو بڑھانے کا نہیں بلکہ گھٹانے کا ہم معنی ہوگا جو لسانی اعتبار ہی سے نہیں سیاسی نقطۂ نظر سے بھی آخر کار مضر ہی ثابت ہوگا۔

نیا ادب

جناب سراج الحسن صاحب سراج لکھنوی

نئے ادب کا بچپنا بھی نظر سے گذرا۔ یہ زمانہ دولار کا تھا جب اس کا نام غالباً ادب لطیف تھا۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی جوانی پیش نظر ہے اور امید ہے کہ شکنوں اور جھریوں سے مالامال اس کا بڑھاپا بھی نگاہ سے گذرے گا۔ وجہ تسمیہ کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ سامنے کی بات ہے۔ اس وقت شعر و سخن کی دنیا دو حصّوں میں منقسم ہے پہلے حصّے میں کھدّر کی قسم کے پرانے ادبا و شعرا آباد ہیں۔ دوسرا حصّہ نوآبادیات کے تحت میں آتا ہے۔ یہ حصّہ نئی پود کے روشن خیال نوجوان شعرا سے معمور ہے پرانے شعرا کا کلام "پرانے ادب" کے نام سے مشہور ہونے والا ہے۔ اور نئے شاعروں کی سخن سنجیاں نئے ادب کے نام سے خواہ مخواہ موسوم ہو کر رہ گئیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلاف نام کے بغیر تفریق و امتیاز کے پیدا ہونے کی اور کوئی صورت نہیں نئے شاعروں کا نیا کلام اس نئے نام کا جائز حقدار بھی ہے۔ نیا ادب ہے کیا؟ یہ حقیقت تو تجزیہ کرنے کے بعد ہر وقت رونما ہو سکتی ہے۔ نقد و تبصرہ کا آئینہ قاعدے سے سامنے ہو۔ اس کی رسم گوناگوں دلچسپیوں کے ساتھ ادا ہو رہی ہو اور ارباب نظر تھوڑی بہت رونمائی حسب حیثیت پیش کریں۔ خیر وہ نیک ساعت جب آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ مگر یہ کیا قیامت ہے کہ پرانے ادب والے نئے ادب کو بے ارادہ بھی دشمنی کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ اُن کا عام خیال ہے کہ نیا ادب، ترقی پسند نوجوانوں کے ذہنی ارتقا کی نام نہاد پیداوار ہے جو معنی سے بے نیاز اور مطالب سے یکسر ناآشنا ہے۔ اس کی غرض بھی فوت اور حاصل بھی ناپید ہے۔ نیا ادب مخرب اخلاق، تہذیب سوز اور فحش سے لبریز ہے.....

خدا جانے کیا ہے۔ ان اعتراضوں کو نامناسب اور نازیبا کہنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ اس لئے کہ سب دھان بائیس پسیری نہیں ہوتے۔ نئے ادب کے نام لیوا میری معلومات کے مطابق تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا قبیلہ اُن ارباب حل وعقد کا ہے جو پرانے ادب کے پرانے گنہگار رہ چکے ہیں۔ پڑھے لکھے خاصے اور اعلےٰ درجہ کی تعلیم سے مالک ہیں۔ چونکہ یہ حضرات مغربی تہذیب میں سرابور رہیں اس لئے ان کی جدت طرازیاں ہر چیز کو نئے لباس میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ پرانے ادب کے چار گرہ کپڑے والے گریبان کو اپنے نزدیک چاک کر بیٹھے اور شاعری کے گلے میں کالر کا پٹہ اور نکٹائی بغیر بسم اللہ لکھے ہر وقت باندھنے کو تیار ہیں۔ دوسرا قبیلہ بھی از یں قبیل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پرانے ادب سے رسمی صاحب سلامت رکھتا بھی انھوں نے روا نہ رکھا۔ وہ شاعری کے پرندے کو نئے پر پرزوں سے آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ قبیلہ پرانے ادب کی حسین پرچھائیں کو نئے ادب کے گورے لطیف و عریاں جسم پر پڑتے دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ تیسری قوم جو سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ نمبر ایک و نمبر دو کے مقلدین حضرات ہیں۔ اس تیسری قوم کا وجود رہین منت ہے اُن ضمیر فروش اخبار کے مدیروں اور رسالہ سازوں کا جو ان کے بے معنی اور لغو افکار سفلیہ کو اپنے اخبار اور رسائل کے کالموں میں جگہ دیتے ہیں۔ اس تیسری قوم کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا امکان ہے کہ چند اصولی اختلافات رفع ہو جانے کے بعد پرانا ادب و نیا ادب دونوں ہم آغوش ہو جائیں جیسے اس مختصر مقالے میں تیسری قوم والے دوشیزہ قسم کے شاعر قریب قریب خارج از بحث ہیں۔ میرا روئے سخن ان ادیبوں کی طرف ہے جو نئے ادب کے حق میں موجد فن کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعرانہ عظمت ابھی تک میرے دل میں برقرار ہے۔ میں اس نظریہ کا پابند ہوں کہ ہر وہ چیز جو پرانے ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہو وہ ضرور قابل قبول ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ نئے

ادب کی طرف سے پرانے ادب میں ان خوشگوار اور قابل قدر اضافوں کا سلسلہ جاری ہے
لیکن ایسا نیا پن جو شاعری کے حسین کالبد کو تمام و کمال بدل دے۔ ایسی جدت جو
خدوخال شعر میں تغیر عظیم پیدا کر دے اور اس طرح کہ ہماری شاعری کی صورت بھی پہچانی
جا سکے اُسے بالغ نظریں کسی طرح دیکھنا گوارا نہ کریں گی۔ نئے ادب کے طرفدار اور
موجد یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ "عریاں" نویسی دراصل حقیقت نگاری کا نام ہے۔ آرٹ
کو آرٹ کی حیثیت سے دیکھئے۔ ہر چیز کو اپنے اصلی لباس میں پیش کرنا چاہئے "کیوں
کہا ہے"۔ یہ اعتراض نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ کس طرح کہا ہے۔ اپنی کوشش میں آرٹسٹ
کامیاب ہے یا نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری کی اس ستر پوشی ہی نے ہماری
شاعری کو ایک معجون مرکب بنا کر رکھ دیا۔ ہماری شاعری ہماری زندگی کا حقیقی آئینہ
ہونا چاہئے۔ یہ دلیل اگر قوی ہے تو صرف نئے ادب کی شاعری ہی اس سے متاثر
کیوں ہو۔ حیات کی گوناگوں رنگینیوں اور دیگر شعبوں میں یہ قوی دلیل اتنی بودی
کیوں ہو جاتی ہے۔ یہ ہے پہلا اصولی اختلاف جو پرانے ادب اور نئے ادب کی
شاہراہوں کو جدا کر دیتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے کہ غریب شاعری کا قیمتی لباس
جدت طرازی کی نخاس میں کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا جائے اور اشاعت حق
کی سعی بلیغ میں اس کا پیکر عریاں کبھی تو "لب سڑک" متحرک نظر آتا ہے کبھی ہوٹلوں
میں اور چائے خانوں میں شیشہ بدست و جام بلب، کبھی پبلک مقامات پر برسر اسٹیج
رقصاں نظر آتا ہے اور خدا رکھے ریڈیو کو جس کی وساطت سے فضاؤں اور ہواؤں میں
نشر ہو کر ہمارے کانوں میں چھلم سے یا چھم سے چھا ندر پڑتا ہے۔ حیات کے دیگر شعبوں
میں بھی عریانی اشاعت حق میں کار فرما نظر کیوں نہیں آتی۔ کوٹ پتلون، اچکن
پاجامہ، کرتا، دھوتی پہننا بھی تصنع میں داخل ہے حقیقت انسانی صرف آئینۂ عریانی
میں نظر آتی ہے جس طرح شاعر کے مجسمہ کو لباس کی ضرورت ہے مکان کی ضرورت ہے

مرادف ہے۔ کچھ حصہ جہاں تک ضبط یادری کرے گا ضرور نقل کروں گا جس ترتیب سے یہ نظم لکھی ہوئی ہے اس کے لئے اصلی مطبوعہ نسخہ یا پوسٹر ملاحظہ فرمایا جاوے۔

عنوان ہے "سادہ سوال" نظم حسب ذیل ہے ؎

ایک ــــ ابیکار ــــ فقیر اور بیچارا ــــ تنہا ــــ وجہ پریشانی خود !
ایک اور ایک ــــ ؟ ــــ دو ــــ جمع کا اک سادہ سوال ــــ رونق بزم ہستی
ایک ضرب ایک ــــ ؟ ــــ دو اور اک تین ــــ کبھی چار ــــ کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں
.... ایک اور اک دو کا وہی سادہ سوال

باعث ہنگامۂ دہر..............

اس نظم کا آخری حصہ بھی ملاحظہ فرمایئے جو حاصل نظم ہے۔

تجھکو آجائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال
تیری دنیا بھی حسیں ہو جائے

کس کی مجال ہے کہ اس نظم کے حسن و قبح پر قلم اٹھا سکے۔ ناظرین کرام اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سے لطف اندوز ہوں۔

بہرحال اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ یہی تیسری قوم والے وہ حضرات ہیں جنھوں نے نئے ادب اور ان کے حامیوں کو بدنام کر رکھا ہے۔

تاثیر ایم۔ اے، فیض، ابن حزیں، میراجی۔ ن۔ م۔ راشد۔ اختر شیرانی جذبی، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، احتشام وغیرہ اور ان کے علاوہ بھی بعض نام ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو اس وقت نئے ادب کی جان ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات تو ایسے ہیں جو پرانے ادب سے ناآشنا نہیں اور پرانے ادب کی جھلک بھی انکے نئے ادب والے کلام میں نظر آتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو صرف نئے ادب کے حامی ہیں

بہر حال ان حضرات کا کلام سنا بھی اور پڑھا بھی۔ ان سے متعلق عام طریقے سے یہ حکم لگا دینا کہ ان کی ادبی جد و جہد ایک بے راہ روی ہے اور خرافات قسم کی کوشش ناکام ہے، ان کا کلام بے معنی ہوتا ہے یہ خود نہیں سمجھتے کہ یہ کیا کہتے ہیں، یہ سب اعتراض غلط اور عظیم الشان بہتان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محاسن یقینی ہیں البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہم اصولی اختلافات کہیں گے ادب کی عالمگیر خامیوں کے ذمہ دار یہ لوگ نہیں بلکہ دوسری قوم والے نوجوان شاعر ہیں جن سے میں ناظرین کرام کو روشناس کرا چکا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت مندرجہ بالا حضرات کا کلام موجود نہیں ہے ورنہ میں ایمانداری کے ساتھ حسن و قبح دونوں سے بحث کرتے ہوئے نقد و تبصرہ کے ساتھ اُسے پیش کرتا۔ بعض شعرا کے کلام کا ایک مختصر سا حصہ اس وقت موجود ہے جسے موجودہ صحبت کے لئے غنیمت سمجھتا ہوں۔ حضرت ویس حزیں کی ایک نظم کسی زمانے میں نظر سے گذری تھی جو اس وقت موجود نہیں نظم اچھی خاصی تھی۔ صرف ایک مصرع پر تنقیدی نظر حسب عادت ٹھہر گئی تھی۔ وہ مصرع ذہن میں اب تک محفوظ رہا ہے۔ وہ مصرع یہ ہے۔ ع

اللہ کا فٹ بال فرشتوں نے اچھالا

سورج کو فٹ بال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تشبیہ بری نہیں ہے فٹ بال بلندی پر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ روشنی نہ سہی مگر وجہ شبہ موجود ہے۔ یہ بلند خیالی قابل داد ضرور ہے۔ صرف اس ٹکڑے کی وجہ سے اور ہمارا نہ بہت ایک نئی اُپج ضرور ہے "اللہ کا فٹ بال" معلوم نہیں اللہ میاں فٹ بال کیا کھیلتے ہیں سینٹر فارورڈ کھیلتے ہیں یا گول کیپری فرماتے ہیں۔ خیر مصرع کا یہ حصہ تو حقائق و معارف سے متعلق ہے اور تصوف کے حدود میں سب کچھ کہنا روا ہے۔ اب مصرع کے دوسرے ٹکڑے کا گیند دھڑ کا کیجئے تو اچھالنے کی حقیقت سے روشناس ہونے کا

موقع مل جاتا ہے بصد ر ادھ بجا لیتا لی گردان ہیں وہ چیز آتی ہے جو ہاتھ سے اچھالی جاتی ہے، فٹ بال تو پاؤں سے ٹھپلا اور ٹھکرایا جاتا ہے۔

ایک اخبار میں میراجی کی ایک نظم اس وقت پیش نظر ہے جس کا عنوان ہے "رخصت" نظم اس کتاب میں کسی جگہ درج ہے

نظم پڑھتے وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوست کی رخصتی ہے یا خود قائل رخصت ہو رہا ہے نظم کے بعض ٹکڑے بتاتے ہیں کہ خود قائل کی رخصتی ہے جیسا کہ اس ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے "آپ ہی آپ میں بڑھتے ہوئے دھارے کی طرح اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا" میں نے پوری نظم کو نہایت شوق سے پڑھا اور اس بات کا جائزہ لیا کہ میرا کونسا جذبہ متاثر ہوا مگر حد درجہ مایوسی ہوئی۔ نہ تو کوئی اثر دماغ پر پڑا اور نہ دل پر "وہی چوکھٹ جسے لاکھوں پاؤں روندتے روندتے اس حال پہ لے آئے تھے" یہ لفظیں اتنا پتہ دیتی ہیں کہ کسی بوسیدہ عمارت کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک خفیف سی عبرت کی جھلک ایک برباد حجرے سے جھانک رہی ہے نظم کو کامیاب بنانے کی کوشش کسیطرح مشکور نظر نہیں آتی رستے میں پھسل کر بغیر چلے راستہ طے کیا مگر پھر بھی میدان شعر کی مسافت طے نہ ہوئی۔ اور ان میں کسی ڈال پر گرگٹ نے رنگ بھی بدلا مگر نظم میں رنگینی پیدا نہ ہوئی۔ ایوان لپٹا ہوا ہے سمٹا ہوا ہے اور بکھرا شارہ ہے یہ شاعرانہ انجینیری کی صنعت کا معجزہ کبھی سامع کو ایمان لانے پہ مجبور نہ کریگا بھولی یادیں پھیلتے ہوئے ملبوس کی طرح پاؤں کو لے آئیں مگر پھر بھی کوئی بات نہ پیدا ہوئی طائر نے بہتے بہتے ٹہنی پر بسیرا لیا مگر شعر کا آشیاں نہ سنور سکا۔ جھومتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی ہتھیلی بے جان زمین کے اوپر شاعر نے اپنی ہستی کو لے کے گرا دیا مگر پھر بھی کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اخبار کا کالم یہ بتاتا ہے کہ یہ نظم میراجی کی ہے۔ اور میراجی یہ باور کرنے کو

تیار نہیں کہ ایسی نظم بھی میراجی کہہ سکتے ہیں۔ لٹریچر نام ہے انتخابات کا مصوّر ہو یا
شاعر وہ مجبور ہے کہ اپنے انتخابات منظر عام پر لائے جس کے پرکھنے کا حق ناظرین کو
ہر وقت حاصل ہے۔ اگر یہ نظم میراجی کی ہے تو نئے ادب کا ایک ناکام نمونہ ہے جو معنی اور
مطالب اور موزونی کی دولت سے تہی دست ہو کر ایسی حقیر اور کم مایہ ہے کہ نگاہِ خریدار
اس کی کوئی قیمت لگانے کو تیار نہیں۔

حضرت فیض کی بھی ایک مختصر سی نظم اخبار غازی بہرائچ میں نظر سے گزری
نظم حسب ذیل ہے۔

لیڈر

سالہا سال سے بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
دور سے صبح کے دھڑکن کی صدا آتی ہے
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے
تیرا سرمایہ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
جسطرح تنکا سمندر میں ہو سرگرم ستیز
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں
جسطرح تیتری کہسار میں یلغار کرے
تجھکو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
تجھکو منظور ہے یہ ہات قلم ہو جائیں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اس نظم میں لیڈر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ نظم کم از کم موزونی کی لطافت سے
مالا مال ہے۔ الفاظ بھی بجائے خود بے معنی نہیں مجموعی حیثیت سے مضمون واضح طور پر
سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلا شعر یہ بتاتا ہے کہ کوئی لیڈر قید و بند میں گرفتار ہے اور ایک
عرصے سے زندانی ہے۔ ہاتھ سالہا سال سے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں مگر رات
کے سخت و سیہ سینے میں وہ پیوست کیسے رہے یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی اگرچہ شعر
تھوڑے بہت اثر کا حامل ضرور ہے۔ اگر سخت و سیہ سینے سے تاریکیٔ زندان مراد ہے
تو روشن خیال حضرات یہ جانتے ہیں کہ آج کل کے زندان حفظان صحت کے خیال سے

تعمیر ہوتے ہیں۔ تاریکی زندان پرانی تخیل ہے۔ نئے ادب نے اس زنجیر کو پہلے ہی توڑ دیا ہے۔ نظم کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ لیڈر ہر قربانی کے لئے تیار ہے۔ نظم کا درمیانی حصہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ زیب داستاں کے لئے غالباً بڑھا دیا گیا ہے۔

بہرحال میراجی اور حضرت فیض کے یہ چند اشعار دیکھ کر میں کوئی مستقل رائے قائم کرنے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ ان کے اچھے کلام سے میرے کان اور نظر دونوں آشنا ہو چکے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک نظم حضرت مجید امجد بی۔ اے مدیر عروج کی نظر سے گذری حضرت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور نظم میں نئے ادب کی جھلک بھی ہے۔ اسلئے ذمہ دار حضرات کے ساتھ ان کا کلام بھی پیش کیا جاتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "بُندا" "کاش میں تیرے بُنِ گوش کا بُندا ہوتا"۔ نظم خاصی ہے۔ تین چار شعر درج ذیل ہیں:۔

میں ترے چمپئی رخسار کو چوما کرتا
میں ترے گیسوؤں کی چھنگ میں جھوما کرتا
تیری دوشیزگیوں کی میں ضمانت ہوتا
تیری بے لوث جوانی کی امانت ہوتا
صبح کو گرتے ترے جسم سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا ملول
تو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہوئے بستر کی ہر اک سلوٹ میں
کان سے تو مجھے ہرگز نہ اتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
کاش میں تیرے بُنِ گوش کا بُندا ہوتا

جیسا کہ میں نے عرض کیا نظم خاصی ہے۔ آخری تینوں شعر اچھے ہیں مگر نفسِ خیال ماخوذ ہے شیکسپیئر کے رومیو جولیٹ والے ڈراما سے جس میں عاشق نے معشوق کو جھروکے میں بیٹھے ہوئے اس عالم میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ گال پر رکھے بیٹھی ہوئی اور ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھی اور عاشق کی زبان سے بے اختیار نکلا تھا کہ کاش میں ترے ہاتھوں کے دستانے ہوتا کہ تیرے رخساروں کی قربت تو حاصل ہوتی۔

خیر اس تقلید میں کوئی نقصان نہیں۔ نظم میں جدت ہے۔ مگر پہلے شعر میں ہنگامہ کو تانیث نظم فرمایا ہے۔ دوسرا شعر خدا جانے کیا ہے ؎

تیری دوشیزگیوں کی میں ضمانت ہوتا تیری بے لوث جوانی کی امانت ہوتا

دوشیزگی واحد صفت کا نام ہے۔ جمع کا صیغہ عجز نظم کا ثبوت دے رہا ہے۔ شعر بے معنی ہونے کے باوجود رکیک خیال کا حامی اور گندہ ہے۔ ضمانت تحفظ کی ضامن ہے۔ شاعر صاحب گوشت و پوست کی صورت میں نہیں بلکہ بندے کی شکل میں دوشیزگیوں کی ضمانت فرمانے کے متمنی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ضمانت کیونکر فرمائیں گے۔ گویا معشوق کے دروازے پر قفل لگا کر تشریف فرما ہوں گے۔ بے لوث جوانی کیا ہے۔ غالباً معصوم اور بیگانۂ دار جوانی سے مراد ہے۔ یہ سب کچھ سہی مگر آپ بذاتِ خود بیک بینی و دو گوش جوانی کی امانت کیونکر ہوں گے۔ اور اس امانت کا امین کون ہوگا۔ جدتِ تخئیل کی یہ طبع سازی تنقید کی کسوٹی پر جھوٹی ثابت ہو رہی ہے۔

حضرت محمود زاہدی کی ایک طولانی نظم مطبوعہ ہفتہ وار ہندوستان بمبئی بھی اتفاق سے اس وقت موجود ہے۔ عنوان ہے "ترانے ہیں فسانے ہیں" نظم عجیب و غریب ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ترانے ہیں فسانے ہیں
جہانِ عشق کے رنگین ترانے ہیں فسانے ہیں

گر جاتی ہیں کب تحقیق کی نظریں
تہوں میں زندگی کی چھوڑ کر سطحیں
اگر جائے کوئی تو جا کے یہ دیکھے
گراں ہیں کس قدر یہ پیت کے نغمے
محبت کس قدر انمول موتی ہے
حقیقت یہ ہے دنیا میں
مقرر مول ہوتا ہے ہر اک شئے کا
خواہ زیست ہو الفت ہو یا رسمی محبت ہو

نظم میں کھینچ تان کر معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے ادب کا نمونہ بھی ہے اس لئے پیش کی گئی بعض ٹکڑے موزوں ہیں اور بعض ناموزوں۔ خدا جانے یہ دو رنگی مرغوب طبع کیوں ہے۔

یہ ہیں وہ چند اشعار جو مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق نئے ادب سے بطور نمونہ پیش کئے گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئے ادب اور پرانے ادب میں اختلافات کے اسباب و علل کیا ہیں۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ نئے ادب کے شاعر پرانے ادب کو دریا برد کر دینا اس وجہ سے چاہتے ہیں کہ وہ پرانا فرسودہ اور بوسیدہ ہو چکا۔ اب نئے عنوان نئے خیالات نئے استعارے اور نئی تشبیہوں کی ضرورت ہے اور پرانے ادب کے شعراء اس لئے جلا وطن کر دیئے جائیں کہ پرانے ہو گئے اور انہیں اب نئے نوجوان شعراء کے لئے جگہ خالی کر دینا چاہئے۔ ہم یہ عرض کریں گے کہ انہیں ایک کونے میں الگ پڑا رہنے دیجئے۔ ہمارا مسلک شاعری جدا اور آپ کا مشرب الگ ہے۔ اگر محض قدامت اور پرانا پن کسی چیز کے رد کرنے کی دلیل ہے تو ذات باری تعالیٰ سب سے زیادہ قدیم اور پرانی ہے۔ پرانے خدا کو معزول کر دیجئے اور ایک نیا خدا انتخاب فرما لیجئے۔

ہمیں جو اختلاف نئے ادب سے ہے وہ ہم نے بصد ادب آپ کے سامنے پیش کر دیا یعنی آپ کے مذاق شعر میں جہاں تک عریانی کا سوال ہے ہم اُس سے متفق نہیں جیسا ہم تفصیل سے اوپر بیان کر چکے ہیں۔ دوسرا اختلاف بلینک ورس سے ہے جس کے متعلق چند مزید باتیں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے یعنی اور مطالب سے اگر بیگانگی نہ برتی جائے اور موزونی کو اگر حدود شعر سے خارج نہ کیا جائے تو بلینک ورس کی اشاعت و اجرا میں چنداں مضایقہ نہیں لیکن پرانے ادب کے قافیے اور ردیف سے آخر اتنی دشمنی کیوں ہے۔ دنیا کی ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہے۔ شاعری کا نظام قافیہ، ردیف اور وزن سے وابستہ ہے۔ ان عناصر کو مردود قرار دینا گویا شاعری کی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ اور اس بغاوت کی ضرورت کیا ہے جب نظام قابل عمل اور اس کی صنعتی تکمیل مسلّم ہو چکی۔ نہ تو پرانا ادب برباد ہو سکتا ہے اور نہ نئے ادب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا جا سکتا ہے۔ پھر آخر اس سوال کی ضرورت کیا ہے۔ نئے اور پرانے ادب کے حامیوں کو ایک کانفرنس منعقد کر کے ان اختلافات کو طے کر لینا میرے خیال میں بہتر اور انسب ہوگا۔